''چہارسُو''

..... موسم کبھی بدلے .....

حسن عسکری کاظمی کی نظمیں اپنے موضوعات ومضامین کے اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ کوئی فلسفی ہیں نہ مفکر اور نہ ان کا ایسا کوئی ادّعا ہے مگر وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو فکر وشعور سے پوری طرح بہرہ مند ہیں۔ ان کے فکر وشعور کے پیچھے وہ خاندانی نجابت اور تربیت ہے جس نے انہیں ایک شریف النفس، بھلا مانس اور نیک طینت انسان کا تشخص عطا کیا۔ ایک ایسا انسان جو خود گمراہ ہے نہ دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ وہ تو انسانی معاشرے کو امن وآشتی، محبت ومروّت وپاکیزگی کا گہوارہ بنانے کا آرزومند ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں گردوپیش سے ناآسودگی کا وہ احساس دکھائی دیتا ہے جو حالات کی تبدیلی کی خواہش میں شدت پیدا کرتا ہے۔ ''موسم کبھی بدلے'' صورتِ احوال کی تبدیلی ہی کا خواب ہے۔ .....پروفیسر ڈاکٹر فخر الحق نوری

اشاعت: جنوری ۲۰۱۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، اظہار سنز پرنٹرز، لاہور

..... مشین گردی .....

ان کے افسانوں میں طنز کی زیریں لہریں سمندر کے باطن میں اٹھ رہی سرد وگرم لہروں کی طرح رواں دواں ہے۔

وہ مقصدی ادب کے قائل ہیں اور اپنے معاشرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں خصوصاً سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر۔ انہوں نے نہ صرف سول حکومتوں بلکہ فوجی حکومتوں کی کارکردگی کو بھی اپنے بے لاگ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

انہوں نے اساطیری کرداروں کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کو نئے اور جامع معنی سے نوازا ہے۔

ان کی زبان سادہ، سلیس اور شفاف ہے جس میں مقامی الفاظ کو یوں برتا گیا ہے جیسے وہ ایسی زبان کا حصہ ہوں۔

مجھے کامل یقین ہے کہ آغا گل نہ صرف فکشن کے میدان میں بلکہ طنز ومزاح کے میدان میں بھی اپنی انفرادی مہر ثبت کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

.....دیپک بُدکی

اشاعت: اکتوبر ۲۰۱۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، سیل اینڈ سروسز، کوئٹہ

..... دیوندر اِسّر .....

کیا کہوں اور کیا نہ کہوں؟ عجیب تذبذب میں ہوں۔ طویل عمری کا ایک المیہ یہ بھی کہ آپ اپنے بہت سے عزیز احباب واقربا کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دیتے ہوئے دیکھتے ہیں اور انہیں سپردِ لحد کرنے یا نذرِ آتش کرنے کا صدمہ بھی جھیلتے ہیں اور ان کے آخری سفر پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ مگر میں نے تو اپنے بھائی جیسے عزیز ترین دوست کا انتم سنسکار بھی نہیں دیکھا۔ کوئی بھی عینی شاہد نہیں ملا جو کہے کہ میں اُن کے داہ سنسکار میں شامل ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی شخص کو قتل کر کے بغیر اس کے اعزاء واقارب کو اطلاع دیئے اسے چپکے سے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔ اِسّر صاحب زندگی بھر اپنی تحریروں میں سوال کھڑے کرتے رہے اور اب اُن کی موت نے بھی کئی سوال کھڑے کر دیئے ہیں اور سبھی کو حیرت واستعجاب کے بحرِ عمیق میں غرقاب کر دیا ہے۔

میرا تو بہت ہی قریبی ساتھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گیا ہے جسے بھولنا ممکن نہیں اور ان کی وفات سے بڑی شدت سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ:

ہم زباں چُپ ہو گئے ہم داستاں چُپ ہو گئے
کیسے کیسے محفل آرا ناگہاں چُپ ہو گئے

.....نند کشور وکرم

اشاعت: ۲۰۱۳ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی، بھارت۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۳ شمارہ: مارچ، اپریل ۲۰۱۴ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

○○

قارئین چہارسُو

○○

زرِ سالانہ

○○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔

فون: (+92)-51-5462495,5490181

فیکس: (+92)-5512172

موبائل: (+92)-336-0558618

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز ۵
بساطِ عجز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمت زہرا ۶
تنہائی کے مختلف رنگ۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر لدملا ۸
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۲
آزمائش دل ونظر کی۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز ۱۴
قفس اُداس ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انوار شریف ۱۷
حیات اور شاعری۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد ادیب ۱۸
ایک نادر کرن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پروین شیر ۲۴
پرورشِ لوح وقلم۔۔۔۔۔۔۔۔۔محبوب خان ۲۶
روس میں اردو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر لدملا ۲۸
ہمالہ پر ایک نظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر لدملا ۳۱

Lahore Declaration
عالمی امن کانفرنس کا اعلامیہ۔۔۔۔۔۔پران نیول ۳۴

دعائے بے صدا
عظمیٰ صدیقی، صدیق شاہد۔ ۳۵

افسانے
اشکوں کے دیپ۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ ۳۶
کماش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۳۸
شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔پرویز شہریار ۴۰
آٹھواں دروازہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رومانہ رومی ۴۳

شہادت کی راہ
غالب عرفان، غلام مرتضیٰ راہی، انتظار باقی، مہندر پرتاپ چاند، کوثر صدیقی، سہیل غازی پوری، سرپواستو رند، جاوید زیدی، اشرف جاوید، کاوش پرتاپ گڑھی، عرش صہبائی، کرامت بخاری۔ ۴۷

افسانے
آدمی کو بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۵۳
رہائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عمران مشتاق ۵۶
جب جسم جاگتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد طارق علی ۵۸
شہ چتک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۶۰

چشمِ حیرت
سعید نقوی، مشتاق اعظمی، حبیب الرحمٰن، زہیر کنجاہی، نوید سروش، منظور ثاقب، شگفتہ نازلی، سلیم انصاری، رفیق احمد، نورزمان ناوک، قمر الدین خورشید، جہانگیر اشرف، غلام شبیر اسد، مظہر بخاری، احمد حجازی۔ ۷۱

گم شدہ شناخت
زیرِ طبع ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔انل ٹھکر ۷۶

ہوا کے دوش پر
ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔۔فیروز عالم ۸۱

زندگی کی زکوٰۃ
محمود الحسن، حسن عسکری کاظمی، کمار پانی پتی، ظریف احسن، شگفتہ نازلی، اسد اعوان، شاہد عزیز، زاہدہ عابد حنا۔ ۸۵

آئینۂ فن
فکشن شعریات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد متین ندوی ۹۰
اردو کے دس افسانچے۔۔۔۔۔۔اسلم جمشید پوری ۹۶
نئے آسمان کی تلاش۔۔۔۔۔۔۔۔پروفیسر قیصر نجفی ۹۹
خوشی سے کب کوئی گھر۔۔۔۔۔۔۔یعقوب نظامی ۱۰۱

مصنف کس کو کہتے ہیں
وقت کی مزاج آشنا غزلیں۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۱۰۳

نشانِ راہ
واپسی لازماں کی طرف۔۔۔۔۔۔۔۔پروین شیر ۱۰۵

بساطِ بشاشت
ہوئے مر کے ہم جو زندہ۔۔۔ایس۔ایم معین قریشی ۱۰۷

ایک صدی کا قصہ
ایس مکھرجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۰

رس رابطے
جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۳

قرطاسِ اعزاز

پروفیسر لدملا وسیلیوا

کے نام

''بساطِ عجز''

انگریزی سے ترجمہ

عظمت زہرا (بدین)

نام: ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا

دفتری پتہ:

شعبۂ ادب، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز، روسی اکیڈمی برائے سائنسز، 12، روزڈیس وینکا سٹریٹ، ماسکو 107031، روس

ممتاز ریسرچ ایسوی ایٹ، ڈیپارٹمنٹ آف ایشین پیپل، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز۔

تعلیمی قابلیت:

ایم ۔اے (فلاسفی، اردو اور ہندی زبان و ادب) ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء

پی ۔ایچ ۔ڈی (اردو ادب) اکیڈمی آف سائنسز یو ایس ایس آر، آنسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز، ۱۹۸۷ء

رہنمائی اور تدریسی تجربہ:

ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۶ء.....۱۹۹۰ء تا ۲۰۰۷ء

طالبعلموں کے ڈپلوما کے لیے لیکچرر اور رہنما، موضوعات ''اردو ادب کی تاریخ''، ''جدید اردو ادب''، ''اردو شاعری''

بین الاقوامی کانفرنسوں (مقالوں) میں شرکت

دوسری عالمی اردو کانفرنس، ماریشس، ۲۰۰۳

بین الاقوامی اردو کانفرنس، اسلام آباد، پاکستان، مارچ ۲۰۰۵ء

فیض احمد فیض پر بین الاقوامی سیمینار، ٹورنٹو، کینیڈا، اگست ۲۰۰۵ء

پریم چند پر بین الاقوامی سیمینار، دہلی، بھارت، اکتوبر ۲۰۰۵ء

سجاد ظہیر پر بین الاقوامی سیمینار، الہ آباد، بھارت، نومبر ۲۰۰۵ء

نئے مقامات/امکانات کے حوالے سے اردو ادب پر بین الاقوامی سیمینار، لندن، یو کے، جون ۲۰۰۹ء

فیض احمد فیض کی یاد میں بین الاقوامی سیمینار، ٹورنٹو، کینیڈا، دسمبر ۲۰۱۰ء

http://www.sherosokhan.com/id849.html.

اشفاق حسین کے شاعری مجموعے کی تقریب رونمائی، نیویارک، دسمبر ۲۰۰۹ء

فیض احمد فیض کے صد سالہ جشن پر بین الاقوامی کانفرنس، ماسکو، ۲۰۱۱ء

اہم تصانیف (روسی زبان میں)

کتابیں

دیانتدار/صالح باغی: الطاف حسین حالی،

شاعر اور ہندوستانی مسلمانوں میں شعور اجاگر کرنے والا۔

(انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک) ایم ۱۹۹۷ء

فیض احمد فیض، زندگی اور کام، ایم، ۲۰۰۲ء

فیض احمد فیض، شاعری (مرتب اور مترجم) ایم؛ ۲۰۱۱ء

اردو غزل کی تاریخ (ابتدائی دور): زیر طبع

آرٹیکلز۔مضامین

اردو ادب کے تشخص کی دنیا ''DIASPORA'' ایم؛ ۲۰۰۴ء

آصف علی، جدوجہد آزادی کا ایک لے جنڈ۔ایم؛ ۲۰۰۴ء

اردو شاعری کی ترقی کے بنیادی رجحانات: ایم؛ ۲۰۰۲ء

اردو ادب میں اصطلاحات ''نیا'' ''جدید'' اور ''جدیدیت'' //شاعری کی دنیا میں تسلسل اور اختراع، ایم؛ ۱۹۹۸ء

پاکستانی اردو شاعری کے پچاس سال، ایم؛ ۱۹۹۷ء

حالی کی مسدس کی ترتیب کی چند خصوصیات، ماسکو، ۱۹۸۹ء

اردو غزل کے روسی زبان میں ترجمے کے مسائل، لینن گریڈ، ۱۹۷۹ء

مرزا غالب، ایک عظیم اردو شاعری، ماسکو ۱۹۷۶ء

(ان کے علاوہ اردو ادب کی بے شمار تصنیفات کئی روسی جرنلز اور انسائیکلو پیڈیا میں موجود ہیں)

اردو زبان میں

پرورشِ لوح و قلم: فیض: حیات اور۔۔۔۔؟

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی۔۲۰۰۷ء دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء)

روس میں اردو ادب کی حیثیت اور اہمیت۔ ماہنامہ انشاء سلور جوبلی، ٹیگور نمبر، کلکتہ ۲۰۱۱ء

فیض کی شاعری میں تنہائی کا موضوع، ماہنامہ پرواز، لندن، فیض جوبلی نمبر، اپریل ۲۰۱۱ء

''کیا روشن ہو جاتی تھی گلی''، فیض احمد فیض (فیض، سعدی منتخب نظمیں)

مرتبین: پروفیسر یوسف حسن، ڈاکٹر روش ندیم، پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰

''کھوئے ہوئے آشیانوں کی تلاش'' (پیش لفظ) اشفاق حسین، ''میں گیا وقت نہیں ہوں'' نئی دہلی ۲۰۱۰ء

اردو مشاعرہ، روایات اور جدیدیت: ایس۔آر۔فاروقی کے اعزاز میں، ۲۰۱۰ء

اقبال کی نظم ہمالہ پر اک نظر۔ ماہنامہ پرواز، لندن، شمارہ ۱۲، جلد ۳، اپریل ۲۰۰۴ء

اردو کے حالات اور امکانات۔ایک غیر اہلِ زبان کی نظر میں، ای ڈبلیو یو ایس مجلّہ، میلینیم اردو کانفرنس، لندن ۲۰۰۰ء

''امیدِ سحر کی بات سنو'' فیض کے مغربی حوالے، اشفاق حسین، لاہور، ۱۹۹۲ء

مہمل یا منزل؟ دریافت، کراچی، اگست ۱۹۹۲ء،
الطاف حسین حالی کی ''روشن خیالی'' کی غزل، اردو انٹرنیشنل، کراچی،
فروری۔ مارچ ۱۹۹۲ء، دریافت، کراچی
سوویت یونین اور اردو دنیا، اردو انٹرنیشنل، کراچی، اگست ۱۹۹۲ء
الطاف حسین حالی۔ محمد اقبال کے پیش رو، محمد اقبال کے کام، لاہور، ۱۹۹۰ء
(انگریزی میں)
(ان کے علاوہ بے شمار آرٹیکلز، کتابوں کے جائزے اور انٹرویوز پاکستان، بھارت اور آسٹریلیا کے مختلف جرنلز اور آرٹیکلز کے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں)۔
اردو سے روسی زبان میں ترجمے جو کہ ماسکو میں شائع ہوئے۔

مرزا غالب۔ منتخب شاعری ۱۹۶۹ء
علی بیگ سرور، فسانہ عجائب (اے سوور وا کے تعاون سے) ۱۹۸۳ء
ایس عاشور کاظمی، سخن گسترانہ بات، ماسکو، ۱۹۹۱ء
ابوالکلام آزاد، غبارِ خاطر (منتخب خطوط) انڈین لائبریری، ۱۹۸۷ء
جوگندر پال، نادید، ۱۹۸۸ء
جوگندر پال کی مختصر کہانیاں، قاضی عبدالستار، سریندر اپرکاش، احمد یوسف، رام لال، رتن سنگھ، ابن کنول، جیلانی بانو اور دیگر۔
اقبال، فیض، فراق، جوش، مجروح، مجاز، علی سردار جعفری، زبیر رضوی کی نظمیں اور غزلیں۔

رَبّا سچّیا ربِّ قدیر

یونس جاوید کے افسانے انسان، سماج اور زندگی کے رنگا رنگ حوالوں سے معمور ہیں۔ انہوں نے حقیقت نگاری میں موجود اسلوبی افسوں کا اس مہارت سے استعمال کیا ہے کہ ان کے بیانیے معروضی حدوں سے نکل کر صورتِ حال کا سامنا کرنے والے کرداروں کے داخلی کوائف کو بھرپور انداز سے چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''تیز ہوا کا شور''، ''آوازیں''، ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' اور اب ''ربا سچّیا ربِ قدیر'' تک یونس جاوید کے ڈکشن میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان کے تازہ ترین افسانوں میں میجک ریالزم یا افسونی حقیقت نگاری کے پرتاثیر تیور منعکس ہوئے ہیں۔ بیانیوں میں داخلی کیفیات کی عکاسی معمولی کام نہیں ہے۔ اس کے لیے تجربے کی کٹھالی میں پگھل کر پانی ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے مکالماتی، خود کلاماتی، تفکراتی اور بیانیاتی امکانات کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

یونس جاوید کے نئے افسانوں کے بیانیے کئی سطحوں پر خصوصاً جسمانی، جذباتی تصویر کشی میں ڈی ایچ لارنس کے فکشن میں موجود مسحود کن بیانیوں سے جا ملتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ نویسی میں کہانی پن کا اس انداز سے خیال رکھا ہے کہ ان کی کہانیاں سپاٹ حقیقت نگاری سے ماورا ہو کر آفاقی صداقتوں کے ادوار میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید

(دستیابی: دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، قیمت: ۲۵۰ روپے)

آخر جینا بھی تو ہے

حقیقت نگاری ایسا طریق کار ہے جس کے ذریعے فن کار ''سچ'' یا ''اختراع'' کئے واقعات کو قاری کے لیے قائل کرنے کی حد تک ''حاضر'' اور ''موجود'' بنا سکے یہی حقیقت نگار کی بنیادی کشمکش ہے۔ یونس جاوید کی کہانیوں میں یہی کشمکش موجود ہے۔ جانے پہچانے واقعات اور جانے پہچانے کرداروں کو اس انداز سے بیان کرنا کہ یہ چیزیں قاری کے لیے واقعی ''موجود'' بن سکیں ایک مرحلہ ہے۔ یونس جاوید نے باریک مشاہدے اور حساس تاثریت کے ذریعے یہ مرحلہ طے کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس کی کہانیوں میں ایسا درد محسوس ہوتا ہے جو واقعات اور کرداروں کو جاننے کے باوجود یوں محسوس نہ ہوا تھا۔

یونس جاوید واقعات اور کرداروں کی سالمیت میں یقین رکھتا ہے اور کرداروں کے جذبات کے زیر و بم کو مہارت سے پیش کرتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس نے واقعات کے بیان سے تمثیلی انداز ابھارنے کی کوشش بھی کی ہے چنانچہ ان کہانیوں کا بیانیہ، حقائق اور حوادث کو ایک ایسے اسلوب میں پرو دیتا ہے، جہاں واقعات ایک بڑے سماجی آشوب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی کمال فن ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان

(دستیابی: دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، قیمت: ۲۵۰ روپے)

☆

فیض کی شاعری میں ''تنہائی'' کے مختلف رنگ

ڈاکٹر لُدمیلا وسیلیوا

فیض کی شاعری میں کچھ ایسے شاہپارے ملتے ہیں جن میں شخصی جذبہ یا کیفیتِ مزاج ایک ایسی قدرِ مشترک ہے جو اجتماعی جذبات کی گہرائی اور معنی خیزی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس لیے ہر قاری اسے انفرادی طور پر اپنے ہی ڈھنگ سے سمجھتا ہے۔

فیض کی نظم ''تنہائی'' ایک ایسا شاہکار ہے جسے ہر طرح کے ذوق رکھنے والے قارئین اور مختلف رجحان کے حامل نقادین نے پُر جوش پزیرائی کی۔ ن۔م۔راشد تک نے جنہوں نے ''نقشِ فریادی'' کے پہلے ایڈیشن کے ''مقدمہ'' میں فیض کے اُس زمانے کے اشعار کو مبہم طور پر کانوں کو بھلی لگنے والی پُر اسرار سرگوشی کہا تھا، اس نظم کی حیرت انگیز اثر اور موہ لینے والی دلکشی سے انکار نہیں کیا۔

اُردو شاعری کے اس مختصر سے شاہ کار کی خوبیاں یوں مجتمع ہوگئی ہیں ، کہ ان کے حلقۂ اثر میں وہ سبھی افراد آجاتے ہیں جن کو یہ اشعار پڑھنے یا سُننے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان نو مصرعوں کی اثر انگیزی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے دورِ طالب علمی کو یاد کرتے ہیں جب اتفاقاً کسی اخبار کا ایک پُرزہ ان کے ہاتھ لگا جس میں ایک نظم تو صحیح سلامت موجود تھی لیکن اس کا عنوان اور شاعر کا نام محفوظ نہ رہا تھا:

''میں نے نظم کا مطالعہ شروع کیا تو پہلی ہی لائن نے مجھے جیسے پکڑ لیا۔ پھر جیسے میں آگے بڑھا، ایک عجیب پُر اسرار کیفیت نظم سے برآمد ہو کر مجھے اپنے طلسمی حالے میں جکڑتی چلی گئی۔ نظم ختم ہوئی تو میں بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں وہ نہیں ہوں جو اس نظم کے مطالعے سے پہلے تھا۔ میرے اندر، کہیں بہت اندر کوئی شے جیسے ٹوٹ گئی تھی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی چیز اُگ آئی تھی۔ اس سے پہلے مجھ پر کسی نظم نے اتنا گہرا اثر نہیں کیا تھا۔ اُن دنوں اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت یہ نظم مجھ پر چھائی رہتی۔ ہفتوں بلکہ مہینوں میں اس کے سحر میں مبتلا رہا، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں خود اُن دنوں سخت نا مساعد حالت سے گزر رہا تھا اور تنہائی کے اَن کہے کرب کو پہچانتا تھا۔ بہر حال اس واقعے کے کئی ماہ بعد مجھے کسی رسالے میں دوبارہ یہی نظم نظر آئی۔ اس بار اس پر عنوان بھی تھا اور شاعر کا نام بھی۔ نظم تھی ''تنہائی'' اور شاعر کا نام تھا فیض احمد فیض ۔(وزیر آغا، فیض اور ان کی شاعری، معیار، فیض نمبر، دہلی، ۱۹۸۷ء، صفحہ ۵۰، ۵۱)

نظم کا موضوع عنوان سے ہی ظاہر ہے۔ موضوع اور عنوان دونوں ہی عالمی شاعری میں خاصے عام ہیں۔ لیکن ''تنہائی'' کا مفہوم مختلف شعراء کے ہاں جداگانہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جذبہ ایک ایسے فرد کی نفسیاتی کیفیت سے جڑے ہوئے رومانی مزاج جیسا ہو سکتا ہے جو، اُس کی نظر میں خامیوں سے بھری اس دنیا سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا ہے۔ ایسی رومانی شخصیت کے لیے تنہائی ایک نعمت ہوتی ہے اور فرد کی آزادی کی ہم معنی بھی۔ اس کے مطابق تنہائی، وجود کے پُر اسرار حقائق کے ادراک، خود آگاہی، اور اصلاحِ نفس وغیرہ میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ عالمی شاعری میں اور اُردو شاعری میں بھی اس کی مثالیں با افراط ملتی ہیں۔ رومانی انداز میں تنہائی کے موضوع پر گفتگو علامہ اقبال کے ہاں اکثر ملتی ہے، مثلاً

تنہائی شب میں ہے حذیں کیا
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

یا پھر:

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

فیض کی نظم میں تنہائی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسری ہی کیفیت، مزاج کی آئینہ دار ہے:

پھر کوئی آیا دلِ زار ! نہیں ، کوئی نہیں
راہ رو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی رات تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

نظم ''تنہائی'' ۱۹۳۶ء کے بعد تخلیق کی ہوئی فیض کی بیش تر نظموں کے مقابلے میں رجائیت کے فقدان کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کے نو مصرعے دل گیری اور بے چینی کے جذبے، پست ہمتی کے احساس کا احاطہ کرتے ہیں ۔ ایک محدود شعری فضا میں ٹوٹتی ہوئی امید اور تنہائی کے المیے کی پوری کہانی سما گئی ہے۔ آیئے، اس نظم پر کچھ تفصیل سے غور کریں۔

یار (محبوب یا دوست) کا منتظر نظم کا ہیرو ہر آہٹ کو غور سے سنتا ہے کہ شاید وہ آ ہی جائے اور زندگی کے ان اداس لمحات کو برداشت کرنے میں اس کی مدد کرے۔ اس کے گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ۔ انتظار میں کھلی

آنکھوں کی طرح وہ بھی ''بے خواب'' ہے۔ یہاں ایک ضمنی مماثلت بھی ممکن ہے: ہوا کے جھونکوں سے کواڑ کھلتے اور بند ہوتے ہیں اور یہ آنکھ جھپکنے کے عمل سے متلازم ہے۔ گھر میں شمعیں روشن ہیں۔ ملاحظہ ہو کہ رات میں چراغ، قندیل وغیرہ مسافر کو راستہ دکھانے کے کام آتے ہیں۔ مہمان کی خاطر داری کے لیے پاس ہی مے و مینہ و ایاغ بھی تیار رکھے ہوئے ہیں۔ تنہائی کی دل گیری میں نظم کا ہیرو اپنے دل ہی سے مخاطب ہوتا ہے۔

خطیبانہ سوال عالمی شاعری کی طرح اردو شاعری کی بھی، ایک مروجہ صنعت ہے۔ دل سے تخاطب کی شکل میں اس صنعت کا استعمال اردو شاعری میں اکثر ہوتا ہے۔ عاشق کا دل غزل کے ایک باضابطہ رُتبے کا دعویدار بھی ہوتا ہے۔ دل اپنی زندگی جیتا ہے، وہ خودرائے اور نخرے والی محبوب کا طرف دار بھی ہوتا ہے۔ عاشق کے مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اس کے عقل سے دشمنانہ رویہ تک اختیار کرسکتا ہے اور محبوب کے سلسلے میں عاشق کی آنکھوں سے رشک بھی کرسکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر موقعوں پر دل عاشق کے ہمزاد اور ہم درد کی حیثیت سے پیش آتا ہے کیونکہ محبت کی آگ تو آخر کار اسی میں بھڑکتی رہتی ہے، غمِ عشق تو اسی میں نہاں ہوتا ہے، آتشِ فراق اسی کو جلاتی ہے خون اسی کے زخموں سے رستا ہے اور محبت کے لاعلاج روگ میں مبتلا وہی ہوتا ہے۔ اپنے دل کو ہم کلام بنانا اردو شاعری کی ایک پرانی روایت ہے

(''دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔۔۔'')

اپنے دل سے خاطبانہ سوال فیض کی اُن صنعتوں میں سے ایک ہے جو عہدِ حاضرہ کے اور کلاسیکی شعر کو ملاتے ہیں۔ فیض کی استعمال کی ہوئی ترکیب الفاظ ''دلِ زار'' غالب کی مشہور غزل کے مذکورہ بالا شعر سے واضح تلازُم رکھتی ہے جس میں اسی صنعت (دل سے سوال) کو کام میں لایا گیا ہے اور ''دل ناداں'' سے ملتی جلتی ترکیب الفاظ ''دل زار'' استعمال کی گئی ہی۔ ملاحظہ ہو کہ فیض کا ''دل'' غالب کے ''دل'' سے زیادہ ''بالغ'' ہے، نادانی کی جگہ حالات سے آگاہی نے لی اور غالباً انہیں حالات پر شاعر کے دل کو رونا آیا۔ بہت ممکن کہ اسی غمِ دنیا کی وجہ سے نظم کے ہیرو کا دل اس قدر اداس ہے اور اسی لیے دوست غم گسار کے انتظار کی اس قدر شدّت ہے۔

''تنہائی'' کے پہلے شعر میں نظم کے ہیرو کا خیالی ہی سہی مگر کم از کم ایک مخاطب تو ہے، لیکن آخر کار یہ وہم بھی دور ہو جاتا ہے اور ہیرو کا دل خود اس کا بدل ثابت ہوتا ہے۔ یعنی آخری مصرعوں میں مے و مینا و ایاغ کو بڑھانا، اپنے کواڑوں کو مقفل کر لینے کی جسمانی کارروائی کی تجویز دراصل خود اپنے آپ سے کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ کام دل سے نہیں لیا جاسکتا ہے۔ اس بات سے جذبۂ تنہائی کی اُداسی کا رنگ اور زیادہ گہرا معلوم ہوتا ہے۔

پوری نظم ایک رومانی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کی فضا پُر اسرار ہے، شاعر نے رمز و کنایہ سے کام لیا ہے۔ یہاں کوئی چیستان سا پنہاں ہے اور اس کا آغاز خود نظم کے ہیرو سے ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں وہ کون ہے، کس کا انتظار ہے۔ ہاں، یہ تو صاف ہے کہ وہ کسی اجنبی کی راہ نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ کسی یار کا۔ اس کی وضاحت کچھ بعد میں کی جائے گی۔

ہیرو کی تنہائی کے احساس کی شدّت اس کے انتظار کی شدّت کے برابر ہے۔ یہ واقعی ایک ''عظیم'' انتظار ہے، کیونکہ تاروں سے لے کر زمین تک ساری کائنات اس انتظار کی گرفت میں آئی ہے، اگرچہ اس کائناتِ بے کراں کو شاعر نے چار اشعار میں سمو دیا ہے۔

شاعر کی کائنات تین فضاؤں میں تقسیم کردہ معلوم ہوتی ہے، یہاں اس کی گویا تین سطحیں نظر آتی ہیں:

(۱) آسمان، (۲) گلیوں میں واقع گھر (۳) زمین (راہ گزر)۔ اور یہ سب درد مندی کے ساتھ انسان کا ساتھ دے رہے ہیں، سب اس انتظارِ عظیم میں شریک ہیں: (۱) آسمان کے تارے۔ (ستاروں اور آنکھوں میں شاعراتی مماثلت پر توجہ دیں) (۲) گلیاں جن میں اپنا گھر اور دوسروں کے گھر واقع ہیں۔ (دوسروں کے ایوانوں کی کھڑکیاں روشن ہیں اور اپنے گھر کے بھی دروازے کے کواڑ کھلے ہیں۔ یہاں تلازمہء خیال قابلِ غور ہے: روشن کھڑکیاں گویا گھر کی دیکھنے والی آنکھیں، کھلے دروازے اور منتظر ہیرو کی بیدار، کھلی آنکھیں)۔ (۳) وہ راہ گزر جس پر کسی انجانے راہرو کے نقشِ پا ثبت ہیں۔ (یاد رہے کہ اردو کی روایتی شاعری میں ''نقشِ پا'' اپنی بے حرکتی اور اپنی گول سی شکل کی مناسبت سے حیرت سے کھلی آنکھ کا استعارہ ہے)۔ فیض کی اس نظم کا سیاق و سباق اس روایتی استعارے میں مزید ترمیم کرتا ہے: ''نقشِ پا'' انتظار کی کیفیت سے بھی جڑا جاتا ہے اور اس طرح ''قدموں کے سراغ'' کی معنویت میں نیا رنگ آملتا ہے۔ اس طرح ''قدموں کے سراغ'' کو دہری، حقیقی اور مجازی کیفیتیں حاصل ہوتی ہیں، یعنی یہ درحقیقت ایک نقش بھی ہے اور انتظار کا استعارہ بھی۔

نظم کا پانچ واں شعر ''سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار'' اس لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں حسنِ تعلیل کی صنعت استعمال کی گئی ہے: گلیوں کا مجازی استعارہ اور ''حقیقی منتظر'' یعنی نظم کا ہیرو ایک دوسرے کی مثل اور نظیر ہیں۔

اس نظم کے ایک اور خوبصورت تریں پہلو پر توجہ دئے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں۔ وہ نظم کی مذکورہ بالا سہ سطحی شعری فضا کے تعمیری خاکہ سے وابستہ ہے۔ اس ساخت کی ایک امتیازی خصوصیت ہے جو غالباً یکدم پوری طرح واضح بھی نہیں ہوتی ہے بلکہ غیر شعوری طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ نظم میں کائنات کی تینوں سطحیں یعنی آسمان، رہائشی زمین (مکانات، کھڑکیاں) اور زمین بذاتِ خود (راہگزر، خاک) ایک دوسری سے غیر منقسم طور پر مربوط، تلازمات کے رشتے میں بندھی ہوئی ہیں اور ایک واحد قوّتِ متحرک کے تابع ہیں جسے ہم نگاہِ منتظر کی قوتِ متحرک کہہ سکتے ہیں۔ اس کے معنویاتی سلسلے کے عناصر شعری کائنات کی ہر سطح پر واقع ہیں؛ (۱) آسمان پر تارے (تارے اور آنکھوں کی شاعرانہ مماثلت

واضح ہے)، (۲) زمین پر روشن کھڑکیاں (گھروں کی دیکھنے والی آنکھیں) (۳) زمین پر راہ گزر پر نقشِ پا

(حالتِ انتظار میں کھلی آنکھیں)۔اس کے علاوہ نظم میں ایک اور نگاہ موجود ہے، اور وہ ہمارے ہیرو کی نگاہ ہے جو شروع میں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی ہے (بکھرنے لگا تاروں کا غبار)، پھر نیچے گھروں پر اُترتی ہے اور ایوانوں کی کھڑکیوں میں بجھنے والے چراغوں پر سرکتی ہے، اور پھر اور نیچے راہ گزر کی طرف آتی ہے جہاں پہنچ کر دھول میں ''قدموں کے سراغ'' پر رُک جاتی ہے۔اس سے آگے نگاہ کہیں جا نہیں سکتی ہے۔۔۔اُمید کی علامت آسمان سے شروع ہو کر، رہائشی سطح سے گزرتا ہوا، خاتمے اور نا امیدی کی علامت خاک اور دھول تک پہنچنے والا یہ مائل بہ نشیب خطِ حرکت بے بسی اور اداسی کو اور زیادہ شدید بناتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ساری نظم کی ساخت ''نفسیاتی مماثلت'' کے اصول پر مبنی ہے۔مراد ہے کہ انسان اور اس سے دردمند کائنات کے یکساں حالات ہیں۔کائنات کی صورتِ حال امید کے خاتمے کے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تنہائی کے اُس شدید احساس کی آئینہ داری کرتی ہے جو رفتہ رفتہ نظم کے ہیرو کو ہو جاتا ہے۔اس کا اظہار لفظی اور معنویاتی سطح پر ہوتا ہے۔ستارے ماند ہو جاتے ہیں، گھروں میں چراغ بھڑک بھڑک کر گل ہو جاتے ہیں، راہ گزر پر پائے جانے والے نقشِ پا مٹ جاتے ہیں، کسی کے پاؤں کے یہ نشان ''اجنبی خاک'' دھندلا دیتا ہے۔اب کوئی ایسا نشان دیکھنے کو باقی نہیں جو یاد دلا سکتا ہے کہ حال ہی میں یہاں کوئی دلنواز، کوئی اپنا انسان گزرا تھا۔شاید اسی کا اب انتظار ہے۔جس شخص کے نقشِ پا تھے اس کا دلدار اور اہلِ درد ہونا کلاسیکی شعریت کے منطق کے مطابق ہے، یعنی اگر خاک ''اجنبی'' ہے، تو اس کے منطقی معنی یہ نکلتے ہیں کہ نقشِ قدم کسی ''واقف کار'' کے، کسی ''اپنے'' کے رہے ہوں گے۔

اب تصویر کچھ اس طرح کی ہے کہ ہر وہ شے جو انتظار کے عمل میں شریک تھی (اور یہ تو ساری کائنات ہے!) انسان کو تنہا چھوڑ دیتی ہے۔یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ساری کائنات میں صرف انسان ہی انتظار کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔اور جب صاف ہو جاتا ہے کہ انتظار کا کوئی ثمرہ نہیں ملے گا، تو انسان کے لیے دوسری آزمائش، تنہائی کی آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔۔۔

بظاہر تو نظم کے ہیرو کی مایوسی کی کوئی حد نہیں: اسے انتظار کا کوئی ثمرہ نہیں ملا۔گھر کے بند دروازوں میں اب ''شبِ غم کا جوش ہے''۔۔۔لیکن پھر بھی اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو اس تنہائی کا عالم اتنا گراں بار نظر نہیں آئے گا جتنا پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔اس ساری نظم کے پس منظر میں گویا مبہم سی (بلکہ ان دیکھی سی) امید کی کرن جھلکتی رہتی ہے جس سے یہ تنہائی عظیم کی گراں باری بھی تھوڑی بہت ہلکی بھی معلوم ہوتی ہے۔وہ کس طرح؟

غور سے دیکھا جائے تو نظم کا سارا ماحول زندگی سے بھرپور ہے! مفہوم اور لہجے کو برطرف رکھ کر پہلے لفظیات کو ہی لیں۔مصرعوں میں کتنے فعل ہیں جو بذاتِ خود حرکت کی، زندگی کی علامت ہیں: کسی کا آنا-نا آنا، راہرو کا چلے جانا، رات کا ڈھلنا، تاروں کے غبار کا بکھرنا، چراغوں کا لڑکھڑانا، راہگزر کا سو جانا وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور بات توجہ طلب ہے۔نظم میں بے جان شے بھی جان دار معلوم ہوتی ہیں: راہ گزر کو تکنے کی اور سو جانے کی انسان کی صفتیں حاصل ہیں، اسی طرح چراغ خوابیدہ ہیں اور لکڑی کے کواڑ تک ''بے خواب'' ہیں، اس میں بھی جاندار شے کی صفت ہے۔

ہاں، کائنات کے سارے عناصر تھک کر انسان کو تنہائی میں چھوڑ دیتے ہیں سہی، لیکن ہمیشہ کے لئے تو نہیں! رات ڈھل جاتی ہے سہی لیکن رات کے بعد دیر یا سویر صبح ضرور آتی ہے۔اور صبح آنے پر نیا انتظار شروع ہوگا، ''نئے سرے سے حساب سارے'' شروع ہو جائیں گے، یہ امید جاگ اُٹھے گی کہ ''آئے گا آنے والا''۔

شاید اسی غیر واضح اُمید کی بدولت نظم کی قنوطیت کی نہیں بلکہ رجائیت کی نوعیت کی بات کی جا سکتی ہے۔میرے خیال میں، اس ''پوشیدہ رجائیت'' میں فیض کی اس نظم کا ایک راز ہے۔

حالات کے بدلنے کے ساتھ ''تنہائی'' کا موضوع شاعری کے دل و دماغ کو چھوڑتا نہیں۔لیکن فیض کے مزید کلام میں احساسِ تنہائی کی کیفیت بدل جاتی ہے۔مضمون کی حدود کے پیشِ نظر اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں، اس لیے اب صرف سرسری طور پر ہی اُن دو اور نظموں کا تذکرہ کیا جائے جن میں رفتہ رفتہ فیض کے احساسِ تنہائی میں تبدیلی نظر آتی ہے۔۱۹۷۸ء میں لندن میں لکھی ہوئی نظم:

مرے دل مرے مسافر/ ہوا پھر سے حکم صادر/ کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں/ کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں/ کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں/ جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں/ ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا/ کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے/ شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت/ جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا/ اگر ایک بار ہوتا

اس نظم میں حب الوطنی کے علاوہ ایک اہم موضوع، تنہائی کا موضوع بھی نمایاں ہے۔اس نظم میں بھی نظم کا ہیرو اپنے دل سے گفتگو کی شکل میں خود کلامی کرتا ہے جو عام طور پر انسان تنہائی میں ہی کرتا ہے۔لیکن اب تنہائی کی قطعی دوسری کیفیت ہے: یہ گھر کی چار دیواری میں بند انتظار کرنے والے کردار کی تنہائی نہیں بلکہ ہجوم میں تنہائی، آباد شہروں اور گلیوں میں بھٹکنے والے انسان کی جان لیوا تنہائی

ہے۔اس طرح کی تنہائی ایک عجیب سی بے گانگی، زندگی کی خوشیوں سے بے زاری ، مایوس کن پریشانی اور تذبذب کی بھی ایک شکل ہے۔شاعر کی جلاوطنی اور بیسویں صدی کی سات ویں دہائی کے اواخر میں دنیا میں رونما ہونے والے تشویش ناک حالات کا پس منظر، اور پھر، خود اپنے اور دنیا کے مستقبل کے سلسلے میں شاعر کی غیر یقینی اور پریشانی، تنہائی کی اس نئی کیفیت کی وضاحت کرتی ہیں۔

تنہائی کی اسی کیفیت کا عروج ہم ''غبارِ ایّام'' میں درج نظم ,,آج شب کوئی نہیں ہے،، میں دیکھتے ہیں جو غالباً ۱۹۸۳ء کے اواخر میں لکھی گئی ہے۔ یعنی یہ فیض کی آخری نظموں میں سے ایک ہے۔اس کے چند اشعار پر نظر ڈالیں:

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے/''کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت'' کوئی اُمید، کوئی آس مسافر صورت/کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں کوئی نہیں ہے۔

پوری نظم اِسی طرح کے بھاری ماتمی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔''نقشِ فریادی'' کی ''تنہائی'' اور اس نظم کی تنہائی کی احساس میں کتنا بڑا فرق ہے!۔اگر ''تنہائی'' میں، جیسے کہ اُپر دکھایا گیا ہے، رواں دواں زندگی کی ایک صورت کی تصویر کشی ملتی ہے تو ''آج شب کوئی نہیں'' میں کیا تصویر نظر آتی ہے؟ نظم کے لفظیاتی پہلو ہی لیں۔چودہ مصرعوں پر مشتمل اس پوری نظم میں صرف ایک ہی فعل استعمال ہوا ہے ''ہونا'' جو دراصل صرف ونحو کا ہی ایک ضروری عنصر ہے۔ تاہم یہ ''ہے'' بھی منفی شکل میں موجود ہے، یعنی ,,نہیں،، ہے۔

یہاں دو آخری نظموں کا تفصیلی مطالعہ کرنا مقصود نہیں۔ان کا تذکرہ صرف ایک موازنہ کے طور پر کیا گیا ہے۔

شاعر کے احساسات میں تبدیلی کی وجوہ پر بحث ایک الگ موضوع ہے۔

آخر میں بس اتنا ہی کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی جب دنیا کے اکھاڑے میں نئی نسل نمودار ہوئی ہے فیض احمد فیض کی صد سالہ سال گرہ عالمی پیمانے پر دھوم دھام سے منائی جارہی ہے۔لیکن شاعر کی یاد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا معاملہ رنگا رنگ تقریبات تک محدود نہیں۔فیض کی شہرت اور ان کی شاعری کی نہ ختم ہونے والی مقبولیت کا زیادہ اہم ثبوت ان کے اشعار سے وہ دلچسپی ہے جو کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس بڑھتی جاتی ہے۔فیض کے کلام کا مطالعہ زیادہ وسیع اور گہرا ہوتا جارہا ہے۔اگر پہلے فیض کی شاعری کے نظریاتی اور سماجیاتی پہلو پر اوّلین زور دیا جاتا تھا اور اکثر فیض کا ''مجاہدِ امن'' اور ''غریبوں اور مظلوموں کے شاعر'' کی حیثیت سے ذکر کیا جاتا تھا، تو اب زیادہ سے زیادہ موقعوں پر ان کو ایک نامور اردو شاعر اور ایک منفرد فنکار قرار دیا جاتا ہے اور ان کے کلام کی شعریات اور فنکارانہ خصوصیات پر غور کیا جاتا ہے۔اس مضمون میں بھی اسی پہلو پر غور کیا گیا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھانا اس تحریر کا ایک مقصد تھا کہ ایک غیر زبان روسی طالب علم کس طرح فیض کے اشعار کو سمجھ لیتا اور محسوس کرتا ہے۔اگر میری یہ حقیر کوشش کامیاب ہوئی، تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

ڈیوڑھی

(اردو کہانیوں کا مجموعہ)

گلزار

رزق تو قدرت پتھر کے کیڑے کو بھی مہیا کرتی ہے۔تو رزق کمانے کے کتنے راستے ان کے لیے کھلے ہیں۔ایک وہ ہیں جن کا گذارہ سیاسی لیڈروں کے جلسوں پر ہے۔ سامعین میں شامل ہوکر جلسے کی رونق بڑھاؤ اور لیڈر کے حق میں نعرہ لگاؤ۔ایک نعرہ ایک اٹھنی۔

پوچھتا ہے ''بھاؤ تم سارا حساب اٹھنیوں میں کیوں رکھتا ہے۔''

بھاؤ ادھا ہنس کے بولا ''اپنے جیسے کو من مین کے پاس سب کچھ آدھا ہی سچ ہوتا ہے۔آدھا کھانا، آدھا پینا، آدھا ہنسا، آدھا رونا، آدھا جینا، آدھا ہی مرنا۔۔۔ یہ اٹھنی سالا کبھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔''

خاک میں پڑی اس رنگا رنگ مخلوق کا بیان اتنی جزئیات نگاری کے ساتھ ہے اور اتنے بے ساختہ انداز میں کہ یہ سب لوگ جیتے جاگتے ہماری نظروں میں گھومنے لگتے ہیں۔بیان کی سادگی اس پر مستزاد۔بلکہ ان کہانیوں کا ایک بڑا وصف یہی سادہ بیانی ہے۔تجریدیت پسندوں نے کہانی کو معمہ بنا دیا تھا۔گلزار صاحب نے کہانی کو پانی کر دیا۔ شاعری میں ایسے سہل اشعار کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔گلزار نے کہانی کو سہل ممتنع کر کے دکھایا ہے۔

انتظار حسین

(دستیابی: سنگ میل، لاہور۔قیمت: چار سو پچانوے روپے)

☆

براہِ راست ..... گلزار جاوید

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات

گذشتہ کل میں نے مرسلہ سوالنامہ پڑھا۔ بہت معافی چاہتی ہوں کہ میں آپ کے چالیس سوالوں کے جوابات دینے سے قاصر ہوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ آپ کے ہر سوال کے بارے ایک مضمون اور بعض سوالوں کے جواب میں تو پوری کتاب لکھی جانی چاہیے۔ آپ کے سوال نمبر ۳۹ پر میری توجہ مبذول ہوئی، میرے لیے تعریف نہیں بلکہ تنقید سب سے اور دلچسپ ہوتی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ فلحال مجھ تک فیض احمد فیض کی نسبت میری کتاب کے حوالے سے کوئی تنقید نہیں پہنچی ہے وگرنہ مجھے اپنی تحریر کی کوتاہی معلوم ہو جاتی اور اگلی بار میں اس کوتاہی کا ازالہ کر سکتی۔ آپ کی توجہ اس جانب دلانا چاہتی ہوں کہ آپ کو میرے بارے میں غلط معلومات ملی ہیں۔ میں صدر بریژنیف کے دورۂ بھارت کے موقع پر مترجم کے طور پر نہیں بلکہ سوویت پریس گروپ کی ایک شریک ممبر کے طور پر بھارت گئی تھی جس کا کام دورہ پر روشنی ڈالنا تھا۔ حکومت ہند سے کسی قسم کی فرمائش میری عقل سے قطعی ماورا ہے۔ سوال نمبر ۱۰ میں جو بات مجھ سے منسوب کی گئی ہے وہ میں نے ہرگز نہیں کہی۔ میں نے ادب کی نہیں بلکہ شاعری کے تراجم پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا ''عام طور پر شاعری (اردو شاعری بھی) کا اثر دل پر ہوتا ہے پھر شعر کا مطلب دماغ تک پہنچتا ہے جبکہ غیر زبان قاری کے لیے یہ عمل اُلٹا ہوتا ہے۔ یعنی شعر کو سمجھے بغیر، غیر زبان قاری اُسے دل میں اُتار نہیں سکتا ہے یعنی بات بالکل الگ ہوئی۔ میرے مطابق قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، کشور ناہید، واجدہ تبسم، دیویا ماتھر خواتین ہی ہیں (سوال نمبر ۱۲) میں نے غالب کے دل کا فیض کے دل سے موازنہ کیا؟!!! کسی کے دل کو بالغ یا نابالغ بتایا؟ کہاں بتایا؟ میں نے غمِ دل اور غمِ دنیا کے استعارے پر بحث کی پھر یہ دل کی بات کہاں سے آ گئی؟ اس طرح ایسے سوالات کم نہیں ہیں جن کے جوابات کے بجائے وضاحت ہی کرنی چاہیے۔ آپ کے بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات سیاستدان، تاریخ دان یا سماجی کارکن ہی دے سکتے ہیں۔ آپ شاید میرے جواب سے ناراض ہو جائیں مگر میں بہت معذرت چاہتی ہوں کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق سوالنامے کے جوابات دینے سے قطعی قاصر ہوں۔

آپ کی خیر اندیش

لدملا

۱۔ آپ نے سوویت روس میں اردو اور ہندی زبانوں کی تاریخ، ترقی، ترویج اور تدریس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے مگر اپنی بابت کچھ نہیں بتلایا کہ آپ کا رجحان مشرقی علوم بلخصوص اردو کی جانب کس طور ہوا؟

۲۔ تراجم کی طرف آپ کی طبیعت کب مائل ہوئی اور کئی درجن لوگوں کی تخلیقات کے تراجم کے باوجود فیض آپ کی توجہ کا مرکز کیونکر ٹھہرے؟

۳۔ کچھ تفصیل تدریس اور نشر و اشاعت کے تجربات کی بتلایئے؟

۴۔ تنقید، تراجم، تدوین اور ترویج کے علاوہ کبھی آپ کی طبیعت تخلیق کی جانب مائل نہیں ہوئی؟

۵۔ روسی نژاد ادیبہ اور مترجم کو اردو ادب اور قاری کا مزاج آشنا ہونے کے لیے کس طرح کی کاوشات کرنا پڑیں؟

۶۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ آپ کے مشاغل کیا ہیں۔ کچھ اپنے اور کچھ اپنوں کے بارے آگاہی دیجیے؟

۷۔ کچھ روشنی سوویت معاشرے کی بود باش، رہن سہن اور مزاج کی نسبت بتلایئے؟

۸۔ روسی صدر بریژنیف کے دورۂ بھارت کے موقع پر بطور ترجمان آپ کا تقرر کس بنیاد پر ہوا۔ آپ اُن تجربات کو کن الفاظ میں یاد کرتی ہیں اور دورہ کے اختتام پر حکومت ہند سے آپ نے کیا فرمائش کی تھی؟

۹۔ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ مشرقی ادب بلخصوص اردو ادب کا مزاج روسی ادب سے کافی قریب ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ آپ کے خیال میں اگر ایسی کوئی مناسبت ہے تو اس کا جواز کیا ہے؟

۱۰۔ آپ فرماتی ہیں کہ ہر زبان کا ادب دل سے ہوتا ہوا دماغ پر اثر کرتا ہے۔ اب اگر اردو شاعری میں معاملہ اُلٹ ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں اور اُن سے کس طور نبٹا جا سکتا ہے؟

۱۱۔ آپ نے بے شمار تخلیق کاروں کے تراجم کئے ہیں۔ فیض کے علاوہ آپ کی شخصیت نے کن کا اثر زیادہ قبول کیا؟

۱۲۔ صنفِ نازک کی باوقار نمائندہ ہونے کے باوصف آپ نے خواتین تخلیق کاروں پر اُس قدر توجہ نہ دی جس کی وہ بجا طور پر حقدار تھیں؟

۱۳۔ اردو ادب اور ادیب پر ہمیشہ رومان پرور ہونے کا الزام لگا کرتا ہے۔ اس حوالے سے آپ ہمیں اپنے تجربات میں شریک کرنا پسند کریں گی؟

۱۴۔ فیض کو آپ نے کب کہاں اور کس واسطے سے پڑھا اور اُن کے

کلام کی کس خوبی نے آپ کو اُن کا گرویدہ بنا دیا؟

۱۵۔ اُسامہ فاروقی کا فیض فہمی میں کیا رول ہے اور اُن کے اچانک انتقال سے کس طرح کی مشکلات درپیش رہیں؟

۱۶۔ غالب کے کلام کے تراجم میں آپ کو کن مشکلات کا سامنا تھا اور فیض پر آپ کی نظر انتخاب کیونکر پڑی اور اُنھوں نے کس طور آپ کی مدد و رہنمائی فرمائی؟

۱۷۔ اس کام میں فیض اور اُن کے خاندان سے آپ کے قریبی تعلق کا کیا رول رہا۔ وضاحت سے بتلایئے کہ احباب آپ اور فیض کے تعلق کا خصوصیت سے ذکر کیا کرتے ہیں؟

۱۸۔ غالب کی عظمت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر اردو ادب نے جس طور میر تقی میرؔ کو فراموش کیا ہے اُس کا جواز اور نقصانات کی بابت آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

۱۹۔ فیض کے دل کو غالب کے دل سے زیادہ بالغ بتلا کر آپ نے بحث کا ایک اور در وا کر دیا ہے؟

۲۰۔ دورانِ اسیری فیض اور ایلس فیض کے درمیان مراسلت کو اہمیت دینے والے صرف فیض صاحب کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔ ایلس فیض کو فراموش کرنا آپ کے خیال میں زیادتی نہیں؟

۲۱۔ کچھ لوگ فیض کی سلاست، روانی اور دھیمے پن کو فارسی ادب کی دین گردانتے ہیں۔ اس طرح فیض کا تخلیلی دھندلا نہیں جاتا؟

۲۲۔ فیض کو ناقابل یقین حد تک مجموعہ اضداد گرداننے والے فیض احمد فیض کی تعریف کر رہے ہیں یا اُن کی بھد اُڑا رہے ہیں؟

۲۳۔ اس رائے میں کس قدر وزن ہے کہ ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' کے مطالعہ اور اشتراکی نظریہ کے حامل دوستوں کی محبت نے فیض احمد فیض کی رومان پرور شاعری کو سیاست زدہ کر دیا تھا؟

۲۴۔ اقبال اور فیض ہمارے خیال میں دو الگ مکتب فکر کے نمائندہ ہیں۔ پھر فیض کو کس اعتبار سے اقبال کی فکر اور فن سے متاثر گردانا جا سکتا ہے؟

۲۵۔ برصغیر کے اکثر لوگ بجا طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کچھ حلقے اقبال کو شاعر کے بجائے پیغمبر بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آپ کا نقطہ نظر اس حوالے سے کیا ہے اور اس روش سے پرہیز کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

۲۶۔ سرسید احمد کی بابت آپ کی بے لاگ رائے اور سوویت روس میں ابتدائی ایام کے اندر اُن کی بابت منفی رائے کا سبب کیا تھا۔ اگر پروفیسر سخوف ہمت نہ کرتے تو سرسید کے ساتھ ناانصافی نہ ہو جاتی؟

۲۷۔ سوویت روس کے انہدام کے بعد سُرخوں کے سردار سجاد ظہیر کی اس رائے میں کس قدر وزن باقی رہ جاتا ہے کہ فیض نے جن قدروں کی نمائندگی کی وہ تمام عالم انسانیت کی مشترک قدریں ہیں۔ وہ قدریں آج کہاں ہیں اور عالم انسانیت کو ابتلا میں چھوڑ کر کہاں گم ہو گئی ہیں؟

۲۸۔ آپ کی رائے کے مطابق آخری ایام میں فیض صاحب مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کا ذمہ دار آپ کے خیال میں زوالِ روس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۲۹۔ ایک رائے یہ ہے کہ سوویت روس کے ٹوٹنے کے بعد فیض کے خواب بھی بکھر گئے تھے جس کے باعث اُن کی سیاسی، سماجی اور اخلاقی قدریں وقت کی کسوٹی پر پورا نہ اُتر سکی تھیں؟

۳۰۔ جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ برژنیف کے دور میں مخالف آوازوں کو سختی سے دبانے، افغانستان میں مداخلت اور سوویت روس میں شدید بدعنوانی نے فیض احمد فیض کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا تھا؟

۳۱۔ سوویت حکومت کو یہ احساس کب اور کیوں ہوا کہ تیسری دنیا کے ادیب، شاعر، دانشور اور صحافی اُس کی گرفت سے نکلے جا رہے ہیں اور حکومت کے کارپردازوں نے اس کا سدِ باب کس طرح کیا؟

۳۲۔ راولپنڈی سازش کیس میں کس قدر صداقت ہے اور آپ نے فیض کو اس حوالے سے کس پوزیشن کا حامل پایا؟

۳۳۔ آپ کے خیال میں مستقبل فیض کی بابت کیا فیصلہ صادر کرے گا۔ یعنی فیض احمد اشتراکی، قوم پرست، وطن پرست یا جمالیات پرست تھے؟

۳۴۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ آنے والے دنوں میں پولورائزیشن کیا رُخ اختیار کرے گی اور عالمِ انسانیت کو کس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا؟

۳۵۔ یہ الزام ایک طرح سے لاف زنی اور لغو بھی ہو سکتا ہے کہ سوویت روس کے انہدام میں امریکہ نے اندر سے نقب لگا کر انتہائی اہم کردار انجام دیا؟

۳۶۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد وہاں کے لوگوں کو کس طرح کے حالات کا سامنا رہا اور اُن کے سوچنے، سمجھنے کے انداز میں کیا تبدیلی آئی نیز حکومتی سطح پر مستقبل میں اس طرح کے حادثات سے بچنے کے لیے کس طرح کے اقدامات اٹھائے گئے؟

۳۷۔ دوسری سپر طاقت کے طور پر سوویت یونین کا انہدام دنیا کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ آپ کے خیال میں سوویت یونین کے Come Back کرنے کے امکانات کب تک اور کتنے فیصد ہیں؟

۳۸۔ آپ کی نظر میں کل، آج اور کل اردو ادب کا عالمی ادب میں کیا مقام ہونا چاہیے اور کن تخلیق کاروں اور صنف کو اس میں سبقت حاصل ہو سکتی ہے؟

۳۹۔ جہاں کچھ لوگ آپ کی ہمت، محنت اور لگن کی داد دیتے ہوئے آپ کے کام کو سراہتے ہیں وہیں کچھ لوگ ''پرورشِ لوح و قلم'' میں پروفیسر سلوخوف، طالبی اور مطالبی فرید آبادی کے حوالے سے کئی طرح کے سہو کا ذکر بھی کیا کرتے ہیں؟

۴۰۔ آپ نے جس قدر بھی علمی، ادبی کام کیا ہے اُس کی نسبت آپ کے دل میں کس قدر اطمینان پایا جاتا ہے اور مستقبل کے حوالے سے آپ کے ارادے اور خواہشات کیا ہیں؟

''آزمائش دل ونظر کی''

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز

(لندن)

اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کا نام نہ سنا ہو۔ ادب کے قارئین میں سے تو بہت سوں کو ہندو پاک، برطانیہ اور دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک میں اردو سے متعلق منعقدہ ہونے والی کانفرنسوں اور اجلاس میں ان سے بات چیت کا اور ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہوگا۔ ملنے والے نہ صرف ان کی اردو زبان پر قدرت سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ اردو ادب خصوصاً بیسویں صدی کے اردو ادب پر ان کے غائر مطالعے سے بھی مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اردو ادب سے گہرے اور طویل تعلق کی وجہ سے وہ برصغیر کے کئی دورے کر چکی ہیں۔ اسی لیے انہیں یہ مواقع نصیب ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہم عصر اہم اہل قلم سے ملاقاتیں بھی کر سکیں اور ان کے فن پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکیں۔ عام طور پر روسی زبان میں لکھے ہوئے ان کے بیشتر مضامین اور مذاکرات میں پڑھی ہوئی تحریریں انہیں اہم ادیبوں کی تخلیقات پر ان کی دسترس کا پتہ دیتی ہیں۔ لدمیلا جنہیں ان کے دوست ان کے نام کے اختصار ''میلا'' کے نام سے پکارتے ہیں بعض عالموں کی طرح خشک اور ٹھس نہیں ہیں۔ آپ انہیں بڑے جلسوں اور نجی محفلوں میں ہندو پاک کے ان لوگوں کے درمیان پائیں گے جو ان کی اردو دانی اور اردو ادب پر ان کی گہری نگاہ کے معترف ہیں۔ ان محفلوں میں آپ انہیں شعر سنتے، سناتے، لطیف باتوں پر قہقہے لگاتے اور ان پُر مزاح باتوں میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے دیکھیں گے جو اردو والوں کی محفلوں کی خصوصیت ہیں۔ ان سے پہلی بار ملنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ کیسی بامحاورہ اور شستہ اردو میں گفتگو کر رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ میلا روسی ہیں، وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اردو میلا کی مادری زبان ہے۔ انہیں زبان پر ہی قدرت حاصل نہیں ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ اردو بولنے والوں سے کیسے گھلا ملا جاتا ہے۔ اگر کسی باہر والے کو برصغیر کے معزز شہری ہونے کا انعام دیا جا سکتا ہے تو اس کی سب سے پہلی حقدار ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا ہیں۔

میں لدمیلا کو برسوں سے جانتا ہوں اتنے برسوں سے کہ اب مجھے صحیح مہینہ اور سال بھی یاد نہیں:

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقش ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل ونظر کی، وہ قربتیں بھی وہ فاصلے سے

غالباً یہ ستر کے عشرے کی ابتدا تھی جب ہماری ملاقات علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوئی۔ میں ان دنوں وہاں کے کتب خانے میں کچھ تحقیقی کام کرنے اور پروفیسر آل احمد سرور سے ملنے گیا تھا جو اس وقت صدر شعبہ اردو تھے۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنے کام کے متعلق ان کے شعبے کے اراکین اور طلبہ وغیرہ سے خطاب کروں اور بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ کل سوویت یونین سے ایک اور عالمہ بھی تشریف لا رہی ہیں۔ وہ بھی آپ کے ساتھ اسٹیج پر موجود ہوں گی۔ اس وقت تک میں اردو میں تقریر کرنے کا کافی عادی ہو چکا تھا اور اکثر اوقات داد کا مستحق قرار پاتا تھا۔ اس کے بعد آٹو گراف بکس پر میرے دستخطوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا اور مجھے جو چند اشعار یاد تھے میں ان کتابوں پر لکھ دیتا تھا۔ دوسرے دن سہ پہر کو بغیر کسی تعارف کے لدمیلا میرے پاس اسٹیج پر آ کر بیٹھ گئیں۔ پہلے میں نے تقریر کی اور حسب معمول تالیوں کی گونج کے ساتھ ''واہ واہ، کیا کہنا، کمال ہے'' جیسے جملے کان میں پڑے۔ میرے بعد لدمیلا مائک پر آئیں۔ میرا خیال تھا کہ بہت سے یورپین عالموں کی طرح جن سے میں واقف تھا لدمیلا بھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں چند جملے کہہ کر اپنی جگہ پر جا بیٹھیں گی۔ لیکن انھوں نے تو کمال کر دیا۔ اردو اور فارسی اشعار سے سجی ہوئی ان کی تقریر دلوں میں اُتر گئی۔ بیشتر وہ اپنے لکھے ہوئے مضمون کو ایک طرف رکھ کر سامعین سے بالمشافہ خوبصورت انداز میں مخاطب ہوئی تھیں۔ ان کا لہجہ، ان کا تلفظ اور برملا محاوروں کے استعمال نے غضب ڈھا دیا۔ اس شام بلا مبالغہ وہ محفل پر چھا گئیں اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ وہ اس کی مستحق بھی تھیں۔ ایک ذہین اور خوبصورت روسی لڑکی کے مقابل ایک عام سا انگریز مرد بھلا کیا کر سکتا تھا۔

لدمیلا نے تحصیل علم کے ساتھ لوگوں کے دل کی دھڑکن بننا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے انداز اور زبان دانی کے جلوے دکھا رہی تھیں اور میرے ذہن میں یہ شعر گونج رہا تھا:

کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندنے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

دوسرے دن لدمیلا سے میری مختصر ملاقات ہوئی اور کچھ مزید تعارف ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے سوویت یونین میں اردو اور ہندی سیکھی ہے اور ریڈیو ماسکو کے شعبہ اردو میں براڈ کاسٹر اور مترجم ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی اچھی اور رواں اردو بولتی تھیں۔ گزشتہ دس سال میں میں کئی بار سوویت یونین گیا ہوں اگرچہ وہاں کئی چیزوں میں بہت سی خامیاں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض چیزوں میں ترقی بھی کی ہے اور اس ترقی کی ایک بہت نمایاں شکل ان کا نظام تعلیم ہے جس کی ایک عمدہ مثال لدمیلا ہیں۔ انھوں نے انگریزی۔ اردو اور ہندی میں مہارت حاصل کی اور بہت سے برطانوی طلبہ کے

علی الرغم انہیں ان کی دلچسپی کے شعبے ہی میں ملازمت کا موقع فراہم کیا گیا۔ اور ایک براڈ کاسٹر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی مہارت کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں علی گڑھ سے دلی جاؤں گا انھوں نے کہا کہ چند دن بعد وہ بھی وہاں پہنچیں گی۔ ان دنوں سوویت یونین کے شہریوں کے لیے غیر ملکیوں سے بے تکلفانہ سطح پر ملنا بہت مشکل تھا خصوصاً ان غیر ملکیوں سے جن کا تعلق سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ لدمیلا مجھ سے دلی میں چائے پر ملاقات کریں گی۔ ہماری ملاقات امپیریل ہوٹل کی شاندار فضا میں ہوئی۔ شام ہو رہی تھی موسم کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ برآمدے کے سامنے ہری گھاس کے قطعات پر تازہ چھڑکے ہوئے پانی کے قطرے ٹھنڈی ہوا اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو عجیب لطف دے رہی تھی:

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اس دلکش فضا میں ہم تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اس گفتگو میں بہت سے موضوعات پر باتیں ہوئیں مثلاً برطانوی طرز حیات، روسی زندگی، ہندو پاک میں ہم دونوں کے مشترکہ دوست وغیرہ۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ہم دونوں میں بہت سی باتیں یکساں ہیں۔ اگرچہ ہمارا تعلق دو مختلف ممالک سے تھا لیکن ہمارا پیشہ اور میدان ایک ہی تھا۔ ہم دونوں ہی برصغیر سے بہت متاثر تھے اور ان معنی میں ہم دونوں ہی خوش قسمت تھے کہ ہمیں خود کو اردو کی ترقی و ترویج کے لیے وقف کرنے اور ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا جو ہمیں بہت عزیز تھے۔ آخر ملاقات اختتام کو پہنچی میں ایک دو دن میں نیپال جانے والا تھا۔ لدمیلا سے میں معلوم نہیں کر سکا کہ انہیں اب کہاں جانا تھا۔ ان دنوں جب سیاسی عوام ہی یہ طے کرتے تھے کہ کسے کب اور کہاں جانا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے جلد ملنے کی امید نہیں تھی لیکن شاہجہاں کی دلی میں لدمیلا سے اس شام کی خوشگوار ملاقات آج بھی میرے دل میں بسی ہوئی ہے:

اتفاقاتِ زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

لدمیلا سے دوبارہ ملاقات تو بہت عرصے بعد ہوئی لیکن ہندو پاک کے ان دوستوں سے ان کی خیریت ملتی رہی جو ان سے ماسکو میں ملے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں، میں نے حیدرآباد دکن میں کئی ماہ قیام کیا جہاں ایک چھریرے بدن کی نیلی آنکھوں والی ایک روسی لڑکی سے ملا ان کا نام بھی لدمیلا تھا یہ بعد میں میری شریک حیات بنیں۔ یہ روس کے ایک شہر کیو سے تشریف لائیں تھیں۔ اب میں آسانی کی خاطر ان کے نام کے مخفف ''لیودا'' سے ان کا ذکر کروں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سوویت یونین اور لدمیلا نام میری قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ لیودا اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی میں روسی پڑھا رہی تھیں۔ کیو میں ان کا خصوصی میدان انگریزی تھا۔ انہیں بھی ہندوستان سے بہت محبت تھی اور فرصت کے اوقات میں وہ ہندوستان کے بہت سے علاقے دیکھ چکی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ دلی میں اردو کی ایک روسی ماہر خاتون ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا سے مل چکی ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کی مزید تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ میں اور لیودا ایک مشترک دوست رکھتے ہیں۔ شادی کے بعد میں اور لیودا اکثر وسیلیوا کا ذکر کرتے رہے اور ان سے ملنے کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ آخر مجھے ان سے ملنے کا موقع ۱۹۹۰ء میں ملا جب میں فراق گورکھپوری سے متعلق ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لکھنؤ گیا۔ بدقسمتی سے میری بیگم لیودا لندن یونیورسٹی میں اپنی تدریسی مصروفیات کی بنا پر اس سفر میں میرے ساتھ نہیں تھیں۔ گزشتہ ماہ کے ''پرواز'' کے قارئین نے ڈاکٹر وسیلیوا کی زبانی ہماری اس ملاقات کا اور میرے تحفے کا حال پڑھ لیا ہوگا لہٰذا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی بیان میں میں صرف دو مختصر ترامیم کرنا چاہوں گا۔ پہلی یہ کہ ڈاکٹر وسیلیوا نے جس تحفے کو بلاؤز بتایا ہے وہ دراصل ایک چاکلیٹ کا ڈبہ تھا۔ دوسری یہ کہ وہ میں نے کسی خوبصورت چیسی لڑکی کو پیش نہیں کیا بلکہ بھوکے نظر آنے والے کچھ پیارے پیارے بچوں کو دیا تھا۔ مجھے بچوں سے بہت پیار ہے۔ ان کی کالی آنکھوں کی معصومیت اب تک میرے ذہن میں ہے۔ میرے دو روسی دوستوں کے مقابلے میں غالباً انھوں نے وہ چاکلیٹ زیادہ شوق سے کھائے تھے۔ روس میں ایسے بھی چاکلیٹ کی کمی نہیں ہے وہاں دنیا کی بہترین چاکلیٹ بنائے جاتے ہیں۔ میں جب اپنی ہونے والی شریک حیات سے مل جل رہا تھا تو میں نے چودہ بار روس کا سفر کیا۔ ان سے ملاقاتوں کے شوق میں روسی زبان سیکھی۔ مغرب کے کچھ ہی اردو داں ایسے ہوں گے جو میری طرح اپنے ہم عصر روسی ادیبوں کی تخلیقات سے مستفید ہوئے ہوں۔ روسیوں نے ادب کے میدان میں بہت کام کیا ہے۔ روسی مطالعے کے بہت شوقین ہیں۔ روسی میں اردو نثر و نظم کے جتنے تراجم نظر آتے ہیں غالباً انگریزی میں بھی اتنے تراجم نہیں ہوئے ہیں اور اس طرح کی کتابوں پر اکثر و بیشتر ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کا نام نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ عموماً براڈ کاسٹنگ اور ۱۹۸۲ء میں ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے تقرر کے بعد بہت مصروف ہو گئی تھیں پھر بھی انہوں نے ان تراجم کے لیے وقت نکالا اور رجب علی بیگ سرور، قرۃ العین حیدر، ابوالکلام آزاد، جوگندر پال، انتظار حسین کی تخلیقات کا خوبصورت ترجمہ کیا۔ اردو شعرا میں انھوں نے اقبال، فیض، فراق، جوش، مجاز، سردار علی جعفری اور بہت سے دوسرے شعرا کے کلام کو روسی میں ڈھالا۔ اردو کی طرح روسی شاعری بھی اوزان کی نغمگی رکھتی ہے اور برصغیر کی طرح روسی معاشرے میں شاعری کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر وسیلیوا نے اپنی محنت اور خوش ذوقی سے ترجمے کو تخلیق کا درجہ دے دیا ہے اور ان روسی قارئین کے لیے مطالعے کی ایک نئی جہت پیدا کر دی ہے جن کے لیے ایسا مشرقی ادب ایک نئی دریافت ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر وسیلیوا نے حیات حالی پر ایک اہم کتاب تصنیف کی ہے اور حال ہی میں اپنے پسندیدہ فیض پر ایک یادگار

تحریر سپردِ قلم کی ہے۔سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد روسی بغیر کسی روک ٹوک کے سفر کرنے لگے اور ڈاکٹر لدمیلا نے دنیا کے مختلف ممالک میں جلد جلد منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت شروع کر دی۔ایک بار پہلے کی طرح میں ان سے پھر علی گڑھ میں ملا۔میں اکثر انہیں اپنے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا پاتا ہوں اور حسب معمول اس بار بھی وہ سامعین کی داد سمیٹ کر لے گئیں۔لیکن یہ بات میرے لیے قابل غور نہیں ہے اس لیے کہ من آنم کہ من دانم۔سوویت یونین میں حاصل کیے جانے والے میرے وسیع تجربے نے مجھے یہ سکھا دیا ہے کہ کسی خوبصورت اور ذہین خاتون کے سامنے کوئی مرد داد نہیں پا سکتا۔ان خواتین میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوٗا اور میری بیوی لدمیلا میتھیوز بھی شامل ہیں:

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ہر خوددار اور معتبر معلم کی طرح ڈاکٹر وسیلیوٗا اردو ادب کے لیے اپنی خدمات کا ذکر کم ہی کرتی ہیں۔اور اپنی کامیابیوں کی تفصیل بتانے سے گریز کرتی ہیں۔اسی لیے میں قارئین کی معلومات کے لیے ان کی خدمت میں پیش کیے جانے والے چند اعزازات کا ذکر کروں گا۔انہیں دلی میں کرشن چندر، قطر میں امیر خسرو اور لندن میں علی سردار جعفری ایوارڈ پیش کیے گئے۔ان اعزازات سے عالمی سطح پر ان کی اہمیت اور ہر دل عزیزی کا پتہ چلتا ہے۔خود ان کے ملک روس میں انہیں بہت اہمیت حاصل ہے۔اور سرکاری سطح پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ایک بار جب روس کے صدر برزنیف بھارت آئے تو ان کی ترجمان کے لیے ڈاکٹر وسیلیوٗا کا انتخاب کیا گیا۔میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ایک بار جب وہ دلی میں قیام پذیر تھیں تو ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ سوویت یونین حکومت کی خدمات کے صلے میں کیا اعزاز لینا پسند کریں گی۔وہ کسی تمغے یا خطیر رقم کا مطالبہ کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے کہا کہ ان کے لیے یہ بڑا اعزاز ہوگا کہ انہیں مزید دو ہفتے کے لیے آزادی سے دلی میں قیام کی اجازت دے دی جائے۔ان کی اس خواہش کو پورا کیا گیا۔ان تمام باتوں کے علاوہ وہ بہت بااخلاق منکسر المزاج اور مہمان نواز ہیں۔چند ہفتے قبل میں اور میری اہلیہ لیودا ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے ماسکو گئے۔ہم نے لدمیلا سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمیں لینے ہوائی اڈے پر نہ آئیں اس لیے کہ ہوائی اڈہ شہر کے مرکز سے بہت دور ہے لیکن انہوں نے ہماری ایک نہ سنی اور پڑوسی کی کار لے کر ہمارے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پر پہنچ گئیں اور طوفانی بارش میں ہمیں ہمارے ہوٹل تک پہنچا کر اپنی محبت اور ڈرائیونگ میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔یہی نہیں انہوں نے ہوٹل میں ہمیں پھلوں کی ایک ٹوکری سے بھی نوازا۔کانفرنس کے انتظام میں بے انتہائی مصروف ہونے اور اپنی تھکان کے باوجود انہوں نے ہمیں اور ہمارے ایک دیرینہ عزیز دوست کو اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا اور ہمارے لیے خود بہت لذیذ کھانا تیار کیا ایک بار کسی لکھنے والے نے کہا تھا کہ روسی بنیادی طور پر مشرقی مزاج کے حامل ہیں۔مہمان نوازی اور تواضع کے ذیل میں روسیوں کے متعلق لکھنے والے کا یہ تجربہ بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ روسی اور ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوٗا برصغیر میں رہ کر خود کو اپنے ہی گھر میں سمجھتے ہیں۔اب جبکہ وہ اکثر لندن آتی ہیں اور ہم ماسکو جاتے ہیں ہمیں ان سے ملنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں اور ہم ان کی مزیدار صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ان ملاقاتوں میں ہم اردو ادب ہی سے متعلق باتیں نہیں کرتے بلکہ اکثر زندگی کے اتار چڑھاؤ پر روسی میں بھی گفتگو کرتے ہیں جو اردو ہی کی طرح میٹھی زبان ہے۔میری اہلیہ لیودا اور میں، میلا کو اپنا ایک عزیز ترین دوست سمجھتے ہیں اور جب بھی جدا ہوتے ہیں پھر ملنے کی امید اور دعاؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

...... بُلّھا تے منصور......

بُلّھے شاہ تے منصور دوویں ''وحدت الوجود'' دے مانت سن پر اگوں ایس وحدت الوجود دیاں وی کئی شکلاں نیں تے فیر۔۔۔ ایسے طرں ''صوفی واد'' دے وی گھٹو گھٹ چار روپ نیں۔منصور حلاج بغدادی تصور دے موڈھیاں وِچ گنے جاندے نیں جدوں کہ بُلّھے شاہ دے وچار اں اُتے ہندوستانی تصوف دا ڈونگھا اثر وِی ہے۔پر ایہدا مطلب ایہ وِی نہیں کہ بُلّھے شاہ دِی وچار دھارا وِچ بغدادی تصوف دِی کوئی جھلک نہیں۔حالاں سچی گل تاں ایہ وِی ہے کہ۔۔۔ اسلام نے ہندوستانی تصوف اُتے ڈونگھے اثر چھڈے نیں۔ ایہ گل ڈاکٹر تارا چند ہوری وِی من دے نیں۔ پر ایدھر ہندوستانی تصوف جس تے اپنشداں دِی ٹھنڈی چھاں وِی ہے تے ''بدھ مت'' دا سائیان وِی ہے۔تپسیا تے ریاضت صوفیاں نے بدھ مت کولوں ہی لئی اے۔ وحدت دا تصور بھاویں اپنشداں تے گیتا وِچ وِی موجود ہے پر اسلام نے اوہنوں ہور وِی پکیائی دِتی ہے۔

ڈاکٹر گرپال سنگھ سندھو

اشاعت: ۲۰۱۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، بابا فرید بُک فاؤنڈیشن، لاہور

☆

''قفس اُداس ہے''

انتظار حسین (لاہور)

انگریزی سے ترجمہ

انوار شریف (ہیگ، جرمنی)

حال ہی میں لاہور کے فیض گھر میں ایک خوبصورت شام سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ حالیہ چند سالوں میں ''فیض گھر'' لاہور کے نمایاں ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس سے بے شمار خوبصورت یادیں وابستہ ہو چکی ہیں۔ مذکورہ شام کی اہمیت روس سے آنے والی شخصیت ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے دو چند کر دی تھی۔ فیض صاحب کی صاحبزادیوں سلیمہ اور منیزہ نے ڈاکٹر لدمیلا کا گرمجوشی سے استقبال کرتے ہوئے فیض ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقع پر جناب آئی۔ اے۔ رحمان، جناب افتخار عارف اور جناب اصغر ندیم سید نے ڈاکٹر لدمیلا کو اُن کی شاندار اردو خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فیض صاحب کی سرگزشت کا ترجمہ بہ عنوان ''پرورشِ لوح و قلم'' اور ''فیض حیات اور تخلیق'' کے حوالے سے بھی سراہا۔

اس موقع پر اصغر ندیم سید نے کہا کہ اردو کے ترقی پسند افسانہ نگار چیخوف سے متاثر رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ کہوں گا کہ اردو ادب کافی حد تک روسی ادب سے متاثر رہا ہے۔ بلاشبہ چیخوف بڑے ادیب اور اُستاد فنکار کا درجہ رکھتے تھے مگر ہم یہاں میکسم گورکی کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ گورکی کی شخصیت اور فن نے تیسری دنیا بلخصوص برصغیر کے ترقی پسند ادیبوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ فیض صاحب کے دھیمے، اُداس اور جذباتی احساسات نے بھی چیخوف کو اپنے قریب محسوس کیا ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا نے فیض صاحب کے خطوط سے چند لائن کوٹ کی ہیں جو انھوں نے بیگم ایلیس فیض کے نام تحریر کیے تھے۔ ان لائنز میں فیض صاحب نے چیخوف کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ چیخوف نے کس طرح اپنی تخلیقات میں بڑی گہرائی کے ساتھ مختصر انداز میں محبت کے احساسات کی تفہیم کی ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر لدمیلا نے فیض صاحب اور غالب سے اپنے تعارف کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ جس وقت وہ غالب کے کلام کا روسی زبان میں ترجمہ کرنے میں مصروف تھیں تو انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ اسی دوران فیض صاحب ماسکو آئے اور پروفیسر لدمیلا نے فیض صاحب سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا تو فیض بخوشی میری مدد کو تیار ہو گئے اور اس طرح مجھے فیض صاحب کے قریب ہونے کا موقع ملا جس کے ردعمل میں، میں فیض صاحب کی سرگزشت کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئی اور میں اس کا تمام تر سہرا فیض کے سر باندھتی ہوں۔

بطور اردو سکالر ڈاکٹر لدمیلا نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں جس میں سرِفہرست مولانا الطاف حسین حالی کے کلام کا روسی زبان میں سلسلہ وار ترجم ہے۔ مگر پروفیسر لدمیلا کی شناخت فیض صاحب کی سرگزشت کے مترجم کے طور پر بہت نمایاں ہے۔ فیض صاحب پر پروفیسر لدمیلا کے تحقیقی کام کے لیے ہم اُن کے مشکور ہیں اور فیض کو بطور انسان اور بطور شاعر بہتر طریق پر جان سکے ہیں۔ پروفیسر لدمیلا کے اس کام کی بدولت ہم نہ صرف فیض صاحب بلکہ اُن کے ابتدائی ایام اور اپنے والد کے ساتھ فیض کی قربت کے حوالے سے بھی ہمیں بہت کچھ جاننے میں مدد ملی ہے اور ساتھ ہی ماسکو میں گذرے فیض کے ایام کی تفصیل اس کتاب کو بہت اہم بنا رہے ہیں۔

ڈاکٹر لدمیلا نے اس کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ فیض صاحب ''لینن پرائز'' کے حوالے سے برملا اور پس پردہ ہونے والی گفتگو اور تبصروں سے بخوبی واقف تھے۔ لوگوں کے اس عمل کے باعث فیض صاحب کو ماسکو کی زندگی کے منفی رُخ دیکھنے میں دشواری کا سامنا ہوا جو اکثر غیر ملکیوں کو ہوا کرتا ہے۔

اس کے باوجود فیض صاحب روس کے اندر آزادانہ طور پر گھوما پھرا کرتے تھے جب وہ تاجکستان گئے تو وہاں کے لوگوں سے اُن کی زبان میں بے تکلف گفتگو کیا کرتے تھے۔ اصل میں یہ فارسی زبان تھی جسے روسی حکومت کی پالیسی کے باعث تاجکی زبان کہا جاتا تھا۔

ڈاکٹر لدمیلا نے فیض صاحب کی شاعری کو اپنے زاویے سے جانچا اور پرکھا ہے اور جس انداز میں اُنھوں نے فیض صاحب کی شاعری پر رائے زنی کی ہے وہ پاکستانی ناقدین سے قدرے مختلف ہے۔ ہمارے دانشور اور ناقدین کی عادت ہے کہ وہ فیض صاحب کی نظموں کے معنی و مطالب پاکستان کے حالات کی روشنی میں نکالا کرتے ہیں مگر پروفیسر لدمیلا کا کہنا یہ ہے کہ فیض صاحب اپنی نظموں میں وہ سب کچھ بیان کرتے ہیں جو انھوں نے ماسکو، بیروت اور دنیا کے دیگر ممالک میں دیکھا اور سنا۔ پروفیسر صاحبہ کے خیال میں ماسکو سے واپسی کے بعد فیض کی نظموں میں احساسِ شکست، غم، غصہ اور جھنجھلاہٹ میں نمایاں کمی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے خیال میں فیض صاحب کی شاعری میں یہ تبدیلی ماسکو کے اثرات کے باعث پیدا ہوئی۔

بہت سے تجزیہ نگاروں کی رائے میں فیض اپنے دور سے آگے دیکھنے والے شاعر تھے جبکہ ڈاکٹر لدمیلا نے فیض صاحب کی چند نظموں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فیض صاحب اپنے آخری ایام میں مایوسی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے ڈاکٹر لدمیلا کی تحریر یہ ثابت کرتی ہے کہ فیض صاحب بطور انسان اور بطور شاعر بڑے آدمی تھے۔

فیض۔۔حیات وشاعری

خالد ادیب

انگریزی سے ترجمہ

ابوحماد (امریکہ)

اردو ادب کے شائقین کے لئے یہ مقام جشن ومسرت ہے کہ بیسویں صدی کے عظیم ترین شاعر فیض احمد فیض کی ایسی سوانح عمری شائع ہوگئی ہے جسکے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ یہ آپ بیتی روس کی مشہور ادیبہ اور دانشور ''لڈ میلا واسی لیوا'' نے تصنیف کی ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف فیض کے فن بالکہ اُس دور کا بھی احاطہ کیا ہے جسے صحیح طور پر فیض کا دور کہا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ نہ صرف یہ انکی آپ بیتی ہے بلکہ اس میں انہوں نہایت تفصیل اور عرق ریزی سے انکے ادبی محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پھر اسکی خوبی یہ ہے کہ یہ اردو اور روسی زبانوں میں شائع کی گئی ہے۔

اردو کی ادبی فضا اس سلسلے میں کسی بڑی روائت کی علمبردار نہیں کہ اس میں مشاہیر کی سوانح عمریاں انکے ادبی کارناموں کی روشنی میں تصنیف کی جائیں۔ اردو ادب کے معماروں کے روائتی ''تذکروں'' کی تو کوئی کمی نہیں مگر ہمارے قدآور ادیبوں کی ایسی سوانح عمریاں جس میں انکی تخلیقات کے پس منظر سے بحث کی جائے کمیاب ہیں۔ یہ بات خاص طور سے ان ادیبوں کے سلسلے میں اور صادق آتی ہے جو کسی سیاسی تنظیم یا نظریہ سے متاثر یا منسلک تھے۔ یہ بہت آسان ہے کہ اگر اقبال اور حالی کی تخلیقات کو ان کے دور کے پس منظر میں نہ دیکھا جائے تو اسے صرف ایک ادبی کاوش ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

فیض احمد فیض اس دنیا کا شہری تھا اور اس کے کام اور کلام کی جڑیں اسی دنیا میں جاری جدوجہد میں پیوستہ تھیں۔ اس کام کے لئے انہوں نے تمام دنیا کا سفر اختیار کیا اور اپنے مشن کی پیروی میں انہوں نے بھی بہت کچھ لکھا اور ان پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ اس کے باوجود اب تک ایک بھی ایسی تصنیف نہیں تھی جس میں انکے کلام کا ایک مسلسل ترتیب اور تواتر کے حساب سے احاطہ کیا گیا ہو یا اس پس منظر کو ابھارا گیا ہو جس نے انکی شاعری کو جنم دیا۔ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اب تک انکی شاعری ہی کو مکمل طور پر یکجا نہیں کیا جاسکا ہے تو انکی سوانح عمری پر کسی کتاب کی کمیابی پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ انکی کل شاعری تک ہماری پہنچ صرف ''نسخہ ہائے وفا'' کی وجہ سے ہے جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی اور جس میں انکی شاعری کے وہ سات مجموعے شامل کئے گئے ہیں جو انکی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ اگرچہ اس کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ موجود ہے جس میں ''میرے دل، میرے مسافر'' کے شائع ہونے کے بعد لکھے گئے کچھ اشعار شامل ہیں مگر اس میں بھی وہ اشعار شامل نہیں جو کسی وجہ سے انکے گذشتہ شائع شدہ سات مجموعات میں شامل نہ تھے۔ اگرچہ یہ اشعار انکی شاعری کے اولیں دور کے ہیں اور ہوسکتا ہے یہ بڑی حد تک انکی شاعری کے ناپختہ دور کی عکاسی کریں مگر پھر بھی ادب کے طالب علموں کے لئے انکا مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس سے فیض کے ادبی سفر اور عروج کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے ''ہم دیکھیں گے'' بھی غائب ہے جو نہ صرف ایک منظوم احتجاج کی علامت ہے بالکہ اسے فیض کی مشہور اور بہت ہی پرزور نظم کہا جاسکتا ہے۔

فیض کی شاعری کے علاوہ انکی نثر نگاری پر تو مواد اس سے بھی کم ہے۔ ''پاکستان ٹائمز'' میں لکھے گئے ان کے اداریئے، افریقی ایشیائی مصنفین کے مجلے ''لوٹس'' میں انکی تخلیقات اور ایسے بہت سے انٹرویو جو انہوں نے دنیا کے مختلف شہروں میں دئے تھے، سب بکھرے ہوئے ہیں اور انکو یکجا کرنے کی بہت کم کوششیں کی گئی ہیں۔ یہ سب ان محققین کو آسانی سے دستیاب نہیں ہیں جو فیض پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

اس پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ کہ فیض پر سنجیدگی سے لکھی گئی پہلی سوانح عمری روس سے شائع ہوئی ہے۔ فیض نے سوئیٹ یونین میں کافی عرصہ گذارا اور انکی اس ملک میں بڑی پذیرائی اور عزت افزائی کی گئی۔ روس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں اعلی معیار کے تعلیمی ادارے قائم ہیں جو تحقیق وتراجم کی قابل فخر روایت رکھتے ہیں۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ سوئیٹ یونین کے ٹوٹنے کے باجود یہ ادارے اور انکا تحقیقی سرمایہ اب بھی قائم اور محفوظ ہے۔ اس پر یہ بھی ہے کہ روس کے کلچر میں شاعری کو ایسا ہی مرکزی اور پسندیدہ مقام حاصل ہے جیسا اردو میں۔ وہاں معاشرے میں کسی فرد کے تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کی یہ نشانی سمجھی جاتی ہے کہ وہ دوران گفتگو شاعری کا حوالہ دے سکے۔ ''پشکن'' تو سب ہی مقررین کا پسندیدہ ہے مگر دوسرے شاعروں کے کلام کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ شاعری کی کتابیں مقبول ہوکر خوب بکتی ہیں اور شاعری کی ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔

واسی لیواروس میں اردو تعلیم کی طویل اور قدیم روائت کی نمائندہ ہیں۔ کئی وجوہات کی بنا پر جن میں سیاسی اور لسانی وجوہات بھی شامل ہیں پاکستان میں زیادہ تر لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ روس میں اردو کی تعلیمات انیسویں صدی ہی میں شروع ہوگئی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ روس کی اس علاقے میں برطانیہ سے سیای مخاصمت تھی۔ ''ہندوستانی'' کا پہلا کورس ان روسی فوجی افسران کے لئے شروع کیا گیا تھا جو تاشقند میں تعینات تھے۔ چونکہ اس وقت روس میں کوئی ایسا نہیں تھا جو یہ کام سرانجام دے سکے اس لئے وہاں سے دو روسی افسروں کو ہندوستان بھیجا گیا۔ اس مقصد کے لئے ''وائیگورنٹسکی'' نے ایک سال ہندوستان میں گذارا اور واپسی پر ''ہندوستانی گرامر'' اور ''ہندوستانی سیکھنے کا مینول'' تالیف کیا۔

''ایا جیلو'' نے دوسال پیرس میں مشرقی علوم کی درسگاہ میں گذارے اور دو کتابیں ''اردو روسی لغت'' اور ''پریکٹیکل گرامر اردو'' لکھیں۔ مگر بدقسمتی سے یہ

کوششیں روسی انقلاب کے بعد معدوم ہوگئیں اور ۱۹۴۰ء تک اردو گمنام رہی جب کہ لینن گراڈ اور ماسکو میں ایک بار پھر اردو کی تعلیم شروع کی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سوئیٹ یونین کی حکومت بے شمار زبانوں میں تمام دنیا کے لئے اپنا پیغام نشر کرنا چاہتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں اردو تاشقند کے ''الیرونی انسٹیٹیوٹ برائے مشرقی علوم'' میں بھی پڑھائی جانے لگی۔ تاشقند کا ادبی ماحول ویسے بھی اردو کے قریب تھا (شاید اس لئے کے تاشقند کی ادبی زبان فارسی تھی جو سوئیٹ یونین کے بعد بھی بڑی حد تک رائج تھی۔۔۔ مترجم) اگلی کئی دہائیوں میں روس میں کئی اردو مصنفین اور دانشور پیدا ہوئے جنہوں کے بہت قابل قدر ادب تخلیق کیا بلکہ اردو کی چیدہ چیدہ تخلیقات کے ترجمے بھی کئے۔ اس کی وجہ سے لڈمیلا واسی لیوا کے قارئین کو اردو کے ایسے مشاہیر جیسے غالب، حالی، اقبال اور فیض کے کلام اور کام سے واقفیت حاصل ہوئی۔

واسی لیوا اس وقت ماسکو کے مشرقی علوم کے ادارے میں سینئر محقق کے عہدے پر فائز ہیں اور روس میں اردو کی اول ترین ماہر، دانشور، محقق اور مصنف ہیں۔ انہوں نے ماسکو کی اسٹیٹ یونیورسٹی میں اردو کی تدریس کی ہے اور وہ ماسکو ریڈیو سے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۴ء تک اردو کے براڈ کاسٹر رہی ہیں۔ انہوں نے مولانا حالی پر ایک کتاب لکھی اور اسکے علاوہ اقبال اور فیض پر بیش قیمت کام کیا ہے۔ انہوں نے غالب اور دوسرے شعرا کے کلام کا روسی ترجمہ کیا ہے۔ نثر میں انہوں نے قرۃ العین حیدر، ابوالکلام آزاد، جوگندر پال اور پریم چند بھی ترجمہ کیا ہے ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۴ء تک، یعنی سترہ سال وہ فیض کی روس میں مترجم رہیں جب فیض روس کے دورے پر ہوتے تھے۔ اس قربت کی وجہ سے اس کتاب میں لڈملا نے نہ صرف فیض کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کتاب میں فیض اور انکے کنبے سے اپنی ذاتی دوستی اور طویل رفاقت کی جھلک بھی دکھائی ہے۔

یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں مکمل ہوئی اور اسی سال سکا روسی ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ روسی ایڈیشن اسامہ فاروقی جو روسی زبان کے مشہور عالم مترجم ہیں کی نظر سے گذرا اور انہوں نے فوراً اسکا باب در باب ترجمہ کر کے قسط وار حیدر آباد (دکن) کے موقر جریدے ''سب رنگ'' میں شائع کیا۔ ابھی انہوں اسکے چودہ میں سے صرف نو (۹) ابواب ہی کا ترجمہ کیا تھا کہ انکا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اسکے بقایا ابواب، جو ایک سو تیرہ صفحات پر مشتمل ہیں، کا ترجمہ خود لڈمیلا والی سیوا نے کیا اور اسے کراچی سے طبع کرا کے شائع کیا۔ مصنفہ کے ترجمے میں، اردو قارئین کے مزاج اور اصلی کتاب کی اشاعت کے بعد پانچ سال گذرنے کی وجہ سے کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے کتاب کو مزید تقویت دی ہے کہ اب اس کے مشمولات تازہ اور فی الوقت ہو گئے ہیں۔ افسوس کہ روسی ایڈیشن میں جو تصاویر شامل ہیں وہ اردو ایڈیشن میں موجود نہیں ہیں۔

اس میں فیض کی زندگی کے متعلق جو کچھ درج ہے وہ اس سے مختلف نہیں جو ہم پہلے ہی جانتے ہیں۔ فیض نے خود ہی کئی مقامات پر اپنی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کی ہے اور انکی حیات کے متعلق والی سیوا کا بیان فیض کے اپنے ہی بیانیہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ والی سیوا کی تحریر اس وجہ سے قابل ذکر نہیں کہ اس میں کچھ نئی دریافتیں کی گئی ہیں بالکہ اس لئے قابل توجہ ہے کہ انہوں نے ایک تسلسل کے طور پر فیض کی زندگی کے مختلف ادوار کا احاطہ کیا ہے۔ لڈمیلا نے فیض کی اپنی یادوں اور ان روایات سے جو ان کے ساتھیوں نے بیان کی تھیں انکی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ خاص طور سے لڈمیلا نے انکی شریک حیات اور دوست ایلس کے تذکروں اور ان خطوط سے جن کا تبادلہ فیض اور ایلس کے درمیان فیض کی اسیری کے دوران ہوا تھا ذبردست فائدہ اٹھایا ہے اور اس سے ایک بیحد اثر انگیز تاثر قائم کیا ہے۔

دراصل جس چیز کی وجہ سے لڈمیلا کی سوانح نگاری نے فیض کو زندہ جاوید کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ایک طویل عرصے تک فیض اور انکے گھرانے کی قربت اور دوستی نصیب رہی لیکن اس کے ساتھ ہی کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اس قربت یا دوستی کی وجہ سے انکا مشاہدہ یا فیض کے کام یا کلام کی پر انکی تنقیدی پرکھ متاثر نہیں ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر چہ فیض اس کتاب کے ''ہیرو'' ہیں مگر یہ کتاب صرف ایک اندھی تعریف ہی نہیں بالکہ ایک صحیح الذہن اور غیر جانبداری کے ساتھ انکی تخلیقات کا تجزیہ ہے۔ یہ شاعر کے کلام کا اس کے دور کے تناظر میں ایک معروضی تذکرہ ہے۔

فیض کی زندگی۔۔۔ کیسی مثالی زندگی!! فیض کے والد سلطان محمد خان ایک خود ساختہ انسان تھے۔ وہ سیالکوٹ کے قریب کالا قادر گاؤں میں ایک غریب کسان کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی شوق سے وہاں پرائمری اسکول میں داخلہ لیا اور اسکے بعد ایک اچھے مستقبل اور ترقی کی جستجو میں لاہور کی راہ لی۔ اتفاق ہی تھا کہ وہاں ایک مسجد میں انکی ملاقات ایک افغان امیر سے ہوگئی جو انہیں کابل لے گیا۔ انکو کابل کے فرماں روا امیر عبدالرحمن کے دربار میں ملازمت مل گئی۔ یہاں اگر چہ انہیں عزت و دولت میسر تھی مگر محلاتی سازشوں نے انہیں بھیس بدل کر انگلینڈ فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ انگلینڈ میں کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے انہیں ایک دفعہ پھر افغانستان کی سفارت خانے میں ملازمت مل گئی۔ سلطان محمد خان نے قانون کی ڈگری لی اور بیرسٹر بن کر واپس ہندوستان آئے اور سیالکوٹ میں رہائش اختیار کی۔ اگر سلطان محمد کی یہ ترقی معجزانہ نظر آتی ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اس میں وہ تمام عناصر شامل ہیں جو اسلام کی روایات کے تحت غیب کی مدد اور اللہ تعالی کی نوازش سے ممکن ہوتے ہیں۔ بیرسٹر سلطان محمد کی زندگی کی یہ بھی حقیقت ہے کہ افغانستان سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ کئی بیویاں اور انکے رشتہ دار بھی لائے تھے جو سب فارسی بولتے تھے اگر چہ مقامی طور پر اسے ''دڑی'' کہا جاتا ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ فیض ایک ایسے گھرانے میں پلے بڑھے جہاں فارسی بولی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کے اردو کلام میں اعلے سطح کی فارسی کی آمیزش ہے اور اس سے انکو ایک منفرد حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

فیض نے پہلے پہل ایک مدرسہ میں تعلیم کا آغاز کیا مگر بعد میں وہ اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہوئے جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔اس دور میں ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ اس قسم کی تعلیم جہاں دینی پس منظر کے ساتھ انگریزی تعلیم شامل ہو ان جیسے متمول اور اشرافیہ کے بچوں کے لئے ضروری تھی۔اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں پہلے گورنمنٹ کالج اور اسکے بعد اورینٹل کالج سے انگریزی ادب اور عربی میں ماسٹرس کیا۔وہ اپنے ہائی اسکول ہی کے زمانے سے انگریزی ناولوں کے رسیہ ہو گئے تھا اور اسکی وجہ سے کبھی کبھی انکو اپنے ہائی اسکول کے استاد کا غیض وغضب کا نشانہ بننا پڑتا تھا کہ وہ اسکی انگریزی کی غلطیاں نکالا کرتے تھے۔گورنمنٹ کالج میں انکا واسطہ یورپین ادب سے پڑا جسکا انگریزی ترجمہ انہوں نے بہت ڈوب کر پڑھا۔لاہور میں سخت سیاسی فضا تھی ہر طرف سیاسی حالات کا ذکر تھا بقول انکے کمروں میں غیر قانونی کتابچے اور دوسرا لٹریچر بکھرا ہوتا تھا مگر اس وقت فیض کو صرف شاعری سے دلچسپی تھی بلکہ انہیں شاعری سے دیوانگی کی حد تک رغبت تھی۔یہ تو بعد میں ۱۹۳۵ء میں جب وہ امرتسر میں ایم اے او (MAO) کالج میں انگریزی کے استاد تھے کہ انہیں سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی اور سیاست کو انکی زندگی میں اولیت حاصل ہوئی۔محمود الظفر اور انکی اہلیہ رشید جہاں، جو انگلینڈ سے واپس آئے تھے اور اشتراکی نظریہ کے حامل تھے۔کی دوستی اور صحبت نے فیض پر زبردست اثر کیا۔فیض کے اپنے الفاظ میں ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' کے مطالعہ نے جس پر اگرچہ ہندوستان میں پابندی تھی مگر انکے دوستوں نے انہیں مہیا کیا تھا، نے انکی زندگی بدل دی۔یہ لمحہ انکے ذہنی سفر میں ایک سنگ میل تھا۔اُس وقت کے بعد انہوں نے ایک سیاسی اور عوامی زندگی شروع کی جس میں عام آدمی کی مشکلات اور اسکے دکھوں کی ترجمانی انکا مقصد حیات بن گیا جو انکی زندگی کے خاتمے تک جاری رہا۔انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں اہم ترین کردار ادا کیا (اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس انجمن کے اردو قلمکاروں نے کیسا تاریخ ساز رول ادا کیا) فیض بہت جلد اس انجمن کی اہم ترین آواز بن گئے۔

ترقی پسندی کی تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں ''غم دوست'' سے ''غم دنیا'' کی جانب تبدیلی، فیض کے پہلے مجموعہ ''نقش فریادی'' میں منعکس ہے جو اگرچہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا مگر اسکی نظمیں اور غزلیں گزشتہ دہائی میں لکھی گئی تھیں۔اس میں فیض نے اردو شاعری کے روایتی اسلوب سے منحرف ہوئے بغیر موجودہ ترقی پسند موضوعات کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا ہے۔فیض احمد فیض کے دوست اور اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کے الفاظ آج شاید مبالغہ لگیں مگر اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔انہوں نے لکھا ہے کہ ''شاعر نے زندگی میں جن قدروں کی نمائندگی کی ہے وہ آج تمام عالم انسانیت کی قدریں ہیں۔مگر فیض نے اپنے انداز بیان میں اس خوبی سے نبھایا ہے کہ نہ تو وہ ہمارے ادب کی روایتی انداز سے جدا لگتی ہیں نہ ہی شاعر کی اپنی انفرادیت سے۔اسکا دھیما اور نرم لہجہ ایک میٹھی نغمگی لئے ہے''

اس کے باوجود فیض کی طبیعت انجمن سازی سے میل نہ کھاتی تھی اور انکے تعلقات انجمن ترقی پسند مصنفین سے آزادی ہند کے بعد زوال پذیر ہوتے گئے۔اسی طرح وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر نہ رہے لیکن جب دوسری جنگ عظیم میں حالات نے سویٹ یونین کو بھی اس میں گھسیٹ لیا تو فیض نے انڈین آرمی میں شرکت اختیار کر لی تا کہ وہ نازی اور فاشی حکومتوں کے خلاف اپنا فرض پورا کر سکیں۔انکی ذمہ داری تھی کہ وہ ہندوستانی فوجیوں کے حوصلوں کو بلند کرنے میں مدد کریں۔یہ فرض انہوں نے اس قدر اچھی طرح نبھایا کہ انہیں برطانوی حکومت کی جانب سے ''ممبر آف برٹش ایمپائر'' کا اعزاز عطا ہوا۔جنگ کے خاتمے پر انہوں نے فوج سے سبک دوشی حاصل کر لی اور ایک بار پھر لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔یہاں وہ ایک نئے، باوقار اور بائیں بازو کی پالیسی رکھنے والے اخبار ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔یہی زمانہ تھا جب ملک تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔لاہور میں فیض کی مصروفیات کئی جہتوں میں تھیں وہ صحافت، ٹریڈ یونین اور بین الاقوامی امن کی تحریکوں میں سرگرم رہے۔مگر اس نئی مملکت میں حالات ان نظریات کے موافق نہ تھے کیونکہ حکومت وقت کا جھکاؤ واضح طور پر دائیں طرف تھا اور وہ امریکی پالیسیوں کی حمایتی بن گئی تھی۔

۱۹۵۱ء میں فیض نے فوج کے کچھ اعلی افسران سے جو انکے اپنے فوج کے زمانے سے دوست تھے، ملاقات کی۔یہ بھی حالات سے دلبرداشتہ تھے اور چاہتے تھے کہ ملک میں تبدیلی لائی جائے۔فیض نے سجاد ظہیر کو بھی جو اس وقت پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے اس ملاقات میں راولپنڈی مدعو کیا۔اگرچہ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت ایسی کسی کوشش کے لیے حالات سازگار نہیں مگر کسی طرح حکومت کو اس ''سازش'' کا پتہ لگ گیا اور ان تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔اب پچاس سال گذرنے کے بعد جب اس واقعہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یقیناً یہ بات حیران کن لگتی ہے کہ ایک شہری حکومت نے فوج کے اعلی افسران پر ہاتھ ڈالا تھا اور انہیں بائیں بازو کا انقلاب لانے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔بہر حال ایسا ہوا۔فیض بھی گرفتار کر لئے گئے اور کچھ عرصے ان کے سر پر سزائے موت منڈلانے لگی۔بالآخر انہیں چار سال سزائے قید ہوئی جس میں وہ وقفہ شامل تھا جو مقدمے کی کارروائی میں صرف ہوا تھا۔اس سزا کے دوران فیض ایک بار پھر اپنی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اس لئے کہ سن چالیس کی دہائی میں اسے پس پشت ڈال دیا گیا تھا انکا دوسرا مجموعہ ''دست صبا'' اور تیسرا مجموعہ ''زنداں نامہ'' میں شامل انکی زیادہ تر تخلیقات قید کے زمانے میں لکھی گئیں۔

جب فیض رہا ہوئے تو سرد جنگ اپنے عروج پر تھی اور پاکستان مکمل طور پر امریکا کا اتحادی بن چکا تھا۔بائیں بازو کے اخبارات اور ٹریڈ یونین کو نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان حالات میں پاکستان میں فیض کے کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔مگر اب تک فیض ایک بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا تھا اور اگرچہ پاکستان

میں نہیں مگر بین الاقوامی سطح پر اسکے کرنے کو بہت کچھ تھا۔

انہوں نے ۱۹۵۶ میں دہلی میں ایشیائی قلمکاروں کی کانفرنس میں شرکت کی اور پھر تاشقند میں ۱۹۵۸ میں ہونے والی افروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کرنے والے صرف دو پاکستانی نمائندگان میں سے ایک وہ تھے۔ابھی جب کہ تاشقند میں یہ کانفرنس چل رہی تھی پاکستانی فوج نے پہلی بار حکومت کا تختہ الٹ دیا اور پورے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ان نئے حکمرانوں اور ان فوجیوں میں جنہوں نے ساتھ سال پہلے راولپنڈی میں انقلاب کی کوشش کی تھی کوئی مماثلت یا تعلق نہ تھا۔فیض کو واپس آتے ہی پھر گرفتار کر لیا گیا مگر اس دفعہ یہ گرفتاری بہت مختصر وقفے کے لئے تھی۔رہا ہونے پر انہیں معلوم ہوا کہ صحافت اور ٹریڈ یونین کے میدان ان پر بند کر دئے گئے ہیں۔بین الاقوامی امن کمیٹی میں انکی شمولیت اب بھی جاری تھی اور دوسری طرف انکی ادبی شہرت اور پہچان میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔انکے کلام کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو رہا تھا اور ۱۹۶۲ میں سوئیٹ یونین نے انہیں ''لینن ایوارڈ'' عطا کیا جو اس ملک کا سب سے بڑا شہری ایوارڈ ہے جو کسی غیر ملکی شہری کو دیا جا سکتا ہے۔جب انہیں اس اعزاز کی وصولی کے لئے ملک چھوڑنے کی اجازت ملی تو پھر پاکستان نہیں لوٹے اور انہوں نے دو سال برطانیہ میں رہائش اختیار کی۔یہ خود ساختہ جلاوطنی ۱۹۶۴ میں انکی وطن واپسی پر ختم ہوئی۔اس کے بعد وہ آٹھ سال پاکستان آرٹس کانسل میں آرٹس کی تعلیم اور انتظام میں مشغول رہے۔اس وقت وہ بیحد ہر دلعزیز ہو چکے تھے انکی غزلیں گائی جا رہی تھیں اور کئی فلموں میں بھی انکی شاعری کو استعمال کیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے پاکستان کے آسمان سیاست پر جلوہ گر ہونے بعد حالات میں تبدیلی آئی۔اب حکومت کی پالیسیاں ایسی تھی جن سے فیض متفق تھے۔بھٹو نے انہیں وزارت تعلیم کے ثقافتی شعبہ میں مشیر کے عہدے پر تعینات کر دیا۔انہوں نے اگلے چار سال اسلام آباد میں اس اس عہدے پر کام کیا اور ''لوک ورثہ'' کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔اسی کے ساتھ انہوں نے کلاسیکل موسیقی میں تحقیقی شعبہ بھی قائم کیا۔لیکن یہ اچھے دن زیادہ عرصے نہیں رہے۔نہ صرف ۱۹۷۷ کے فوجی انقلاب کے بعد انہیں یہ عہدہ چھوڑنا پڑا بلکہ اس کے ساتھ ملک بھی چھوڑنا پڑ گیا۔وہ ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۲ کے سال انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی میں گذارے مگر پھر انکے افروایشیائی رابطے کام آئے اور انہیں اسکے مجلے ''لوٹس'' کی ادارت، جو اب قاہرہ سے بیروت منتقل ہو گیا تھا تفویض ہوئی۔اسطرح فیض نے تین سال بیروت میں گذارے جب بیروت شدید بیچینی اور بدامنی کے دور سے گذر رہا تھا۔

اس مختصر قیام کے دوران فیض فلسطینی جدو جہد اور تحریک سے گہری طور پر متاثر اور منسلک ہو گئے جس کے نتیجے میں انکے یاسر عرفات سے گہرے مراسم ہو گئے۔انکا آخری مجموعہ ''میرے دل، میرے مسافر'' یاسر عرفات ہی سے منسوب ہے۔وہ ۱۹۸۲ میں، جب اسرائیل نے بیروت کا محاصرہ کیا ہوا تھا شہر سے نکل نے میں کامیاب ہو گئے۔اس دور میں انہوں نے دنیا کے بہت سے ممالک کے دورے کئے جن میں دور دراز کے علاقے جیسے منگولیا، ویٹنام، انگولا شامل ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستان، برطانیہ، کینیڈا اور امریکا کے دورے بھی کئے۔انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انکی جلاوطنی کے کوئی باضابطہ احکامات نہیں اور اسلئے وہ ۱۹۸۳ میں واپس لاہور آ گئے۔انکی صحت جو کچھ عرصے سے زوال پذیر تھی اس خود ساختہ جلاوطنی سے مزید خراب ہو گئی اور آخر کار وہ ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ کو لاہور کے میو ہسپتال میں قلب کے شدید حملے سے انتقال کر گئے۔

لڈمیلا واسلیوانے یہ کہانی بہت محبت اور اور لگاؤ سے بیان کی ہے۔اس نے ان کی زندگی کے مختلف ادوار کو ان کے زمانے کے سیاسی حالات اور اس سے ان کی وابستگی کے پس منظر میں بہت موثر انداز سے بیان کیا ہے۔اس نے انکے ذہنی جھکاؤ جو نوآبادیاتی نظام کی مخالفت، مارکسزم کی کشش، ترقی پسند مصنفین کی تحریک، پاکستان میں بائیں بازو کی جدو جہد پر مشتمل تھا، کو سرد جنگ کے تناظر میں انتہائی اثر انگیز طور پر بیان کیا ہے۔

وہ انکی زندگی اور انکی شاعری کے تانے بانے کامیابی سے ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔اس کتاب کا بنیادی مقصد روسی قارئین کو فیض کی شاعری اور انکے حالات زندگی سے آگاہ کرنا ہے۔اس سلسلے میں اس نے اردو شاعری، اسکی سماجی روایات خاص طور سے مشاعروں کی روائت کو روسی عوام سے متعارف کروایا ہے۔اس نے کھل کر اردو شاعری کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔کچھ ایسے جو پہلے ہی ترجمے ہو چکے تھے اور کچھ کے ترجمے خاص طور سے اس کتاب کے لئے گئے ہیں۔اس نے کچھ خاص نظمیں ایسی چنی ہیں جنکے نہ صرف اس نے حرف بحرف ترجمے کئے ہیں بالکہ ان اشعار کے تجزیہ بھی کئے ہیں۔یہ نہ صرف روسی بلکہ اردو قارئین کے لئے بھی فائدہ مند ہونگے۔

جو چیز فیض احمد فیض کو ایک انتہائی اول درجے کا دانشور قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ناقابل یقین مجموعہ اضداد تھے۔ایک اردو شاعر جو پنجاب کے ایک فارسی بولنے والے گھرانے میں پیدا ہوا تھا، جس نے اسلامی تعلیمات کے ساتھ کرسچن مشن اسکولوں میں تعلیم پائی، جو اعلی درجہ کی فارسی ملی اردو شاعری تخلیق کرتا تھا، عربی کا درس دیتا تھا، نہایت شستہ اور پرزور انگریزی لکھتا تھا، وہ شہنشاہیت کے خلاف تھا مگر سلطنت برطانیہ کا شہری تھا ایک سخت حب الوطن مگر جسکی بیوی انگریز تھی، ایک ایسا مصنف جو نوآبادیاتی نظام کے خلاف اعلی معیار کا ادب تخلیق کر سکتا تھا، جسکی دوستیاں اور کام کئی براعظموں پر محیط تھیں جس نے سرحدوں کی تفریق مٹا دی۔۔یہ تھا فیض احمد فیض۔

ایک مشہور امریکی عرب دانشور اور مصنف ایڈورڈ سعید نے سرسری طور ہر فیض کا اپنی کتاب ''کلچر اور شہنشاہیت'' میں ذکر کیا ہے۔نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد تخلیق کئے گئے ادب میں بار بار فیض کا نام لیا گیا ہے مگر افسوس اس دور کے ناقدین نے سنجیدگی سے انکا جائزہ نہیں لیا۔

خود کو ''بین الاقوامی'' کہتے تھے۔یعنی انکی سوچ وفکر عالمی تھی اور وہ تمام عالم کے مچلے اور کچلے ہوئے لوگوں کے درد کو یکساں طور پر محسوس کرتے تھے۔آج کے دور میں ''بین الاقوامیت'' کی اصطلاح شاید ہی سنی جائے اسکی جگہ اب ''گلوبلائزیشن'' نے لے لی ہے حالانکہ گلوبلائزیشن کا مطلب بین الاقوامیت سے بالکل مختلف ہے۔

''اگر چہ ایک مصنف یا فنکار ہونے کی حیثیت سے میں نہ تو کسی مملکت کے نظام کو چلا رہا ہوں نہ ہی میرے ہاتھوں میں کوئی اختیار ہے مگر مجھے اس بات کا حق ہے کہ میں اپنی برادری کا تحفظ کروں اور میری برادری تمام عالمِ انسانیت ہے۔اور اس تناظر میں میرے لئے امن، باہمی تحمل اور جوہری خطرات جیسے مسائل اہم ہیں۔اس کے علاوہ عام انسانیت کی اس عظیم برادری میں مجھے سب سے پیارے (انکے دکھ) ہیں جن کو بے عزت کیا گیا ہے، کچلا گیا ہے، جو بے گھر اور لا وارث ہیں جو غریب اور کم مایہ ہیں اور جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔اور اسی وجہ سے فلسطین جنوبی افریقہ، نمیبیا اور چلی کے عوام میرے دل کے ایسے ہی قریب ہیں جیسے میرے اپنے ملک کے عوام۔''

اس قسم کے خیالات اور عزم کی پختگی نے سرد جنگ جیسی شدید نظریاتی ٹکراؤ کی فضا میں ''بعد نو آبادیاتی دور ک'' کے دانشوروں میں ہلچل مچادی۔دراصل دو سوپر پاورز کے درمیان کلچر کی تفریق ایک بڑی خلیج اور کشمکش کی وجہ بن گئی۔امریکیوں نے تیسری دنیا کے لوگوں کے دل جیتنے کے لئے ''جاز'' کے موسیقار بھیجے مگر اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے گھٹیا حربے بھی استعمال کئے جس میں تیسری دنیا کے مصنفین اور صحافیوں کو بڑی بڑی رقمیں پیش کیں اور حکومت کے خرچے پر امریکا کی سیاحت کی دعوتیں دیں تا کہ وہ امریکی طرز زندگی کی حمایت اور سوئیٹ یونین کے مخالفت میں اثر انگیز مضامین اور خطوط لکھیں۔اس قسم کی احمقانہ حرکتوں نے اردو ادب میں ایک قابل ذکر مثال چھوڑی جب لاہور میں واقع امریکی ایجنسی برائے اطلاعات ومعلومات نے سعادت حسن منٹو کو امریکا کی حمایت میں مضامین لکھنے کے لئے ایک بڑے مشاہرے پر تیار کیا۔منٹو نے ان مضامین کو ایک مذاحیہ رنگ دے دیا اور یہ ''انکل سام کے نام خطوط'' کی شکل میں ظاہر ہوئے جنہیں پڑھ کر ہنسی آتی تھی۔سوویٹ یونین کے پاس ڈالروں کی تھیلی تو نہ تھی مگر وہ قلمکاروں کے صحیح جذبات سے فائدہ اٹھاتے تھے جس کے نتیجہ پرزور جذباتی مضامین ہوتے تھے۔سوئیویٹ یونین خود کو نئے آزاد شدہ ممالک کا مضبوط سہارا اور حمائتی قرار دیتا تھا۔وہ تیسری دنیا کے ممالک کو ترقی کے لئے سرمایہ دار نظام کے مقابلے میں ایک نعم البدل یعنی جاگیرداری کے بدلے اشتراکی نظام کی پیش کش کرتا تھا۔تاشقند اس قسم کی ترقی، جو اشتراکی نظام سے حاصل ہوئی تھی، ایک زندہ اور قابل تقلید مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔سوویٹ یونین نے تیسری دنیا کے سینکڑوں طلبہ کو اپنے ملک بلایا تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی افرو ایشیائی قلمکاروں کی پہلی کانفرنس روس میں ہوئی۔فیض پہلے پہل اسی کانفرنس میں شرکت کے لئے ۱۹۵۸ میں سوئیٹ یونین گئے تھے۔اسکا یقین بھی نہیں تھا کہ انہیں اس میں شرکت کے لئے جانے بھی دیا جائیگا مگر آخیر میں حکومت پاکستان نے دو افراد پر مشتمل ایک وفد بھیجنے کی اجازت دیدی۔وفد کے دوسرے رکن مشہور شاعر حفیظ جالندھری تھے۔کانفرنس کے منتظمین میں شامل ہونے کی وجہ سے فیض نے یہ یقینی بنایا کہ کانفرنس میں مشاعرہ بھی ہو۔اس کانفرنس کے ریکارڈ میں صرف ایک دفعہ فیض کا ذکر ہے وہ بھی انکی ایک تقریر جو افرو ایشیائی انجمن کے انتظامی دھانچے، اسکے دفاتر اور اسکے مجلّے سے متعلق تھی۔وہ دوبارہ سوئیٹ یونین ۱۹۶۲ میں گئے جب انہوں نے ''لینن'' ایوارڈ حاصل کیا اس موقعہ پر انہوں نے ''کریملن'' میں انعام وصول کرتے ہوئے اظہار تشکر کے طور پر اردو میں تقریر کی۔

فیض احمد فیض کو اس سے اچھا موقعہ نہیں مل سکتا تھا کہ وہ سوئیٹ یونین کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوجائیں کہ اب وہ لینن انعام یافتہ تھے۔اس نے ان پر سوئیٹ یونین میں ہر قسم کے دروازے وا کر دئے۔انکی شاعری کا مجموعہ ''دست صبا'' پہلے ہی ۱۹۶۰ میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا تھا اس بعد تو آئندہ دو دہائیوں میں انکی نظموں کے ترجمے ایک عام بات ہوگئی یہ موقر مجلوں میں اور علیحدہ کتابچوں کی شکل میں شائع ہونے لگیں اور پھر انکی شاعری کے مجموعے ۱۹۷۷ ، ۱۹۸۳ اور ۱۹۸۵ میں تین زخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔انکی شاعری کے ترجمے روس کے مشہور اور نامور شاعروں نے کئے تھے اور انکی بڑے پیمانے پر اشاعت ہوئی۔انکی نظموں اور غزلوں کے روسی تراجم کے ریکارڈ بنائے گئے اور بڑی تعداد میں فروخت ہوئے۔فیض وہاں ہر دلعزیزی کی معراج پر تھے اور جب وہ ضیاء الحق کے دور میں خود ساختہ جلاوطنی کا دور گذار رہے تھے انکی سترویں سالگرہ ماسکو کے ایون مصنفین میں بڑی شان وشوکت سے منائی گئی۔سوئیویت یونین کے درجنوں فنکاروں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور انکی تقریر کو توجہ اور دلچسپی سے سنا گیا۔ان کے ساتھ سوئیویٹ ہسپتالوں اور اسپا میں شاہانہ سلوک کیا گیا اور انہیں تیسری دنیا کے دوسرے نامور مصنفین جیسے ناظم حکمت، پابلو نورودا کے علاوہ سوئیویٹ یونین کے مسلم دانشوروں اولے سلیمانوو، رسول حمزہ اور چنگیز اعتمانوو سے بھی ملنے اور دوستی بڑھانے کا موقعہ نصیب ہوا۔فیض نے ان کی شاعری کا اردو میں ترجمہ کیا اور اسی اثنا میں انہوں نے کچھ نئی شاہکار نظمیں بھی تخلیق کیں جنکا بعد میں انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔

سوئیویٹ یونین کے متعلق فیض کی اپنی یادوں پر مشتمل کتاب ''ماہ و سالِ آشنائی'' جو اردو میں پہلی دفعہ ماسکو سے شائع ہوئی، کا مطالعہ اس دور کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے جو کبھی کا گذر چکا۔میرا خیال ہے کہ لدمیلا نے اسکو ایک پروپیگنڈا پر مشتمل کتابچہ قرار دیکر اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔اس کتاب کی تصنیف کے لئے ۱۹۷۴ میں فیصلہ کیا گیا تھا یہ ۱۹۷۵ میں تکمیل کو پہنچ گئی تھی مگر اسکی اشاعت ۱۹۷۹ تک ممکن نہ ہوسکی۔کتاب کا انداز یہ ہے کہ جیسے مسافر یا سیاح جسکے دل میں سوئیویٹ یونین کے لئے ہمدردی ہے اس ملک سے گذر رہا ہو اور اپنے مشاہدات بیان کر رہا ہو۔یہ صحیح ہے کہ فیض نے سوئیویٹ یونین کی ایک دلفریب تصویر کشی کی

ہے اور کہیں بھی اس پر کوئی تنقید نہیں کی، مگر جو کتاب کا انداز ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ قدرتی چیز تھی۔ دراصل کو اس بات کا موقعہ ہی نہیں ملا کہ وہ اسکو مکمل کرتے، اسکی وجہ سے کتاب کا حجم مختصر تھا اور ناشر نے اسکا حجم بڑھانے کے لئے کئی صفحات اس میں صرف تصویروں کے گھسیڑ دئے ہیں جنکا فیض سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسکے علاوہ اس میں فیض کی وہ نظمیں بھی شامل کردی ہیں جو فیض نے اپنے روس کے قیام میں لکھی تھیں۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض کے سوئیویٹ یونین کے سفر بڑے مزے کے ہوتے تھے جس میں انکو بہت سے ہم قلم ادیب اور شاعروں سے ملنا نصیب ہوتا تھا، دور دراز کی سیاحی اور روسی تفریح گاہوں کی سیر کا موقعہ ملتا تھا اور ان سب کا خرچہ حکومت برداشت کرتی تھی۔ یہ دورے شاعری کے لئے بہت زرخیز ہوتے تھے اگرچہ اس شاعری میں سوئیویٹ یونین سے متعلق موضوعات نہیں ہوتے تھے۔ اس پوری کتاب ''نسخہ ہائے وفا'' میں صرف ایک نظم جو سوئیویٹ یونین کے متعلق کہی گئی ہے وہ ''لینن گراڈ کا گورستان'' ہے۔ اسکا انداز بیان نہایت پر زور ہے۔ ایک دوسری نظم ''اشکا آباد کی ایک شام'' صرف ایک سوئیویٹ شہر کے نام ہے مگر اس میں اشتراکیت کے متعلق کوئی ذکر نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ فیض کا روس سے تعلق ایک پیچیدہ موضوع ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کاش لڈمیلا انکی زندگی کے اس پہلو، یعنی سوئیویٹ یونین سے انکے تعلق پر ایک سے زیادہ باب لکھتیں۔ کتاب کا صرف ایک باب ''فیض اور سوئیویٹ یونین'' فیض کے روس سے تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں مگر یہ باب روسی ایڈیشن میں صرف پندرہ صفحات اور اردو میں اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے قاری کی تشنگی نہیں بجھتی۔ یقیناً اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔

فلسطین کا مسئلہ آج بھی موجود ہے مگر اب کتنے لوگ ہیں جنہیں جنوبی افریقہ اور نمیبیا میں سفید فام اور رنگ دار عوام کے درمیان تفریق اور جدا گانہ طرز زندگی کی سرکاری پالیسی کے خلاف کیسا عالمی غم وغصہ کا اظہار کیا گیا تھا اب جبکہ جوہری بم کے خطرات سوائے ایران سے متعلق ایک خوف کے، بڑی حد تک معدوم ہو چکے ہیں تو ہم فیض کی زندگی کے اس پہلو سے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا مقصد جوہری خطرات کی مخالفت کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ یہی سوال واسی لیوا کی کتاب کا اہم ترین سوال ہے اور اسی پر اس نے اپنی کتاب کا اختتام کیا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہیں کہ اردو ادب کے عظیم ایوان میں فیض کے مرتبے یا انکی قدر و قیمت کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں مگر وہ سیاسی یا سماجی قدریں جو فیض کی زندگی میں اولیں اہمیت کی حامل تھیں وقت کی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکیں۔ (میرا ذاتی خیال ہے اس سے واسی لیوا کا مقصد سوئیویٹ یونین کا ٹوٹنا اور روس اور اسکی ذیلی مملکتوں میں کمیونزم کے خاتمے سے ہے۔۔ مترجم) مستقبل کا قاری فیض کی شاعری کو کس طرح پڑھے گا اس اہم سوال کو اس کتاب کے قاری پر چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر وہ فیض کے آخری دور کی شاعری، جو زیادہ تر انکی جلاوطنی کے زمانے میں لکھی گئی ہے، جیسے ''میرے دل میرے مسافر'' اور ''نسخہ ہائے وفا'' کے آخری ابواب جنہیں ''غبارِ ایام'' کا نام دیا گیا ہے کا تجزیہ ضرور کرتی ہیں جو اردو ایڈیشن میں روسی ایڈیشن کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے ہے۔

ان کی نظر میں جلاوطنی کی یہ شاعری، یاد ماضی، چھوٹے وطن چاہت، اور ایک بے نام افسردگی پر مشتمل ہے۔ میرے دل میرے مسافر کا بنیادی مزاج ''غم'' ہے۔ ایک ایسا غم جو ناامیدی، بے بسی اور تشکیک لئے ہے۔ ۱۹۸۳ء کی لکھی نظم ''آج شب کوئی ہے'' اور ''میرے ملنے والے'' ایک درد کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک ایسا درد جہاں طلوع صبح بھی درد کا پیغام لے کر آتی ہے۔

وہ صبح آئے دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے

واسی لیوا کہتی ہیں کہ یہ افسردگی اور یہ عالم ناامیدی سوئیویٹ یونین کے متعلق فیض کے ذہن میں اٹھنے والے شکوک وشبہات کی وجہ سے تھے۔ انہوں نے بریژنیف کے دور میں سختی سے مخالف آوازوں کو دبانے اور سیاسی مخالفین کی جلاوطنی کو دیکھا تھا۔ اسکے علاوہ افغانستان میں روسی مداخلت اور سوئیویٹ یونین کی روزمرہ زندگی میں شدید بدعنوانی اور کرپشن نے بھی انہیں اس کے متعلق شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس چیز نے انہیں اپنی تمام زندگی کے آئیڈیل اور مقصد پر بھی شک کی گرد ڈال دی تھی۔

فیض کی اس دور کی شاعری ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرتی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سوشلزم اور اسکی قدروں کو بہت سنجیدہ لیا تھا اور بڑی حد تک انہوں نے اپنی زندگی کو اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ انکا وطن سے لگاؤ بھی بہت گہرا تھا اور اسی وجہ سے انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی کو ترک کیا اور ۱۹۸۳ء میں واپس پاکستان آگئے۔ اشتراکیت سے ایک حد تک مایوس ہو کر فیض کے تمام تر جذبات واحساسات وطن کی محبت اور اس کے سلسلے میں امید وبیم کی شاعری میں ڈھل گئے جسکی مثال یہ نظم ہے

یہ کون کب آیا، کب گیا ہو
نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

فیض ۱۹۸۴ء میں لاہور میں انتقال کر گئے اور اسطرح وہ اس غم سے محفوظ رہے جو سوئیویٹ یونین، جسے انہوں نے اپنے دل کے بیحد قریب رکھا تھا، کے ٹوٹنے سے انہیں پہنچتا۔ صرف مستقبل کے تاریخ داں فیض کی شاعری کے سیاسی پہلو پر زیادہ معروضی طور پر تبصرہ کر سکیں گے مگر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ نئے حالات کی روشنی میں فیض کی شاعری کو جو بیسویں صدی کی اعلیٰ ترین اردو شاعری تھی ایک نئے انداز سے پرکھا جائیگا۔

دُور کی ایک نادر کرن

پروین شیر
(کینیڈا)

جب گلزار جاوید صاحب نے مجھے یہ مُژدہ سنایا کہ وہ ڈاکٹر لُدمیلا وسیلیوا کا نمبر شائع کر رہے ہیں اور مجھے اس اہم شمارے کے لیے ایک مضمون لکھنے کی دعوت دی تو از حد مسرت اس لیے ہوئی کہ یہ اعزاز ایک بہت معروف وممتاز غیر ملکی اُردو اسکالر کے لئے ہے۔خصوصاً اس لئے بھی کہ لُدمیلا نے اُردو کے محبوب اور میرے سب سے زیادہ پسندیدہ شاعر فیض احمد فیض پر بے حد وقیع کام کیا ہے جو اُردو ادب کے لئے بے بہا ہے۔

میں نے قلم اُٹھا لیا ہے اور یادوں کی شبنم قطرہ قطرہ کاغذ کی زمین پر ٹپک رہی ہے۔گئے وقت کے دریچے وا ہو رہے ہیں.....

وہ اُردو دنیا کے لیے ایک اہم اور یادگار رات تھی۔۲۰۰۵ کی ایک خوبصورت رات.....شہر ٹورانٹو کے ۵ ستارہ ہوٹل کے وسیع ہال میں سیکڑوں دیسی، شاداں چہرے جگمگا رہے تھے۔ریشمی رنگ لہرا رہے تھے۔اُس رات سجاد ظہیر کے صد سالہ جشن اور مشاعرے کا اہتمام اُردو انٹرنیشنل کی جانب سے کیا گیا تھا۔اس جشن میں برصغیر، انگلستان، نارتھ امریکہ اور ساری دنیا سے علماء واُدبا، دانشوروں اور تخلیق کاروں نے شرکت کی تھی جس میں میں بھی مدعو تھی۔جب میں ہال میں داخل ہوئی تو اچانک میری نظر ایک چہرے پر رُک گئی تھی کیونکہ یہ دیسی نہیں تھا۔یہ پُرکشش چہرہ ایک مغربی خاتون کا تھا جو کچھ لوگوں سے باتوں میں مصروف تھیں۔اُردو ادب کے جشن میں کسی مغربی خاتون کا ہونا میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔میں ذرا اور قریب گئی تو میری حیرانی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔کیونکہ یہ خاتون بہترین اُردو میں پوری روانی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔کسی نے ان کا تعارف مجھ سے کیا کہ یہ روس سے آئی ہیں اور مشرقی ادب کے شعبے میں Research Associate ہیں۔اُردو ادبیات میں پی۔ایچ۔ڈی کی ہے۔یہ میری ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا سے پہلی ملاقات تھی جو حیرت، فخر اور خوشیوں کا امتزاج تھی۔اُردو زبان وادب میں ایک روسی خاتون کی اس حد تک دل چسپی اور دسترس حاصل ہونا میرے لیے پہلا اتفاق تھا۔اُردو کا عمدہ تلفظ اور روانی.....یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کوئی غیر اہل زبان ہیں۔اور جب میں نے ان کی تقریر سنی تو بہترین الفاظ کا انتخاب اور عام روایت کی خشک تقاریر سے مختلف، اظہار کے جداگانہ اور دل چسپ انداز نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ثلیث اُردو میں حیران کن روانی کے ساتھ وہ کئی واقعات اپنے بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور فیض احمد فیض کے متعلق سنا رہی تھیں۔مثلاً ایک دل چسپ واقعہ یہ کہ موسکو میں کوئی ادبی فنکشن تھا جس کی صدارت سجاد ظہیر صاحب کو کرنی تھی۔تقریب شروع ہونے سے قبل کسی روسی نے پروگرام کی لسٹ پر ایک نظر ڈالی جس پر سجاد ظہیر صاحب کے نام کے ساتھ ہیڈ (Head) درج تھا۔اُسے انگلش زیادہ نہیں آتی تھی۔ایک کمرے میں کچھ لوگوں کے ساتھ فیض صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔اُس شخص نے آ کر خبر سنائی کہ آج سجاد ظہیر صاحب ڈیڈ (Dead) ہیں۔لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔فیض صاحب پریشان ہو گئے کیونکہ چند ہی گھنٹے قبل وہ اُن کے ساتھ تھے اور وہ بالکل اچھے بھلے تھے۔دوسرا دل چسپ واقعہ لدمیلا نے یہ سنایا کہ سجاد ظہیر صاحب جب تحریک کے سبب Under ground ہو گئے تھے تو کسی نے کہہ دیا تھا کہ وہ زمین کے اندر ہیں اب۔یہ سن کر سجاد ظہیر صاحب نے فرمایا تھا کہ مجھے لوگ کبھی Dead کہتے ہیں کبھی زمین کے اندر۔

لُدمیلا سے میری یہ پہلی ملاقات مختصر اور رسمی تھی۔لیکن انوکھی اور یادگار تھی۔کیونکہ کسی مستشرق سے میں پہلی بار ملی تھی۔ان سے کچھ دیر کی گفتگو نے ان کی خوش خلق شخصیت کا گہرا اثر چھوڑا تھا۔اُردو ادب کے لیے ان کی غیر معمولی خدمات نے از حد متاثر کیا لیکن میرے لیے بے حد خوشی کی بات یوں تھی کہ یہ میرے سب سے زیادہ پسندیدہ اور اُردو کے بے حد مقبول شاعر، فیض احمد فیض سے بہت قریب رہیں اور ان کی زندگی اور تخلیقات کے بھرپور علم سے مالا مال ہیں۔پوری باریک بینی سے فیض کے متعلق ان کا گہرا مطالعہ اُردو قارئین کے لئے بے حد اہم اور گراں قدر ہے۔فیض احمد فیض کی شاعری اور زندگی کے بہت سارے پہلوؤں کو لُدمیلا نے روشن کیا ہے جو ان کے بغیر شاید کبھی اُجاگر نہیں ہو پاتے۔انہوں نے فیض کی شخصیت اور تخلیقات کے سمندر کی سطح پر غوتے نہیں لگائے بلکہ ان کی گہرائیوں میں اُتر کر بہت سارے ایسے موتی برآمد کیے جو کوئی اور نہ کر سکا۔اُن کی چمک سے آنکھیں محروم رہ جاتیں اگر لُدمیلا نے یہ نہ کیا ہوتا۔ان کے کارہائے نمایاں قابل ستائش ہیں۔ان کی فیض فہمی سے اُردو فیض یاب ہوئی ہے۔اُردو ادب میں ان کی یہ تصنیف انمول اضافہ ہے۔

لدمیلا سے میری دوسری ملاقات بے حد اہم موقع پر ہوئی۔یہ وہ یادگار اور خوشیوں سے بھرپور لمحات تھے جب ۳۰ اکتوبر، ۲۰۱۰ میں اُردو مرکز انٹرنیشنل، لاس انجیلس، کیلی فورنیا کے عظیم الاشان بین الاقوامی سالانہ مشاعرہ اور معزز ایوارڈس کی تقریب تھی۔لدمیلا کو اُردو کی غیر معمولی خدمات کے لیے قاضی شفیع محمد، فخر اُردو انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور میری کتاب ''نہال دل پر سحاب جیسے'' کو بہترین شعری تخلیق، احمد ادا یا اُردو انٹرنیشنل ایوارڈ عطا کیا گیا تھا۔دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگ اُردو مرکز انٹرنیشنل کے مہمان

تھےاور تین دنوں تک لدمیلا کا پرلطف ساتھ رہا تھا۔جس اشتیاق اور گرم جوشی سے وہ مجھ سے ملی تھیں وہ آج بھی یاد ہے۔ہم سب نیر آپا (محترمہ نیر جہاں) کے دولت کدے پر ہر رات جمع ہوتے تھے جو خود نہایت نفیس، مشفق، شائستہ، مہمان نواز اور پرخلوص خاتون ہیں۔انہوں نے اور ان کے شریک حیات، جناب ذہانت حسین صاحب نے سب مہمانوں کا جس محبت سے خیال رکھا تھا وہ ناقابل فراموش ہے۔

لدمیلا سے اس دوسری ملاقات نے، ان تین دنوں کے ساتھ نے اور ان کی شگفتہ خاطر شخصیت نے ہمیں ایک دوسرے سے بے تکلف اور قریب کر دیا۔اب جب بھی ان سے فون پر کبھی بات ہوتی ہے تو ان کا بے حد دوستانہ لہجہ، مجھے ''پروین ڈیر'' کہہ کر مخاطب کرنا اور ماسکو آنے کی دعوت دینا، مجھ کو میری ایک پسندیدہ، معروف امریکن ادیبہ، اور شاعرہ، مایا انجیلو Maya (1928) Angelou کی یہ بات یاد دلاتا ہے.....

"I have learned that people will forget what you said, people will forget what you did, but people will never forget how you made them feel"

تو یہ ہے کہ لدمیلا ادبی قد آوری کے ساتھ ذاتی قد آوری بھی رکھتی ہیں۔انکسار.....اُس شاخ کی مانند جو پھولوں سے لدی ہوئی جھک جاتی ہے۔

انھوں نے مجھے اپنی اہم کتاب ''پرورش لوح وقلم۔فیض، حیات و تخلیقات'' عطا کی۔اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی یہ فرماتے ہیں.....'' زیر نظر کتاب میں جس طرح ڈاکٹر لدمیلا نے فیض کی حیات اور تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے، ویسا فیض کے بارے میں کسی اور مطالعے میں میری نظر سے نہیں گزرا''۔''اس میں بہت سی باتیں ایسی آ گئی ہیں جو خود اُردو قارئین کے لیے بھی نئی ہیں''۔''میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غیر اہل زبان میں اس وقت کوئی دوسرا ان جیسا نہیں ہے''۔

یہ کتاب اتنی دل چسپ اور معلوماتی ہے کہ میں نے پڑھنا شروع کیا تو رُک نہیں سکی۔یہ کتاب مجھے ایک عظیم شاعر کی دنیائے دروں تک لے گئی۔خاص کر دوران اسیری اپنی شریک حیات، ایلس کے نام فیض کے خطوط میں جو دل گیری اور بے چینیاں موجود ہیں، جن کے متعلق لدمیلا لکھتی ہیں.....''فیض کے خطوط مختصر نثری شہ پارے ہیں۔خارجی دنیا سے الگ تھلگ، شاعر اس کی دل کشی کے سبھی مظاہر کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔اپنوں کی یادوں سے اسے گہرے فلسفیانہ خیالات کی تحریک ملتی ہے''.....''اکثر فیض صاحب پر مایوسی اور بیزاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔خراب موسم کے دنوں میں ایسی حالت خاص کر شدید ہوتی تھی۔اُداسی کی گھڑیوں میں فیض اپنے کمرے میں چھپ کر اپنے پلنگ پر لیٹ جاتے تھے جو کونے میں دریچے کے سامنے تھا اور ان کی نظر دریچے کے جنگلے کو پار کر کے کالی گھٹاؤں میں ڈوب جاتی تھی.....فیض کے ایک خط میں پڑھتے ہیں:

صبح وشام بہت تیز اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔جب یہ ہوا ہمارے گنے چنے پیڑوں اور بیل بوٹوں میں سے سنسناتی ہوئی گزرتی ہے تو سب پودے اس کی لے پر رقص کرنے لگتے ہیں اور اس رنگ وآہنگ سے نظر کو عجیب عجیب دھوکے ہوتے ہیں.....جیل کے گوشے میں بیٹھے ہوئے نظر کے سامنے یہ منظر اُبھرتے ہیں، ہوا میں لہراتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں اور اُن لمبے وقفوں میں نہ جیل خانہ باقی رہتا ہے نہ جیل کی دیواروں کا وجود۔جہاں تک خطوط کی بات ہے تو ان کے کئی حصے تو درحقیقت نثری نظموں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو فیض کے شاعرانہ شاہکاروں میں شامل کرنے میں شاید ہی کوئی مبالغہ ہوگا''۔(پرورش لوح وقلم۔فیض، حیات اور تخلیقات)۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد بے ساختہ مجھے مشہور امریکن ادیب اور شاعر Herman Melville(1819-1891) کی یہ بات یاد آ گئی کہ **"To produce a mighty book, you must choose a mighty theme"** ۔میں حیرت انگیز خوشی سے دو چار ہوئی اور Envious بھی کہ لدمیلا اس عظیم شاعر سے کتنی قریب رہیں جس کا ثبوت ان کی یہ تحریر ہے...

'' فیض صاحب شاندار سرکاری دعوتوں سے کم شوق رکھتے تھے۔ان کو اپنے قریبی دوستوں کا محدود حلقہ کہیں زیادہ پسند ہوتا تھا۔ماحول نہایت ''گھریلو'' اور ''پُرخلوص'' ہوتا تھا۔ایسی محفلوں میں فیض کی شاعری کے پرستار جمع ہو جاتے تھے۔فیض سے متواتر فرمائشیں کی جاتی تھیں اور وہ اپنا کلام سناتے جاتے تھے۔کبھی وہ تھک بھی جاتے اور ان کی سانسیں چڑھنے لگتیں (پیار پھیپھڑے اپنی یاد دلاتے تھے!) لیکن فیض مہلت نہیں لیتے تھے۔جنوبی رپبلکوں کے مقابلے میں ماسکو میں اُردو اور فارسی جاننے والوں کی تعداد کم تھی۔پھر بھی یہاں بھی فیض کی شاعری کے ان شائقین کی بہتات تھی جو روسی زبان میں ان کا کلام پڑھتے تھے۔نہ جانے کس طرح لیکن اُن لوگوں سے بھی فیض باہمی تعلق رکھتے اور مترجم کے بغیر بھی بات چلا لیتے تھے جن کو اُردو فارسی تو درکنار، انگریزی بھی نہیں آتی تھی۔ایک بار مشہور روسی شاعرہ ریتا کازاکووا نے فیض کے سلسلے میں کہا کہ شعراء کی اپنی مشترک زبان، خاموشی کی زبان ہوتی ہے۔شاید اپنے اس پُراسرار فقرے کی وضاحت کے طور پر انہوں نے فیض کی یاد میں ایک نظم لکھی جس کا عنوان رکھا ''شاعر کی خاموشی''۔۱۹۸۶ میں لندن میں ''فیض میموریل لیکچر'' پڑھتے وقت انہوں نے اس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی سنایا۔اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ کیجیے

پرورشِ لوح وقلم

یاسمین مصطفیٰ

انگریزی سے ترجمہ

محبوب بگٹی (ڈیرہ بگٹی)

اردو زبان کی روسی سکالر ڈاکٹر لدمیلا نے فیض احمد فیض کی زندگی کے نامعلوم اور چھپے ہوئے گوشوں کے متعلق مختلف حقائق اس کتاب کے ذریعے آشکار کیے ہیں۔ آپ اردو زبان میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور اس کے علاوہ فیض صاحب سے ذاتی تعلق بھی تھا جس کی وجہ سے اس کتاب کے ذریعے آپ نے فیض صاحب کی حیات وتخلیقات کے متعلق خوب لکھا ہے۔ یہ کتاب اصل میں روسی زبان میں لکھی گئی جس میں ڈاکٹر لدمیلا نے فیض کو بطور شاعر ایک عام آدمی اور اشتراکیت کا حامی اور ایک دوست کے طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے حقائق کو جمع کیا اور اردو زبان پر اپنی مہارت اور دسترس کا کماحقہٗ استعمال کرتے ہوئے فیض کو بطور شاعر ایک انقلابی اور دوست کے طور پر بیان کرنے کا حق ادا کیا ہے۔ مصنفہ چونکہ شاعری کو خوب سمجھتی ہیں اس لیے انہوں نے فیض کی شاعری پر جو تنقیدی انداز اپنایا ہے وہ اردو پڑھنے والوں اور تنقید کرنے والوں کے لیے حیران کن ہے۔ انہوں نے فیض صاحب کی ابتدائی اور آخری زندگی کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ آپ کا انداز بیان قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ مترجمین نے روسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے کتاب کی اصل روح کو برقرار رکھا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے پر اس کے تسلسل کا گہرا اثر پڑتا ہے۔

کتاب کے دوسرے مترجم اُسامہ فاروقی جو کہ حیدرآباد دکن سے ہیں روسی زبان پر اچھی دسترس رکھتے ہیں اور ترجمے کو اپنے جریدہ ''سب رس'' میں شائع کرنے کا بوجھ بھی انہوں نے اٹھایا۔ بدقسمتی سے جب کتاب کے دسویں باب کو ترجمہ کیا جا رہا تھا تو اُسامہ فاروقی انتقال کر گئے۔ اُس کے بعد ڈاکٹر لدمیلا نے اس نامکمل کام کا بیڑا اٹھایا اور اس سے خوب انصاف کیا۔ فیض صاحب بطور شاعر ہمارے معاشرے میں جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کے حالاتِ زندگی ایک عام آدمی سے پوشیدہ ہی رہے۔ یہ وہ خلا تھی جس کو فیض کے چاہنے والے پورا کرنا چاہ رہے تھے کہ کوئی فیض کو شاعری کے ساتھ ساتھ بطور انسان بھی ان کے سامنے پیش کرے۔ کتاب کے ابتدائی حصہ شاعر کی زندگی کے ابتدائی ایام کا ہے۔ آپ کی پیدائش ایک کھاتے پیتے اور بھرے پُرے میں ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں تمام رشتوں کی سرپرستی کی وجہ سے آپ کی زندگی میں ایک پرسکونیت موجود تھی۔ اس لیے اُن کی ابتدائی نظمیں حیران کن ہیں۔ اُن کی نظم ''رنگ ہے دل کا میرے'' اُن کے حساس جذبوں کی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا نہایت ہی دلچسپی سے فیض کے بچپن، لڑکپن اور بعد کی زندگی کے واقعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ جب فیض اٹھارہ سال کے تھے تو انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا گیا تو اُس وقت کی مایوسی اُن کی شاعری میں کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

فیض اُس وقت بھی امن اور خوشیوں کا معاشرے کے لیے دلدادہ تھا اس حوالے سے مصنفہ اُن کی علامہ اقبال سے قربت کا بھی ذکر کرتی ہیں کہ فیض بطور شاعر اور انسان اقبال سے متاثر تھا۔ اُن کی نظم ''اقبال'' جو کہ ۱۹۳۱ء میں لکھی گئی جس میں فیض بطور شاعر اُس وقت کے لوگوں کے متعلق ہے مصنفہ نے بیان کیا ہے کہ کیسے فیض امرتسر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں اشتراکیت کا سفر اپنی جوانی میں کیا۔ یہ شعر اُن کے اُس وقت کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے:

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض احمد فیض کی نظم ''صبح آزادی'' ایک نوزائیدہ مملکت کی مستقبل کے متعلق کچھ یوں ہے:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جسکا، یہ وہ سحر تو نہیں

ڈاکٹر لدمیلا فیض کی عائلی زندگی اور ایلس کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ کیسے ایک مغربی خاتون نے اپنے شریک حیات اور اُن کے خیالات کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کیا۔ انہوں نے فیض کو بطور شاعر اور انسان اُن کی زندگی میں بہت مدد دی تا کہ فیض صاحب مکمل آزادی اور خوشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں۔ اس کتاب میں فیض کا ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کے ساتھ تعلق کا بھی ذکر ہے کہ ان اخبارات میں فیض صاحب نے حکومتی پالیسیوں کے متعلق خوب تنقید کی ہے۔ راولپنڈی سازش کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ فیض صاحب نے دو کتابیں ''دستِ صبا'' اور ''زندہ نامہ'' لکھی ہیں۔ فیض صاحب کو ۱۹۶۲ء میں ماسکو میں ''لینن امن'' ایوارڈ نوازا گیا جو انہیں اُن کی شاعری اور بطور اشتراکی مفکر کے طور پر دیا گیا۔ اُن کا کلام مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کے روسی جریدوں میں مختصر عرصے میں شائع ہوا جس کی وجہ سے آپ کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ آپ کے کام کو کروڑوں روسیوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ فیض صاحب کے ماسکو سے تعلق اُن کی نظم ''لینن گریہ کا قبرستان''

سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں فیض صاحب کو لکھنے پر مائل کرنے کے حالات و واقعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحے اور شاعری پر اس کے اثرات کا بھی خوب احاطہ کیا گیا ہے جیسا کہ:

ہم کیا کرتے کس راہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
ان رشتوں کے جو چھوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اک اک کر کے ٹوٹ گئے

ڈاکٹر لدمیلا نے فیض کی زندگی کے مشکل ترین دور کا بھی احاطہ کیا جس میں فیض کو ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء میں پاکستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ملک چھوڑنے کے سوا کوئی دوسرا اختیار نہ تھا۔ فیض نے خود اختیاری ملک بدری کے سلسلے میں پہلے ہندوستان اور اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں ماسکو اور آخر کار بیروت میں افرو ایشین رائٹر ایسوسی ایشن کے جریدہ ''لوٹس'' میں بطور مدیر کام شروع کیا۔ مصنفہ نے فیض صاحب کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، امن و آتشی کے خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود مختلف قومیت، ثقافت اور مذاہب کے لوگوں کے درمیان امن و محبت اور ہم آہنگی کی کوشش میں سرگرداں دکھایا ہے اور یہ اُس کی ذاتی کاوشیں تھیں جس کی وجہ سے اردو سوویت یونین میں متعارف ہوئی اور مشہور بھی ہوئی۔

یہ کتاب فیض صاحب کے ادبی مقام کے متعلق بلکہ اُس سے زیادہ ایک عقیدت مندانہ کاوش ہے اور یہ فیض کے متعلق بے حد اہم گراں قدر اور مستید کام ہے اور فیض کے متعلق کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک ضرورت اور بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

بقیہ

۔ شبھ چنتک ۔

کارڈ پر لکھی عبارت کو دہراتے ہوئے ایس۔ ایس۔ پی پولیس نے کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا اور احترام سے کُرسی پیش کرتے ہوئے بولا.....!

''سر.....! آپ نے کیوں کشٹ کیا.....؟ آپ آدیش کرتے' میں خود چل کر آپ کی سیوا میں اُپس تھت ہو جاتا.....!''

''سُنا ہے.....! تم نے کسی اُگروادی کو گرفتار کیا ہے.....؟''

''جی سر.....! ٹھیک سُنا ہے آپ نے..... بہت خطرناک آدمی ہے سر..... سٹی کے ویزے پر کینٹ میں گھوم پھر رہا تھا.....!''

''صرف یہی جرم ہے اُس کا.....؟''

''نہیں سر.....! پوچھ تاچھ کے دوران پتا چلا ہے' وہ پاکستان کا ریٹائرڈ' سرکاری ملازم ہے..... پاسپورٹ میں' جعل سازی کر کے بزنس مین لکھوالیا ہے' سر.....! میرا خیال ہے وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہے ہمارے دیش میں.....؟''

''فضول باتیں مت کرو..... یہ کاغذات لو اور اُسے جلد رہا کرو.....!''

''سر آپ.....؟ ایک اُگروادی کی ضمانت دے رہے ہیں..... وہ بھی پاکستانی.....!''

''کاش.....! تمہاری باہر کی آنکھ کے علاوہ اندر کی آنکھ بھی کھلی ہوتی..... بے وقوف انسان.....! اُگروادی وہ نہیں..... اُگروادی تمہارے سامنے کھڑا ہے..... جو پینسٹھ سال کا ہندو ناگرگ ہونے اور چالیس سال تک ہندوستانی پولیس کی نوکری کرنے کے بعد بھی..... پاکستان کا درد' سینے میں پالے ہوئے ہے..... ہندوستان پولیس کا یہ ریٹائرڈ آئی جی' آج اگر زندہ ہے تو صرف پاکستان کی دھرتی..... راولپنڈی کی مٹی کو چومنے کی آس میں..... جہاں اِس کا جنم ہوا تھا..... جسے یہ اپنا کعبہ اور مدینہ سمجھتا ہے..... لو.....! اگر فرار کرو اِس اُگروادی کو..... اگر تم اِس اُگروادی کو گرفتار نہیں کر سکتے تو تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم ایک مجبور بے بس شخص کو اِس بنا پر گرفتار کرو کہ اُس نے اپنے کعبۂ ثانی کی زیارت کے لئے' ایک معصوم سا جھوٹ بولا ہے..... کم عقل انسان.....! وہ اُگروادی نہیں..... وہ تو شُبھ چنتک ہے..... تیرا بھی..... میرا بھی..... اور اس دھرتی کا بھی.....!

☆

دوسرے دن کے اخبارات نے' ایک خبر کو دو حصوں میں بانٹ کر چھاپا..... ایک اُگروادی جس کا سمبندھ پاکستان سے تھا..... پولیس کسٹڈی میں مُردہ پایا گیا.....

اُتر پردیش پولیس کے پُروآئی' جی پولیس بنواری لال چوہان کا میرٹھ شہر کی کوتوالی میں دل کا دورہ پڑنے سے دیہانت ہو گیا.....!

روس میں اردو

ڈاکٹر لُدمیلا وسیلیئوا

روس کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں اردو صرف ایک غیر ملکی زباں کی حیثیت سے موجود ہے۔ زیادہ تر مغربی ممالک کے برعکس روس میں کوئی برادری یا کوئی حلقہ نہیں ہے جس کے لیے اردو مادری زباں ہو اور جس نے اپنی زباں اور تہذیب کی بقا اور ارتقا کی خاطر کوئی کاوشوں میں سرگرداں ہو۔

لیکن اس کے باوجود کہ روس میں اردو نہیں بولی جاتی ہے آج روس کو اردو زبان و ادب کی دنیا کی ایک اہم بستی کہا جاتا ہے۔ یہاں وسیع پیمانے پر اردو کی تعلیم و تدریس، تحقیق و مطالعے اور ترجمے کا کام ہوتا ہے۔ برِصغیر کے باہر اردو کے فروغ و تبلیغ کے صلے میں دوہا میں انڈو قطر اردو مرکز کا قائم کردہ پہلا عالمی اعزاز سن ۱۹۹۴ء میں روس کو ہی ملا جو اردو پر کام کے معیار اور مقدار کے لحاظ سے دوسرے ممالک کے مقابلے میں پیش پیش ثابت ہوا۔

آج روس میں ماسکو میں ریاستی یونیورسٹی میں اور بین الاقوامی تعلقات کی انسٹی ٹیوٹ میں اور سانکت پیترس برگ (سابق لینن گراد) کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیمی سطح پر اردو کی تدریس کی جاتی ہے۔ تحقیق و مطالعے کا مرکزی ادارہ ماسکو کی سائنسی اکادمی کی علم شرقیات کی انسٹی ٹیوٹ ہے اور سانکت۔ پیٹرس بورگ کا اس کا شعبہ بھی۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سنجیدہ مقابلے میں کامیاب ہونے والے طالب علم داخلہ لے کر اے ایم کے بعد ایم فل، پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ تک کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ علم شرقیات کی انسٹی ٹیوٹ میں جو تحقیقاتی ادارہ ہے صرف پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

روس میں اردو زبان کو سب سے پہلے برِصغیر ہند کے ایک منفرد ادب و ثقافت کا ترجمان سمجھتے ہیں اور بعد میں اسے دین سے وابستہ کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام کی تاریخ اور علم اسلامیت کی اساس اردو کے طالب علموں کے نصابی پروگرام میں لازمی مضامین کی حیثیت سے شامل ہیں۔

روس اس لحاظ سے بھی دوسرے مغربی ملکوں سے مختلف ہے کہ یہاں اردو، اہلِ زبان مہاجرین کے ساتھ نہیں آئی بلکہ تعلیم و مطالعے کے ایک موضوع کی حیثیت سے متعارف ہوئی۔ روس میں اردو کی تعلیم کا آغاز کوئی ۱۰۰ سال قبل ہوا تھا۔ ۲۰ویں صدی کے اوائل میں روسی زارشاہی حکومت کے بعض فوجی اور سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر زارشاہی روس کے ایک وسیع و عریض جنوبی علاقہ ترکستان کے مرکزی شہر تاشقند میں جو بعد میں سوویت ریپبلک ازبکستان کا دارالحکومت بنا تھا اور اب خود مختار ملک ازبکستان ہے مشرقی ممالک میں بولی جانے والی زبانوں کا سکول قائم ہوا تھا۔ اس میں عربی اور فارسی کے علاوہ اردو بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس سکول میں روسی فوجی افسر زیرِ تعلیم تھے۔ ان کے لیے تیار کردہ اردو کے قواعد کی کتابیں روسی زبان میں اردو کی پہلی پہلی نصابی کتابیں تھیں۔ ان میں اردو کی نظم و نثر کے نمونے اور ان کے روسی ترجمے بھی شامل تھے۔ یہ کلاسکی اردو شعرا کے کچھ اشعار تھے اور داستانوں اور پریوں کے قصّوں کے اقتباسات۔ اسی زمانے میں ایک ہی جلد میں روسی اردو اور اردو روسی پہلا لغت بھی شائع ہوا تھا۔

روس میں اردو تعلیم کا یہ سلسلہ سن ۱۹۱۷ء کے اکتوبر انقلاب برپا ہونے اور ملک میں خانہ جنگی شروع ہونے کی وجہ سے منقطع ہوا تھا۔ انقلابی جوش و خروش میں بہت ساری قدروں کا نیست و نابود ہوا تھا اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لی۔ لیکن اردو کے پہلے پہلے روسی طالب علموں کی محنت رائیگاں نہیں ہوئی۔ سن ۱۹۲۱ء میں اشتراکی روس کے سربراہ لینن کے فرمان پر پیتروگراد (لینن گراد) اور ماسکو میں بھی ''بولی جانے والی مشرقی زبانوں کی انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے دو اعلیٰ تعلیمی ادارے کھلے جن میں چینی، عربی، فارسی اور اردو پڑھائی جانے لگی۔ نصابی سامان مرتب کرنے میں مذکورہ بالا پہلی روسی نصابی کتابیں اور لغت بہت مددگار ثابت ہوئے.

دراصل اسی وقت روس میں اردو تعلیم و تدریس کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس عمل سے اکاڈیمشن Alexey P. Barannikov (۱۸۰۰..۱۹۵۲) کا نام منسوب ہے جو روس میں اردو شناسی کے بانی اور اردو زبان اور عصری ادب کے مطالعے کے الم بردار مانے جاتے ہیں۔ موصوف جو سنسکرت کے معروف سکولر بھی تھے روس میں ہی رہ کر اردو سیکھی اور بعد ازاں اپنی ساری زندگی کو اردو زبان و ادب کی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی لکھی ہوئی نصابی کتابیں اور ان کے ترتیب کیے گیے لغات ۲۰ویں صدی کے چھٹے عشرے تک اردو کے روسی طالب علم استعمال کرتے رہے تھے۔ عصری ادب کے موصوف کے ترجموں سے اردو سے روسی میں ترجمے کے کام کی مسلسل روایت بھی چلی آرہی ہے۔

روس میں اردو کی تعلیم و مطالعے کی رفتار ہموار نہیں ہوتی ہے۔ وہ کبھی تیز رہتی ہے اور کبھی دھیمی پڑ جاتی ہے جو عام طور پر ملک کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ برِصغیر میں آزادی کا دور شروع ہونے کے بعد سے روس میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ سوویت لوگوں کی طرف سے ہندوستان اور پاکستان کے عوام کی زندگی سے دلچسپی جو روس کے قدیم زمانوں سے موجود رہی نئے زور سے بڑھی۔ اب روس میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس اور تحقیق و مطالعے کے لیے زیادہ خوش گوار حالات پیدا ہوئے تھے جس کے نتیجے میں اردو سے متعلق دونوں بنیادی شعبوں میں یعنی تعلیمی اور تحقیقاتی میدانوں میں کام کا پیمانہ بہت

بڑھ گیا اور اس کی سطح بھی اٹھی۔

اردو پر کام کی مقدار اور معیار کے لحاظ سے ۲۰ ویں صدی کے چھٹے عشرے سے لے کر آٹھویں عشرے کے وسط تک کا دور روس میں اردو کے فروغ کا سب سے روشن دور تھا۔اس دوران مزکورہ بالا تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل بڑے مستعدی سے اردو کی خدمت میں لگ گئے۔ نئے روسی اردو اور اردو روسی لغات مرتّب ہوئے، اردو گرامر پر کئی ساری کتابیں لکھی گئیں اور بے شمار ترجمے ہوئے۔اردو ادب پر خاص طور پر قابلِ ستائش پیمانے اور معیار کا کام ہوا۔

یاد رہے کہ ۲۰ ویں صدی کے پانچویں چھٹے عشروں میں روس کا نام نہاد لوہے کا پردہ پوری طرح ہٹا نہیں تھا۔غیر مما لک سے روس کے باشندوں کے تعلقات بہت محدود تھے۔اردو وغیرہ سے متعلق زیادہ تر معلومات کتابی نوعیت کی ہوتی تھیں۔لیکن اس کے باوجود روسی اساتذہ اور طالب علم جاں فشانی سے اردو شناسی کی دشوار گزار راہ پر قدم بڑھاتے گئے۔اب عہدِ حاضر کی نسل کے روسی اردو دانوں کے زیادہ تر اساتذہ اس دنیا میں نہیں رہے۔لیکن ان کے نام سابق شاگرد نہیں بھولتے ہیں۔ یہ تھے لینن گراد کے اور ماسکو کے ماہرینِ لسانیت پروفیسر Dr. O.D ،Dr. A.A Axyonov, G. A. Zograf Dr. V. A. ،Dr. N.I. Solntseva ،Zhmotova S.A. ،Chernishov , Dr. B.I. Klyuev, V.S. Meresh Dr. Chernikova اور دوسرے۔ان سب کے نام ہماری اردو کی نصابی کتابوں اور لغتوں کی سرورقوں پر تحریر ہیں۔

آج کل اردو کی تعلیم کے میدان میں بعض بزرگ اساتذا کے ساتھ ساتھ کل کے ان کے شاگرد اردو پڑھانے آئے ہیں۔مثلاً ماسکو یونیورسٹی میں Dr. Galina M. Dashenko اور ان کی ثابق شاگرد Marina Mikhailova اور Ekaterina Akimushkina پڑھاتی ہیں اور بین الاقوامی تعلقات کے انسٹی ٹیوٹ میں Dr. A.A. Davidova کے ساتھ جوان استانی Natalya Milyohina شعبہ اردو میں کام کرتی ہیں۔

روس میں اردو ادب کا شعبہ ایک الگ موضوع ہے۔یہاں نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۰ صدی کے آخری دہائیوں میں روسی ماہرینِ ادبیات روسی اردو شناس Prof. Alexey S. Sukhochov (مرحوم)، Prof. A.A Suvorova ،N.V. Dr. Ludmila ،Prof. Natalia Prigarina ،Glebov Vassilyeva جیسے ماہرین ادبیات کی اردو ادب پر تخلیقات اور ان کے ہی اردو شعر و ادب کے روسی زبان میں ترجموں کی بدولت روس میں اردو ادب سے عام لوگوں کی آشنائی ہوئی اور اس سے ان کی دلچسپی بھی بڑھی۔

دوسری طرف، روسی سکولروں کو، اردو کی ان کی خدمات کو عالمی سطح پر تسلیم بھی کیا۔

روس میں سارا کام منصوبہ بند اس لحاظ سے ہے کہ اردو ادب کے مطالعے کے مختلف ادوار میں روسی سکولروں کے سامنے جدا جدا مقاصد رکھے جاتے ہیں۔شروع شروع میں یہ مجموعی نوعیت کے کام ہوتے تھے۔لیکن پھر ماسکو اور لینن گراد میں علم شرقیات کی انسٹیٹوں میں برِّصغیر کی زبانوں کے ادب کے شعبوں کے قیام کے بعد کام کی نوعیت بدل گئی۔اب الگ الگ اردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیق، اس کے مختلف پہلو اور پھر اردو ادب کے خصوصی مسائل مطالعے کے موضوع بننے لگے۔ اس دور کے روحِ رواں بیشک Prof. Alexey S. Sukhochov تھے جو نہ صرف مشہور اردو سکولر بلکہ باجوہر ماہر ادبیات، مصنف اور مترجم بھی تھے۔درحقیقت پچھلی صدی کے چھٹے عشرے سے لے کر زندگی کے آخری دم تک وہی روسی اردو شناسوں کا سربراہ اور استاد تھے۔ان کا دائرہ مطالعہ بہت وسیع تھا۔انہوں نے کئی ساری تصانیف لکھی ہیں جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔،، کرشن چندر،، اور،، مخدوم محی الدین،، کتابوں کے علاوہ،، داستاں سے ناول تک،، عنوان سے ان کی ایک خصوصی کتاب ہے۔اس میں سر سید احمد خان کے کردار اور ان کی سرگرمیوں کو روس میں بالکل نیے زاویے سے دیکھا گیا، ان کے کارناموں اور کاموں کے مثبت پہلوؤں پر خاص زور دیا گیا جبکہ اس سے پہلے سوویت کتابوں میں سرسید کو صرف منفی روشنی میں دیکھا جاتا تھا اور ان کی برطانوی حکام سے مصالحت کو ہی ابھار کر ان پر تنقید کی جاتی تھی۔ سرسید احمد خان کا کردار Prof.Sukhochov کی توجہ کو ہمیشہ مبذول کرتا تھا۔ان کا آخری کام بھی سرسید سے اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کے پسندیدہ، روشن خیالی کے دور سے وابستہ تھا۔حالی کی کتاب حیاتِ جاوید کا ترجمہ مکمل کرتے ہی موصوف ۲۷ فروری سن ۲۰۰۰ کو ناگاہ اپنی زندگی کی راہ بھی طے کر چکے۔مستقبل قریب میں ان کی کوئی تلافی نظر نہیں آتی ہے۔۔۔

پروفیسر مرحوم کے کئی سابق شاگرد اب خود معروف سکولر بن گیے ہیں۔ Prof. Anna A. Suvorova کا نام سرفہرست ہے۔ان کی متعدد کتابیں اردو ادب کے مطالعے میں بیش قیمت دین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ موصوفہ نے داستانوں اور اردو ڈرامے پر، مثنوی اور لکھنؤ کی تہذیب پر کام کیا۔ جنوبی ایشیا کے اولیا پر ان کی کتاب اب انگریزی میں بھی ترجمہ کی جارہی ہے۔

راقم السطور بھی Prof. Sukhochov کی شاگرد تھی۔حالی اور فیض پر کتابیں اور اردو شعر و شاعری کے مختلف مسائل پر موصوفہ کی تصانیف اور اردو سے روسی میں نظم و نثر کے تراجم بھی روسی قارین کو منفرد اردو ادب و شاعری کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

روس کی مشہور اقبال شناس اور غالب شناس Prof. Natalia Prigarina کا نام بھی غیر مما لک میں پہچانا جاتا ہے۔علاّمہ اقبال پر ان کی تصانیف کو خود فیض احمد فیض نے سراہا تھا۔''مرزا غالب'' موصوفہ کی کتاب کے اردو اور انگریزی زبانوں میں ترجمے متعدد قارین اور ناقدین کی دلچسپی اور غور و

خوص کا باعث بنی۔

آج کل ملک کی معاشی اور سماجی بدحالی کے حالات میں اردو کے میدان میں سرگرمیاں کافی دھیمی پڑ گئی ہیں۔اس کی کئی ساری وجوہ ہیں۔غالباً سب سے بڑی اور بری بات یہ ہے کہ سوویت یونین کی شکست کے نتیجے میں وہ زیادہ تر ادارے بند ہو گئے ہیں جہاں اردو جاننے والوں کی ضرورت رہتی تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی ختم کرنے کے بعد جہاں ماہرین اشاعت گھروں میں مترجم اور مدیر کی حیثیت سے کام کر سکتے تھے جہاں اردو سے اور اردو میں ترجمے اور اشاعت کا کام زور شور سے ہوتا تھا۔ چند مثالوں سے اس کام کے پیمانے اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۹ میں غالب کی غزلوں کا انتخاب ۲۵۰۰۰ ہزار کاپیوں کی تعداد میں نکلا۔ ۱۹۸۱ میں علامہ اقبال کی نظموں کی کتاب کی اشاعت ۱۰۰۰۰ ہزار کاپیاں تھیں، ۱۹۷۷ اور ۱۹۸۵ میں فیض کے مجموعوں کی دس دس ہزار، ۱۹۸۳ میں رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب،، کی ۱۵۰۰۰ ہزار، قرۃ العین حیدر کے ناول،، آخرِ شب کے ہم سفر،، کی ۳۰۰۰۰ ہزار کاپیاں۔۔۔ یہ فہرست بہت طویل ہے۔ واضح رہے کہ اتنے بڑے کام کے لیے کتنے ہی ماہرین کی مانگ ہوتی تھی۔ اب یہ دونوں اشاعت گھر بند ہو گئے ہیں۔ یہ ہی رسالہ ''سوویت یونین'' کے ساتھ ہوا جو اردو میں بھی نکلتا تھا۔ کام کی ایک اور جگہ ماسکو ریڈیو کی اردو سروس تھی۔ سوویت زمانے میں ماسکو ریڈیو سے روز آدھے آدھے گھنٹے کے چھ پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ اب صرف دو نشریئے رہ گیے ہیں۔

اب اردو جاننے والے جوان ماہرین کی ضرورت عملی طور پر صرف تعلیمی اداروں میں ہی رہ گئی ہے۔ واضح رہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کا عملہ اکثر بدلتا نہیں۔ دوسری طرف، خود نوجوان تعلیمی کام سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ آج کے روس میں میڈیکل ڈاکٹروں کی طرح اساتذہ کی بھی سب سے حقیر تنخواہیں مقرر ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ سوویت دور میں مشرقی زبانوں کے ماہرین کی تنخواہیں خاص طور سے بڑی ہوتی تھی اور مستشرق سکولروں کا سماجی رتبہ بھی بہت بلند تھا۔ یہ سب اردو سمیت مشرقی زبانوں کی تعلیم نوجوان لوگوں کے لئے باعثِ کشش تھا۔

لیکن روسی اردو شناس امید بھری نظروں سے مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں۔ آج اردو سے متعلق میدانِ عمل میں صرف وہی شوقین قدم رکھتے ہیں جن کو اردو اور مشرقی تہذیب اور ثقافت عزیز ہے۔ ان کا شوق و ولولہ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ آج ہمیں E. ،E. Badikova, Akimushkina,M.Rusanov, ، M. Guseinova جیسے با استعداد اور قابل نوجوان روسی اردو دانوں سے ڈھارس بندھی ہوئی ہے۔ روس کی اردو شناسی اپنی نئی بہار کے انتظار میں ہے۔

روس میں بعض وجوہ سے اردو زبان کے اساتذہ روسی ہی ہوتے ہیں جن کے لیے اُردو ایک سیکھی ہوئی زبان ہے۔ اُردو تہذیب کیا چیز ہے اس کا علم بنیادی طور پر یونیورسٹی میں انہیں اساتذہ سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس موضوع پر روسی کتابوں سے بھی۔ شعر فہمی غیر زبان لوگوں کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ شاعری احساسات کی دنیا سے وابستہ ہے۔ ہر زبان میں شعر سب سے پہلے دل سے ہی اپیل کرتا ہے اور دل میں اُتر جاتا ہے۔ بعد میں دماغی طور پر شعر کی قدر دانی کی جاتی ہے۔ یعنی اہلِ اُردو لوگوں کے لیے شعر کی راہ دل سے دماغ کی طرف ہوتی ہے جبکہ غیر زبان کے لیے اردو شعر کی راہ اُلٹی، یعنی دماغ سے دل کی طرف ہوتی ہے۔ اردو شعر ٹھیک سے سمجھنے سے پہلے ہم اسے دل میں اُتار نہیں سکتے ہیں۔

☆

- بقیہ -

دُور کی ایک نادر کرن

O Faiz
you were a trumpet to my heart
whose silent calls were clearly, clearly heard!
Although a poor diciple of your art,
I do recall how fine it always felt
to talk to you without saying a word.....
O noisy speeches, dull and long-they roar,
how furiously the speakers fan the wind...
Not so with you, o Faiz!-you were akin to all of us. Even to utter a word there was no need: your silence meant much much more.

لدمیلا کی یہ کتاب اُردو ادب کے لیے ایک سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے زورِ قلم سے کتنے چراغ جلائے ہیں جن کی روشنی ہمیشہ قائم رہے گی۔ غالب کے منتخب کلام، ن۔م راشد، اقبال، قرۃ العین حیدر، ابوالکلام آزاد، مجاز، علی سردار جعفری، فراق گورکھ پوری اور دیگر کی تخلیقات کو روسی زبان میں منتقل کیا ہے۔ میری دعا ہے.....دُور کی یہ نادر کرن ہمیشہ ضیا خیز رہے۔

☆

ہمالہ پر ایک نظر

ڈاکٹر لُدمیلا وسیلیوا

علاّمہ اقبال پر تحریر کردہ مواد کو تحقیقی ادب کے ایک خاص شعبے کی حیثیت حاصل ہے جس کا نام ہے اقبالیات۔ برِصغیر کے علاوہ جہاں زیادہ تر تحریریں اردو میں لکھی گئی ہیں دنیا کے مختلف ممالک میں متعدد محقق اپنی اپنی زبان میں محمد اقبال کی شخصیت اور تخلیقات، ان کے فلسفے اور مذہبی نظریات وغیرہ پر مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں اور اس طرح عالمی پیمانے پر اقبالیات کی وسعت بڑھا دیتے ہیں۔ روس میں بھی علاّمہ اقبال پر کافی بڑا کام ہوا ہے۔ اقبال کا فلسفہ یہاں کے کئی عالموں کی توجہ کا مرکز بنا اور روس کی مشہور اقبال شناس پروفیسر نتالیا پریگارینا نے محمد اقبال کی شاعری پر کتابیں اور کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان کی نگرانی میں ۱۹۸۲ء میں اقبال پر مضامین کا ایک مجموعہ تالیف کیا گیا جسے روس میں اقبال شناسی کی ایک مزید کامیابی قرار دیا گیا تھا۔ اقبال کے کلام کا ترجمہ بھی روسی زبان میں کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ روس میں بھی اقبال شناسی کا اپنا شعبہ ہے، اقبال کے مطالعے کی اپنی روایات ہیں۔ جہاں تک کلامِ اقبال سے دلچسپی کی بات ہے تو وہ بھی کم نہیں۔ مشرقی شاعری کے دلدادہ روسی قارئین اقبال کو جانتے اور ان کی بڑی قدردانی کرتے ہیں اور اردو اور فارسی جاننے والے تو ترجمے کے بغیر اقبال کا کلام پڑھتے ہیں۔ میں بھی اکثر اقبال کی نظموں اور غزلوں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔

کچھ روز ہوئے بانگِ درا اُٹھا کر کھولا تو نظر اس کی پہلی ہی نظم ہمالہ پر ٹھہر گئی۔ دراصل یہ نظم میں نے برسوں پہلے پڑھی تھی اور اس کے بعد اس پر خصوصی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب کی بار میں نے اسے ایک الگ زاویہ سے پڑھی اور وہ مجھے بعض لحاظ سے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ اپنے چند خیالات قلم بند کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی ہمّت کر رہی ہوں۔ میرے اس مضمون کی حیثیت ایک غیر زبان طالبہ کے، نظم ہمالہ پڑھنے کے ایک تجربہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر اسے پڑھکر اہلِ زبان قارئین خود محسوس کریں گے کہ روس میں بھی شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال کو کس قدر مانتے ہیں اور ان کی شاعری میں کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔

شاید سب سے پہلے یہ یاد دلانا بے جا نہ ہوگا کہ نظم ہمالہ ,,مخزن،، کے مدیر شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالے کی پہلی جلد کے پہلے شمارے میں شائع کی جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا تھا۔ نظم کے بارے میں مدیر نے لکھا تھا: ,,شیخ محمد اقبال نے ادبی مجلس کے ایک جلسے میں اپنی وہ نظم جس میں کوہِ ہمالہ سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی جاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاقِ زمانہ اور ضرورتِ وقت کے مواقف ہونے کے سبب بہت مقبول ہوگئی۔،،

یہ سو سال سے زیادہ پرانی بات ہے جب نظم ہمالہ مذاقِ زمانہ اور ضرورتِ وقت کے مواقف قرار دی گئی تھی۔ ایک صدی گذر جانے پر مذاقِ زمانہ بھی بدل گئے اور وقت کی ضروریات بھی نئی ہوگئی ہیں۔ آج شاید ہی کوئی یہ نظم پڑھتے وقت ,,انگریزی خیالات،، پر اپنی توجہ مبذول کریگا۔ ایک زمانہ ہوا ہے جب سے اردو نے فارسی بندشیں اپنائی ہیں اور اب وہ اردو کی ہی بندشیں مانی جاتی ہیں۔ جہاں تک خود نظم کی بات ہے تو آج بھی غالباً کوئی اہلِ ذوق نہیں ملیگا جو اس نظم کے حسن سے بے نیاز رہے اور اس کی جادو بھری صوتی کیفیت سے متاثر نہ ہو۔

اے ہمالہ ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

ہمارے یہاں اردو ادب پر لیکچروں میں طالب علموں کو عام طور پر نظم کا یہ پہلا بند سنا کر بتایا جاتا ہے کہ ہمالہ، علاّمہ اقبال کی ابتدائی دور کی ایک نظم ہے جو حبّ الوطنی کے جذبات سے لبریز ہے اور جو اردو شاعری میں منظر نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے وغیرہ۔ لیکن میرے خیال میں مختصر تاریخِ اردو ادب کے کورس میں بھی اس پوری نظم کو شامل کرنا بہت مفید ثابت ہوگا۔ اقبال کی یہ ابتدائی نظم ان کی شاعرانہ عظمت کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس میں زبان اور موسیقی کی ہم آہنگی نمایاں ہے جو کلامِ اقبال کی ایک خصوصیت ہے، اس میں ان کے لفظیاتی نظم کے کئی سارے عناصر موجود ہیں جو ان کی آگے کی شاعری سے پیوستہ ہیں اور بہت سے الفاظ اگلے یعنی بعد میں آنے والے الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ بات معلوم ہی ہے کہ اقبال کے اپنے پسندیدہ صنائع و بدائع ہیں جن کے دائرے سے وہ عام طور پر نکلتے نہیں۔ ان کے یہاں مختلف ادوار کی نظموں اور غزلوں میں تشبیہوں، استعاروں، علامتوں یعنی صنائع لفظی کی تکرار ہے اگرچہ تکرار میں انکا معنویت زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے، شاعر کے ذہنی اور فنی ارتقا کے مطابق بدل بھی جاتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اقبال کے لفظیاتی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اقبال اپنے تمام موضوعات کو اشارتاً یا صراحتاً بانگِ درا میں بیان کر چکے ہیں۔ اگر نظم ہمالہ کو غور سے دیکھا جائے تو بانگِ درا کی اِس ایک ہی نظم میں کئی سارے موضوعات اور کلیدی الفاظ نظر آئیں گے جو بعد میں مختلف اشعار میں ملا کریں گے۔ اسی لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ نظم ہمالہ میں اقبال کی اگلی شاعری کی متعدد جڑیں پنہا ہیں، اس میں وہ زیادہ تر صوری اور معنوی خوبیوں کے نقوش ملتے ہیں

جو اقبال کے رنگ کی پہچان کی طرح تسلیم کی گئی ہے۔ اب میں اس بات کی وضاحت چند مثالوں سے پیش کرنا چاہوں گی۔

پہلے ہی بند سے لیکر نظم میں اقبال کا خصوصی رنگ نمایاں طور پر اُبھرتا ہے اور ان کے پسندیدہ الفاظ و تراکیب نظر آتے ہیں۔ لفظی ترکیب ,,دیرینہ روزی کے نشان،، اور اس کی ہم معنیٰ صورتیں اقبال کے کلام میں اکثر ملیں گی، وہ بانگ درا سے بہت آگے چل کر سن ۱۹۳۵ء کے مجموعے بالِ جبریل میں بھی نظر آئیں گی۔ مثلاً مسجدِ قرطبہ میں ,,دیرینہ روزی کے نشان،، ,,نقشِ کہن،، بن کر پیش آتے ہیں:

نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخیر فنا!

اسی مسجدِ قرطبہ میں ہمالہ کے ,,گردشِ شام و سحر،، کی گونج واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات!

بے شک دونوں نظموں کا سیاق و سباق قطعی مختلف ہے۔ ہمالہ میں سب صنائع و بدائع بیانیہ حیثیت رکھتے ہیں جب کہ مسجدِ قرطبہ میں وہ فلسفیانہ مفہوم کے حامل ہیں۔ لیکن اقبال کے نظریۂ وقت کا سرچشمہ نظم ہمالہ کے ,,گردشِ شام و سحر،، میں ہی پایا جاتا ہے۔

اقبال کے شعریاتی نظام کا ایک اور اہم عُنصر نظم ہمالہ کے پہلے بند میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ ہے علاّمہ اقبال کی فلسفیانہ شاعری کا ایک اہم کردار حضرت کلیمُ اللّہ۔ اقبال کے لئے اس کردار کی خصوصی اہمیت ایک جدا مطالعے کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ کلیم کا نام اشعار سے لیکر (,,نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا۔۔۔،، ,,خالی ہے کلیموں سے کوہ و کمر ورنہ۔۔۔،، وغیرہ وغیرہ) مجموعے کے عُنوان تک میں (,,ضربِ کلیم،،) آتا ہے۔ اس کردار سے ایک سلسلہ لفظی وابستہ ہے جس میں طورِ سینا کے علاوہ جلوہ اور تجلّی جیسے اقبال کے لفظیاتی نظام کے کلیدی الفاظ شامل ہیں۔ معنویتی سطح پر وہ خدا اور خداوندی، خدا اور انسان کے تعلقات، انسان اور عمل وغیرہ جیسے موضوعات سے منسلک ہیں جو مستقل طور پر اقبال کی توجہ کے مرکز میں رہتے ہیں۔

دوسرے بند میں کوہِ ہمالہ کی تعریف کے طور پر مختلف استعارے استعمال ہوئے۔ دوسرے شعر کا اوّل مصرع جس میں ہمالہ کی اُونچائی کی تعریف کی گئی ہے مجھے خاص طور پر اہم معلوم ہوتا ہے:

مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیوان ہے تُو

بظاہر یہاں ایک رسمی طریقے سے کام لے کر شاعر نے کوہ کی بلندی اور اس کی عظمت کا اندازہ دینے کے لئے ہمالہ کو دیوان اور آسماں کو اس کا مطلع بتایا۔ لیکن اس مصرعے کے دو الفاظ دیوان اور مطلع کی بدولت اس استعارے کے مفہوم میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کوہِ ہمالہ کی، ایک طرف سے پورے کائنات سے اور دوسری طرف خود کلامِ اقبال سے وابستگی کا تصوّر قائم کیا گیا ہے۔ پہلے لفظ دیوان پر توجہ دیں۔ اسلامی روایت میں دیوان کا ایک تصوّر ,,الکتاب،، ہے۔ قرانِ مجید کا خالق اور ہمالہ کا بھی (جو دیوان کہا گیا ہے) ایک ہی ہے یعنی خدا۔ جس طرح الکتاب میں اوّل سے آخر تک سب کچھ سمویا ہوا ہے اسی طرح ہمالہ میں قدرت کے سارے عناصر جمع ہوئے ہیں۔ پھر الفاظ خدا، خالق، کوہ ناگزیر طور پر اقبال کے فلسفے کے ان بنیادی موضوعات پر لے آئیں گے جن کے مراکز ہیں خدا اور انسان، انسان اور کائنات میں اس کا رتبہ، انسان اور خودی وغیرہ۔ اس سلسلے میں علاّمہ کے متعدد اشعار ذہن میں آتے ہیں جن کے معنیٰ کوہِ ہمالہ کے استعاراتی حیثیت سے منسلک کرنا مشکل نہیں۔ مثلاً:

تو کوہ و بیاباں و راغ افریدی خیابان و گلزار و باغ افریدم

جہاں تک کلامِ اقبال سے کوہِ ہمالہ کے تعلق کی بات ہے تو اس کی طرف لفظ دیوان اشارہ کرتا ہے۔ خدا کائنات کا خالق ہے جس کا ایک عنصر کوہسارِ ہمالہ ہے اور شاعر دیوان کا خالق ہوتا ہے۔ شاعر کے دیوان میں اس کی تخلیقات (غزلیں) سموئی ہوئی ہیں۔ یہاں بلا واسطہ انسان اور خدا، اقبال کا وہی اہم موضوع اُبھرتا ہے جس کا ایک نمایاں اظہار مذکورہ بالا شعر میں ہوا ہے۔ ایک اور لفظ یعنی مطلع بھی شعر اور شاعر کے موضوع سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اگر بانگِ درا بلکہ پورے کلامِ اقبال کو استعاراً دیوان کہا جائے تو نظم ہمالہ کو اس کا مطلع ٹھہرانا جائز ہی ہوگا۔

کوہِ ہمالہ جاویدانی کی ایک علامت ہے، اس میں ,,پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں،، ساتھ ہی ساتھ اس کوہ کا تاریخی وقت سے بھی تصوّر بندھا ہوا ہے۔

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

اور آگے: ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو

نظم کے آخری بند میں بھی خالص رنگِ اقبال جلوہ گیر ہے۔ اوّل تو شاعر کے ایک اور بنیادی موضوع کی نشان دہی کی گئی ہے یعنی اسلام، تاریخِ اسلام اور ہندوستان میں اسلام۔ یہ موضوع پہلی بار اسی نظم میں نمودار ہوتا ہے۔ نظم ترانۂ ہندی میں اِس موضوع کا فروغ زیادہ ٹھوس الفاظ میں اظہار پاتا ہے:

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن یاد تجھ کو اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

گنگا کی وابستگی ہمالہ سے واضح ہے۔ اس کے کنارے ,,ہمارا،، یعنی مسلمانوں کا کارواں اُترا۔ اس لحاظ سے ہمالہ کے علامتی مفہوم میں ایک نئی سمت کھلتی ہے، ہمالہ کا اسلام سے براہِ راست تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہمالہ نہ صرف کشورِ ہندوستان کا پاسبان بلکہ مسلمانوں کا محافظ بھی ثابت ہوتا ہے۔

فنکارانہ لحاظ سے نظم ہمالہ کے نہایت خوب صورت اشعار آبی محرکات (motives) سے وابستہ ہیں۔ ان محرکات کو اقبال کے یہاں بڑی جگہ حاصل ہے۔ زیرِ نظر نظم میں آب پہلی بار چشمے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے:

چشمہء دامن ترا آئینۂ سیال ہے دامن موج ہوا جس کے لئے رومال ہے

پھر وہ ندی میں تبدیل ہو جاتا ہے:

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

آب سے کچھ ہٹ کر لفظ آئینہ پر توجہ دیں۔ ابھی یہ لفظ صرف تشبیہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ چشمہء دامن کا پانی جو آئینۂ سیال کہا گیا اب ندی بن کر نیچے اتر رہا ہے۔ وہ سنگِ راہ سے ٹکراتا بھی ہے بالفاظِ دیگر پانی کا آئینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر کیوں نہ فرض کیا جائے کہ اسی تصویر کشی میں اسی استعاری آئینہ کی مبہم سی جھلک ملتی ہے جس کا پیکر بعد میں مشہور ترین غزل کے شعر میں نمودار ہوگا: یہ ہے ,,۔۔۔وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں،،۔ غالباً ہے تصوار کرنا بھی نا جائز نہیں ہوگا کوہِ ہمالہ میں شاعر کو اُس آئینے کا پیکر ملا جس میں اس نے ,,حقیقتِ منتظر،،کو ,,لباسِ مجاز،، میں دیکھ پایا!

اب آبی موضوع پر لوٹیں۔ ,,ہمالہ،، سے لیکر اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں بھی آبی محرکات تشبیہ، استعارہ اور علامت کی حیثیت سے ارتقا پزیر نظر آتے ہیں۔ اقبال کے یہاں بہتا پانی یعنی آبِ رواں زندگی کی علامت ہے۔ اس کی طرف خود شاعر براہِ راست اشارہ کرتا ہے: ,,ایک اصلیت میں ہے نہرِ رواں زندگی!،، اقبال کی شاعری میں آب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں: چشمہ، ندی، آبِ رواں اور پھر ,,جاوید نامہ،، تک پہنچتے پہنچتے وہ آبِ جُو اور زندہ رود کہلانے لگتا ہے۔ زندہ رود جس کے لفظی معنیٰ ہیں زندگی سے بھرپور دریا خود اقبال کے الفاظ میں ,,پیغمبرانہ روح کا استعارہ،، بن گیا ہے۔ یہی نام شاعر نے ,,جاوید نامہ،، میں اختیار کیا۔ اس سلسلے میں اقبال کی شاعری کے ایک اور رجحان کا ذکر کرنا ضروری ہے جو مغرب سے وابستہ ہے۔ یہاں اقبال کے تعلق سے گوئٹے (Goethe) اور ان کے ,,مشرقی مغربی دیوان،، کو یاد کرنا ضروری ہے جس سے اقبال نے زندہ رود کا نام ماخوذ کیا۔

اس بات کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ نظم ہمالہ میں شاعر کے متعدد کلیدی الفاظ عمل میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے گل جو اس نظم میں اس طرح دیکھنے میں آتا ہے: ,,جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی،،۔ اقبال کے شاعرانہ نظام میں گل بمعنیٰ پھول (سب سے پہلے لالہ) روایتی کے ساتھ علامتی بھی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ مذکورہ بالا مصرعے میں گل صرف قدرت کے ایک عنصر کی مجموئی حیثیت سے ہی پیش آتا ہے صرف بعد کی نظموں میں اس کا استعارتی اور علامتی رنگ وجود میں آئے گا۔ (کلامِ اقبال کی حدود میں اس کلیدی لفظ کے ارتقا پر شمس الرحمٰن فاروقی کے مذکورہ بالا مضمون ان میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے)۔ اسی بند میں گل سے منسلک موضوع کا آغاز نظر آتا ہے۔ مصرع ,,یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی۔۔۔،، اور بند کا آخری شعر: قابلِ غور ہیں:

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

یہاں گل اپنی پتی کی آواز سے اپنا افسانہ سناتا ہے۔ بعد میں پھول کے پتّے کے لئے شاعر لفظ برگ نہیں بلکہ ورق استعمال کرے گا جیسے ,,تصویرِ درد،، میں:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اس شعر میں رعایت لفظی کی خوبی کی بات ہی درکنار۔ لیکن ہم فقط لفظ ورق پر ہی توجہ دیں۔ اس کے معنیٰ برگِ گل اور کتاب (داستان) کا صفحہ بھی ہیں۔ اس طرح پھول کا پتّا شاعر کی داستان کا ورق بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں ان دونوں نظموں میں موضوعاتی ارتقا کا رشتہ صاف نظر آتا ہے۔ اس طرح کی مثالوں کا سلسلہ دور تک بڑھایا جا سکتا ہے۔

ایک مختصر مضموں میں بانگِ درا کی اس پہلی نظم کے ہر شعر یا ہر بند پر نظر ڈالنے کی گنجائش نہیں ورنہ پورے کلامِ اقبال سے اس کی وابستگی قائم کرنا پڑتی۔ کئی اہم باتیں خارج از گفتگو رہ گئی ہیں، مثلاً یہ کہ اس نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں اقبال کا پیغمبرانہ لہجہ سنائی دیتا ہے جو پھر ان کے پورے کلام پر چھا جاتا ہے اور بعض دوسری باتیں۔

آخر میں اتنا ہی کہنا چاہوں گی کہ نہ صرف نظم ہمالہ بلکہ اقبال کی ہر نظم اور ہر غزل کو غور سے اور شوق سے پڑھا جائے تو ہر شعر میں شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال کے متجسس ذہن کا عمل، ان کے فن کے ارتقا کی روشنی میں ان کا ذہنی ارتقا بھی منعکس نظر آئے گا۔ اقبال کی شاعری اِن کے نظریات کا آئینہ ہے۔ علاّمہ اقبال کے افکار اور ان کا شاعرانہ حسن ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس لئے اقبال کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ان کی کلام کا گہرا مطالعہ ہے جس کی ابتدا نظم ہمالہ سے ہی کرنا بہت مددگار معلوم ہوتا ہے۔

..... تناظر .....

ہر چند تناظر کا یہ دوسرا کتابی سلسلہ ہے مگر ۴۴۵ صفحات کی یہ ادبی دستاویز سماجی علوم، عالمی ادب، اردو ادب، مطالعہ سعادت حسن منٹو، آرٹ/فلم، کتاب گھر اور شاعری کے خوبصورت انتخاب کے ساتھ ایک نایاب دستاویز بن گئی ہے جس کا گجرات جیسے چھوٹے شہر سے شائع ہونا نہ صرف نیک شگون ہے بلکہ ادبی حلقوں میں گجرات کے مقام کو معتبر کرنے کی ایک عمدہ کاوش بھی ہے جس کے لیے تناظر کے مدیر جناب ایم خالد فیاض اور اُن کے معاونین شیراز احمد، راشد مسعود، ریحان ساعی، سید خاور ممتاز اور احمد عطا صاحبان مبارکباد کے مستحق ہیں۔

رابطہ: آئیڈیل بک سنٹر، ریلوے روڈ گجرات

The Lahore Declaration

Decided by the declaration committee. 23rd December, 2013

Pran Nevile,

Chairman Declaration Committee

A 3-day International Conference of Peace was held in Lahore under the auspices of World Punjabi Congress and International Sufi Council, from December 21st to December 23rd , 2013. 65 delegates from different countries of the world participated, which included high-profile scholar, intellectuals, writers, poets and representatives of the professional groups. The biggest delegation was from India, comprising 30 distinguished delegates.

A declaration committee was formed by the Chairman Mr. Fakhar Zaman as under:

1) Mr. Pran Nevile, Chairman
2) Dr. Deepak Manmohan
3) Dr. Vanita Manchanda
4) Mr. Asad Mufty
5) Mr. Naresh Nadeem
6) Mr. S. Swarn
7) Dr. Abdall Bela

It was resolved as under:

1) The writers, intellectual and scholars should play the predominant role in the promotion of international peace as well peace between the two countries i.e. India and Pakistan.

2) The governments and the establishment basically have non-peace preferences and intellectuals of both the countries should exert their influences for the promotion of peace.

3) The peace between two countries cannot be realized by the establishment of the two countries, but only by the writers, intellectuals and artists for which frequent exchanges of writers, intellectuals and artists and students should be made possible.

4) Visas between India and Pakistan should be done away with and frequent exchanges of writers, intellectuals and artists should be implemented. Visas between India and Pakistan should not be city specific nor for singles entry and should be multiple.

5) The basic changes in the text books of both of the countries should be made to exclude the wrong history and facts written therein.

6) That the International Peace Conference will be held not only in Pakistan and India but in all other countries of the world which are associated with the World Punjabi Congress.

7) The conference in India will be held in the month of March and the European countries as to be decided per convenience.

8) About the Punjabi situation in Pakistan, it was resolved that primary level education should be imparted in Punjabi.

9) 10,000 unemployed Punjabi M.A. degree holders should be employed.

10) A Punjabi University on the pattern of Indian Punjab universities should be established in Lahore by upgrading the Institute of Punjab Language and Culture in Lahore.

11) The Punjabi contemporary Literature has to be translated into English and uploaded on the internet for the international readers.

12) The World Punjabi Centre in Patiala will hold a big International peace Conference in Patiala in the middle of March to continue the momentum of this biggest International Conference of Peace, not only in India but also is the subcontinent.

13) Another conference will be held in the U.K and the Netherlands by October/November next year.

14) The conference showed great concern about the suppression of the Palestines and resolved that Palestine should have the restoration of their land and full independence.

''دعائے بے صدا''

حمد باری تعالیٰ

اُس کی تسبیح میں محو ہے
کائنات کا ذرّہ ذرّہ
ایک دعائے بے صدا میں مشغول
مہر و ماہ، انجم اور سیّارے
زمیں کی گردشوں کا مدھم مدھم آہنگ
شام و سحر کا بے نام سا تسلسل
سبز و گل، سرو و سمن
سمندر، دریا، کوہ و دمن
روشنی، رنگ، خوشبو، کہکشاں
زیرِ آب ماہی، طیورِ نغمہ ریز
طوافِ زندگی کے سارے نقش ہائے فانی
اُسی کا نام لیتے ہیں
اُسی کا ذکر کرتے ہیں

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

سماں خزاں کا اگر دہر کے کھنڈر میں رہا
سدا گلاب ترا میری چشمِ تر میں رہا!
وہی ہے عفو و کرم کی طلب سدا ان سے
کہ میں تو جرم و خطا کے کٹھن سفر میں رہا
حضور نے جہاں، جس حال میں قدم رکھا
رواں دواں میں اسی پاک رہگزر میں رہا
ہجومِ شوق اڑا لے گیا تھا روضے تک
پلٹ کے آنے کا دم خم نہ بال و پر میں رہا
کمال و فضل کے ہر نقطۂ نہایت پر
وہ تاجدارِ نبوت زمانے بھر میں رہا
ہماری کوئی ادا تو انہیں پسند آجائے
تمام عمر یہ سودا ہمارے سر میں رہا!
گری تھی کان میں جب تیرے نام کی شبنم
میں اس کے بعد اسی نام کے اثر میں رہا
مجھے خدا کو بھی سرکار منہ دکھانا ہے
مآل نیک ہے گر آپ کی نظر میں رہا
کشادہ دست کرم اس قدر کہ یوم وصال
دیا جلانے کو شاہدؔ نہ تیل گھر میں رہا

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

اشکوں کے دیپ

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

بارش ایسے ہو رہی تھی کہ جیسے یہ آج کے بعد کبھی برسے گی ہی نہیں۔ کیلاش ائیر انڈیا بلڈنگ کے سامنے والی کھیرا بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کی کھڑکی سے باہر ملابار ہلز کی فلک بوس عمارتوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ باہر موسلا دھار اور دھواں دار بارش کے باعث ایک دودھیا دیوار زمین سے آسمان تک کھینچی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جس کی وجہ سے اُس پار کا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف سمندر کے پانی کی حدِ نظر تک بچھی ہوئی چادر تھی جو فلک کو چومتی ہوئی نظر آ رہی تھی مگر باوجود اس شدید بارش کے جو پچھلے کئی دنوں سے مغرب اور مشرق سے لگا تار برس رہی تھی۔ نیتا جی سبھاش روڈ پر موٹریں اور بسوں کی آمد و رفت میں قطعی فرق نہ تھا حالانکہ بمبئی کے کئی علاقوں کی آمد و رفت قریب قریب بند ہو گئی تھی۔ کئی جگہ پر تو موٹریں، بسیں اور ریل گاڑیاں چلنا بند ہو گئی تھیں۔ ریل کی پٹڑی کئی جگہ پانی میں ڈوب گئی تھی۔ اخبار والوں نے لکھا تھا کہ آج کی بارش نے موجودہ سردی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔

یوگی اپنے بھائی رام کی تیمارداری کے لیے بمبئی ہسپتال جانے کے لیے ناشتہ کرنے کے بعد ٹیکسی کا منتظر تھا۔ رام نے اُسے دہلی سے بلوایا تھا کیونکہ رام کو مسلسل کئی سالوں سے ہلکا بخار (Low Grade Fever) رہنے لگا تھا جس کی وجہ سے کمزوری آ گئی تھی اور وزن بھی روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔ ہسپتال داخل ہو کر مکمل طور سے تشخیص کروانا چاہ رہا تھا۔ چیک اپ کے دوران اپنے کسی خاص آدمی کا پاس ہونا اُس نے ضروری سمجھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی بھر اُس نے کسی کو بھی اپنا نہیں سمجھا اس لیے خیال گزرتا ہے کہ اُس نے کسی جذبے کے تحت یوگی کو بلایا تھا۔ اُس نے یوگی ہی کو کیوں بلایا تھا؟ یہ تو وہ خود ہی بہتر جانتا تھا کیونکہ پچھلے چالیس برسوں سے اس کا یوگی سے صرف بھائی کہنے کا ہی تعلق رہ گیا تھا اور یوگی نے بھی رام کو اپنے بھائیوں کی لسٹ سے نکال رکھا تھا۔ رشتہ صرف دنیا داری تک ہی محدود تھا مگر یہ اس لیے کہ اُس کی بھابھی رام کی طرف کے رشتوں کو پسند نہیں کرتی تھی جواب اِس دنیا میں نہیں رہی تھی اُسے گزرے آٹھ نو مہینے ہو گئے تھے۔

دہلی سے بمبئی تک ہوائی جہاز پر سوار ہونے سے پہلے اُس کو اس خیال نے بُری طرح جھنجھوڑا تھا کہ جس کی تیمارداری کے لیے وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر جا رہا ہے اُس نے تو کبھی اپنا نہیں سمجھا، زندگی میں کبھی اُس کے کام نہیں آیا، یہاں تک کہ جب اُس کی بیوی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں مہینوں بیمار پڑی رہی اور دیگر آپریشن کے بعد موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی۔

رام نے اُس کی عیادت کے لیے درکار ایک خط بھی نہ لکھا۔ گھر میں سبھی افراد رام کی سنگدلی سے سخت رنجیدہ تھے کیونکہ رام کے دل میں اس کے رشتے داروں کے خلاف نفرت کا جو بیج اس کی بیوی نے بویا تھا اُس کے پیڑ کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی تھیں کہ اُن کو اکھاڑنا رام کے بس کی بات نہ تھی اس لیے سب ہی رام سے کٹ کر رہ گئے تھے۔

یوگی سوچ رہا تھا کہ ایسے بھائی کی تیمارداری کے لیے بزنس کو نقصان پہنچانے میں کیا حاصل! سوچوں کے اس موڑ پر یوگی کا دوست ضامن علی (مرحوم) اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اپنے مخصوص انداز میں ہنس کر کہنے لگا ''یوگی صاحب دوسروں کی خامیوں کے پیشِ نظر کوئی فیصلہ کرنا صحیح فیصلہ نہیں ہوتا، بھائی کی کمزوریاں نظر انداز کیجیے اور اپنا فرض ادا کیجیے'' یہی سب کچھ اس کے ہمدرد دوست اشارت اور خورشید بیگم نے اپنے خط میں لکھا تھا اور فون پر اسی جذبے کا اظہار کیا تھا۔ یوگی نے ایک پل میں ہی ماضی کے تمام شکوے اپنے ذہن سے جھٹک دیے اور سب کچھ درگذر کرتے ہوئے اپنے بچوں کی بات کی پرواہ نہ کی اور سچ مچ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے بمبئی چلا آیا۔ رشتے داروں کی تمام تلخیوں کو بالائے طاق رکھ کر بھائی کے پاس اس کی تیمارداری کے لیے پہنچ گیا جو اپنی بیوی کی رحلت کے بعد بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ یوگی نے بھائی کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اُس نے اس قدر لگن سے رام کی دیکھ بھال کی اور اس کے بول براز اٹھانے میں ذرا ہچکچاہٹ نہ کی۔

یوگی کی خدمت کے اثر سے رام کے دوست پریم نے بھی رام سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر یوگی نہ ہوتا تو تم مر گئے ہوتے۔ اتنی لگن سے یوگی نے تمہاری خدمت کی ہے کہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ پریم کی بات یوگی کو بُری لگی اس لیے کہ وہ اپنی خدمت کا کوئی کریڈٹ نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ تو اپنے یار ضامن علی کی طرح بے لوث رشتے کا قائل تھا۔ اسی طرح رام کے ایک دوست اعجاز احمد سید نے بھی کئی بار یہی کہا کہ یوگی نہ ہوتا تو تم نہ ہوتے۔ ڈاکٹر کومل اور اُن کے شوہر جو خود کو رام کے قریبی دوستوں میں شمار کرتے تھے اور رام کے علاج کی کڑی نگرانی کر رہے تھے گاہے بگاہے ڈاکٹروں سے تبادلہ خیال کرتے اور پھر رام کو مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔ بمبئی جیسی مشینی زندگی کے شہر میں جہاں پتھر کی عمارتوں کے ساتھ لوگ بھی پتھر دل ہو گئے ہیں احساس و جذبات سے عاری ایسے میں اگر کوئی اپنائیت کا احساس دلاتا ہے تو ناگاہ آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ افسوس صد افسوس رام گاہے بگاہے یوگی سے گفتگو ان لوگوں سے متعلق کیا کرتا تھا۔ یوگی اکثر اوقات محسوس کرتا کہ اس کے بھائی نے کبھی اُن لوگوں میں سے کسی کو بھی اپنا نہیں سمجھا اور نہ ہی کبھی اِن لوگوں کی اپنے پن کی باتوں کو اہمیت دی۔ کئی بار اُس

نے اُن کا مذاق اڑایا جس کے باعث یوگی کو بے پناہ تکلیف ہوئی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اُس کے اپنے بارے میں بھی رام کے خیالات اسی طرح کے ہونگے۔

اس کے سامنے سارے حالات تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایک طرف تو ڈاکٹر کومل اور اُن کے شوہر جیسے ہمدرد و غمگسار لوگ اور دوسری جانب جو صرف اپنے مطلب کا بندہ ہے جو اُن لوگوں کے ساتھ ذرہ بھر بھی ہمدردی نہیں رکھتا تو وہ خود یوگی کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ اُسے دکھ کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا تھا کہ رام زندگی میں کسی کا نہیں ہوا اور اُس کے رشتے دار یہ جانتے بھی نہیں کہ یہ شخص دل میں کچھ رکھتا ہے اور زبان پر کچھ۔ ظاہری دکھاوے کی خاطر لوگ خاموش رہتے مگر رام اپنی خوش فہمی میں رہا کہ وہ چالاکی میں کامیاب ہے اور کسی بھی شخص کو بیوقوف بنا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کومل، اُن کے شوہر اور سید صاحب اِن چند لوگوں میں سے تھے جو سچے اور صاف دل سے دوسروں کے بارے میں سوچتے اور ہمیشہ مخلصانہ مشورہ دیتے۔ مگر آفرین ہے رام پر ایسے مخلص اور ایماندار دوستوں پر بھی جن میں کھوسلہ صاحب اور پریم بھی قابل ستائش تھے کے ساتھ رام نے ہمیشہ کی طرح اِن کے ساتھ بھی ڈپلومیسی سے کام لیا مگر وہ سب کچھ جانتے بوجھتے رام کے غم میں برابر کے شریک رہے۔

پریم کی زبان میں کڑواہٹ ضرور ہوتی مگر وہ جو مشورہ دیتے وہ اُن پر غور ضرور کرتا اور سب ہی دوست ہمیشہ دل رکھنے والی بات کرتے تھے۔ یقیناً اُن کی باتیں پریم کے دل پر گراں گزرتی مگر اُن کی سماجی حیثیت کے باعث پریم خاموش رہتا۔ کیونکہ پریم انہی دوستوں سے تعلق کی بنا پر ناز بھی کرتا تھا اور اُن کے رسوخ سے فائدہ بھی اٹھاتا تھا۔

رام کی جوانی کے بارے میں دوستوں کے خیالات سُن سُن کر یوگی کو اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرہ بھر بھی دشواری نہیں ہوئی کہ رام کے آگے رشتے، ناتے اور تعلق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یوگی کو پھر بھی کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ وہ رام کے پاس از راہِ انسانیت تیمارداری اور محض اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آیا تھا یا پھر اپنے مرحوم دوست ضامن علی کی روح کو سیراب کر رہا تھا یا شاید اپنے دل کو راحت پہنچانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ مگر ان حالات میں رام کو اس طرح سوچتے دیکھ کر یوگی ایک عجیب طرح کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ انسانی رشتوں کے روحانی تو کیا دنیاوی پہلو کی لذت سے بھی محروم تھا۔ اُس نے ہر شخص کو فریب کار سمجھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے خول سے کبھی باہر نہ آ سکا۔ زندگی کی نسبت اُس کا یہی رویہ اُسے آج بھی لوگوں سے کاٹے ہوئے تھا جو اُس کی زندگی اور موت کے درمیان دوستوں، تیمارداروں اور ہمسائیوں کے روپ میں اُس کے شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے۔

اُس موڑ پر اُسے پھر اپنے یارِ غار ضامن علی کی یاد آئی جو اکثر کہا کرتا ''کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر نیک کام نہیں ہوتا، نیکی صرف وہی قبول کی جاتی ہے جو بے لوث ہو، زندگی عمل کا نام ہے ردِ عمل کا نہیں'' اور پھر یوگی اس قدر دل شکن حالات میں بھی اپنا فرض تندہی سے انجام دیتا رہا۔

رام ہسپتال سے صحت مند ہو کر لوٹ آیا۔ اب وہ بغیر کسی کی مدد کے چل پھر سکتا تھا، گھوم پھر سکتا تھا، اس کے باوجود اب اس مطلب کے بندے پر اپنے بھائی کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ اب وہ بھائی کو پیار سے کاکا کہنے کے بجائے شاعر صاحب پکار کر طنز کرنے لگا۔ اُس کی زندگی پھر سے انہی لوگوں کی ہو کر رہ گئی جو کبھی کسی کے نہ ہوئے تھے۔ یوگی کا اب وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ جس کام کی نیت سے وہ آیا تھا وہ انجام دے چکا تھا۔ آج نہیں تو کل اُسے لوٹنا ہی تھا اس لیے اُس نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے کر روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

اڑان کے دوران بمبئی میں گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں اُس کے ذہن میں فلم چلتی رہی۔ وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا کہ کیا اس مشینی دور کے شہر میں رہنے والے لوگ بھی مشین کی طرح جذبات و احساسات سے عاری ہیں۔ کیا اس کا بھائی بھی ایک مشین ہے۔ پھر میں اپنے بھائی کی طرح مشین کیوں نہ بن سکا۔ انہی سوچوں کے بیچ دہلی کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ گھر پہنچ کر یوگی نے اپنی شریک حیات اور بچوں کو بھائی کی خدمت میں گزرے ہوئے دنوں کی داستان سنائی تو وہ اُس پر ٹوٹ پڑے۔ جیسے وہ اسی عمل کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔ ایک سے ایک تلخ جملہ زہر میں بجھے ہوئے تیر کی مانند اُس کے جسم کو چھیدنے لگا۔ جواب میں اُس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

''رام میرا بھائی ہے، میں اُس کی مشکل میں کام نہ آیا تو اور کون آئے گا، دنیا کچھ بھی کہے میں تو یہی جانتا ہوں کہ رام کے پہلو میں ایک محبت بھرا دل ہے اور وہ میرے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کر سکتا!'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے یوگی کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اُس کے دل سے کچھ اور ہی الفاظ ادا ہو رہے تھے ''گئے تھے بھائی بن کر۔۔۔!! لوٹے ہو شاعر کا خطاب لے کر۔۔۔!!! لفظ شاعر پر یوگی کے دل میں چند اشعار سر ابھارنے لگے۔

آخر دستِ قضا نے مجھ سے چھین لیا ہے ساتھ کسی کا
میں ہوں اس دنیا میں تنہا وہ ہے اُس دنیا میں تنہا
مانا وہ مطلب کا بندہ رسم وفا سے بیگانہ تھا
لیکن رخصت کا وہ منظر جب وہ دریا دریا رویا
بات بنے کیا دیر ہوئی تھی لیکن اپنی قسمت پھوٹی
وہ پردیسی ہم پردیسی دونوں کا ہے درد سے رشتہ
روحوں کے جھرمٹ میں اس کو یاد کسی کی کیا آئے گی
جس نے ہر اک شخص کو اکثر دوری کا احساس دلایا
تشنہ دل کی خیر مناؤ اور اشکوں کے دیپ جلاؤ
ورنہ کھا جائے گا تم کو ہجر کی لمبی رات کا پہرہ

☆

کماش

آغا گل (کوئٹہ)

ان آگ اگلتے پہاڑوں میں ہر شے ساکت و جامد تھی، ٹھہرے ٹھہرے ساکت پہاڑ، ندیاں بنا پانی کے سوئی سوئی رہتیں۔ دن میں دو بار ہواؤں کے رخ بدلتے تو ریت چلنے لگتی۔ دینار کو دلچسپی تھی تو ان کوچوں سے جو کراچی سے کوئٹہ اور کوئٹہ سے کراچی دوڑے چلے جاتے۔ زناٹے سے گزرتے تو پتھر اور کنکریاں اڑنے لگتیں۔ ان کے عقب میں گرد کا بادل دم دار ستارے کی مانند تیرتا چلا جاتا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے وڈھ سے کچھ دور مین روڈ پر ہی ایک کھوکھا خرید لیا تھا۔ کھوکھے کے مالک کی لاش ویرانوں سے ملی تھی۔ اس کے اہل خانہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ کھوکھا فروخت کر کے چلتے بنیں کیونکہ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ خدا کا بھی حکم ہے کہ آفت زدہ علاقے سے ہجرت ہی کر لی جائے تو بہتر ہے۔ دینار کو کچھ تو ماہ بہ ماہ پنشن کی رقم مل جایا کرتی۔ وڈھ کے ڈاک خانے سے وہ پنشن لے آیا کرتا۔ کچھ تازہ بہ تازہ دل دہلانے والی خبریں بھی لاتا۔ اس کا کھوکھا چونکہ تاج محل ہوٹل سے قریب ہی تھا۔ جہاں متعدد کوچ وہاں رکا کرتے۔ وہاں کوچ ڈرائیوروں کو نہ صرف کھانا مفت تھا بلکہ انہیں قوت بخش سگریٹ بھی مفت میں ہی ملا کرتے۔ ان سگریٹوں کی ڈبیاں الگ سے پڑی ہوتیں۔ ایسی مہمان نوازی کے سبب تاج محل ہوٹل خاصا کامیاب تھا۔ مسافر اس کے کھوکھے سے سگریٹ وغیرہ خریدنے کو لپکتے اور جلدی جلدی سینے میں دھواں انڈیلنے لگتے۔ اسے روپیہ کمانے کا زیادہ شوق نہ تھا سرِشام دکان بڑھا کے وہ کچھ آگے جا نکلتا وہاں ایک چٹان پہ جا بیٹھتا اور طوفانی رفتار سے پکی سڑک پہ دوڑتے کوچ دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوا کرتا دور ایک روشنی چمکتی پھر وہ روشنی دو بتیوں میں تبدیل ہو جاتی اور زناٹے دار آواز آتی۔ پریشر ہارن وادی میں گونج جاتے۔ پتھر اڑنے لگتے اور گرجتے ہوئے کوچ اندھیرے میں مدغم ہو جاتے ان کی بیک بتی کسی جگنو کی مانند ٹمٹماتی۔ مگر پھر وہ بھی ڈوب جاتی۔ اتنے میں دوسرا کوچ اسی شان سے نمودار ہوتا۔ دھرتی کا سینہ روندتا۔ مٹی ریت پتھر کنکریاں اچھالتا بڑھتا ہی چلا جاتا۔ ایک نرالا سرور دینار کو آتا۔ جبکہ دیگر دکاندار سمجھتے دینار عمر کے سبب سٹھیا گیا ہے ورنہ تو برق رفتار کوچوں کو دیکھنا کیسا بے تکا مشغلہ ہے۔ نوجوان عمر رسید اور دیگر دکاندار مزے سے ہوٹل میں لگے ٹیلی وژن پر بھانت بھانت کے پروگرام دیکھا کرتے ہندوستان کی رقاصائیں، یورپ کے جنگجو، ترکی حسینائیں اور چینی عورتیں جو عورتوں کا منی ایچر ہیں جن کے جسم کا ہر حصہ آڑانجی جیسے قحط کا شکار جیسے بارشیں نہ ہونے سے قاشم چھوٹا چھوٹا رہ جاتا ہے۔ دینار کو ٹیلی ویژن سے دلچسپی نہ تھی۔ ڈش کی اکلوتی آنکھ آسمان سے دنیا جہاں کی تفریح کھینچ لاتی۔ رات گئے وہ گھر لوٹتا تو اس کی بیوی فاطمہ سکھ کا سانس لیتی کیونکہ پکڑ دھکڑ اور اغواء کا سلسلہ عام تھا۔ مانا کہ دینار کو غربت کے سبب کوئی اغوا نہ کرتا۔ مگر پوچھ گچھ کے بہانے تو دھر لیتے۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر ان کا کوئی کیا بگاڑ لیتا۔ لوگوں کے پاس واحد ہتھیار یہی بچا تھا کہ سڑک بند کر دیں۔ جس کے باعث مسافر عورتیں اور بچے ہی خوار ہوتے۔ چونکہ بادشاہ ان کوچوں پر سفر نہ کرتے۔ ان کے کان پہ جوں بھی نہ رینگتی۔ پھر لیویز والے دوڑے چلے آتے۔ تحصیلداران سے قسمیں کھا کھا کر وعدے کرتا کہ اغوا شدہ یا گمشدہ فرد کو وہ جلد بازیاب کرا لے گا۔ مگر یہ سب کچھ بے نتیجہ ثابت ہوتا۔ تحصیلدار وہاں ٹکنے نہ پاتے۔ انہیں بار بار بپھرے ہوئے ہجوم کے سامنے جھوٹی قسمیں کھانے میں عار محسوس ہونے لگتی۔ تو وہ ٹرانسفر کروا کر کھڈ کوچہ یا پیٹرنگ آوات چلے جاتے اور دل جمی سے کچھ عرصہ قسمیں کھا کھا کر وہاں ہجوم کو قابو کرتے احتجاجیوں کو سنبھالتے۔

تاج محل ہوٹل میں اس کی ملاقات سپاہیوں سے بھی ہو جایا کرتی جو قلعہ سے نکل کر سہہ پہر میں ٹہلنے خط پوسٹ کرنے یا سگریٹ وغیرہ لینے چلے آیا کرتے۔ ان کا قبوچی قلعہ ایک عمودی قبر سی لگتی اجتماعی قبر جس میں وہ محبوس رہتے۔ خود کو محفوظ سمجھتے اور قلعہ سے باہر کی دنیا پر نظر رکھتے کہ ان پہ حملہ نہ ہو جائے۔ وہ ان دیکھے شکریوں سے خائف رہتے۔ مقامی آبادی سے وہ حاکمانہ فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ہوٹل تاج محل آتے جاتے شاہ جہاں یہ ڈھابہ دیکھتا تو فرطِ غم سے فوت ہو جاتا۔ لیکن یہاں دن بھر چہل پہل رہتی سپاہی وردی کے اندر گوشت پوست کے انسان تھے ان کے قلعہ میں انڈین چینل لگانے پر پابندی تھی حالانکہ دشمنی تو مردوں سے ہوا کرتی ہے دشمن کی حسین عورتیں تو مالِ غنیمت ہو کرتی ہیں۔ انہیں تو گھروں میں ڈالا جاتا ہے وہاں وہ جی بھر کے پروگرام دیکھتے اور پھر خوشبودار صابن لے کر قلعہ کی راہ لیتے۔ داستانوں کے کرداروں کی مانند تاج محل ہوٹل سے نکلتے ہی وہ دوبارہ پتھر کے انسان بن جاتے۔ ان کے چہروں پر لاتعلقی اور خشونت آ جاتی۔ وردی پہن کر تو بالکل ہی اجنبی لاتعلق مخلوق بن جاتے البتہ دینار کی دوستی حولدار دلاور سے یہیں ہوئی تھی۔ وہ یوں تو اپنے کھوکھے میں چائے منگوا سکتا تھا مگر ٹیلی ویژن کے سامنے دوست نما دشمنوں میں چائے سڑکنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے دلاور سگریٹ کا رسیا تھا۔ اکثر بڑھیا سگریٹ کی فرمائش کیا کرتا۔ لنگر کا وہی انچارج تھا۔ جس کے باعث مال پانی وافر مقدار میں موجود رہا کرتا۔ تاج محل ہوٹل ہی اس کا ہائیڈ پارک تھا جہاں جی بھر کر بھڑاس نکالتا۔ ''یہ حکومت ٹاروٹی چینی غرضیکہ سگریٹ پر بھی ٹیکس لگاتی ہے اور کہتی ہے سگریٹ صحت کے لیے مضر ہے۔ اسی مضر سے کماتی بھی ہے۔ سگریٹ نہ پینے والے کیا ہمیشہ زندہ رہتے ہیں؟ قبرستان کیوں بھرتے جا رہے ہیں''۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ ہوٹل کے مالک سے ڈرائیور والی سگریٹ کی ڈبیہ تحفۃً قبول کرنے لگا ہے۔ سپاہیوں کے ڈر سے وہ دینار ہی کے ساتھ سہ پہر میں چہل قدمی کے لیے نکل جایا کرتا۔ تاکہ چرس کی بُو ان تک پہنچ ہی نہ پائے۔ دلاور اکثر اپنے گاؤں اور بیوی

بچوں کو یاد کر کے اداس ہو جایا کرتا۔ وہاں کھیت کی وٹ پر بیٹھ کر مولیاں کھانے کا جوم مزہ ہے، سرسوں کاٹ کر کھوئی پر نہانے کا جو لطف ہے وہ ان سیاہ پتھریلے میدانوں میں کہاں۔ ہمہ وقت خدشہ ہی تو رہتا ہے کہ کسی پہاڑی کسی ٹیلے سے چلی گولی ماتھا چاٹتی نکل جائے گی۔ ویسے تو MUFTI میں وہ انسان میں منقلب ہو کر جذباتی باتیں کرتا۔ دلاور کی دوستی دینار کو مہنگی پڑی۔ جب گاؤں کے تین نوجوانوں کو اٹھایا گیا تو لواحقین دوڑتے ہوئے اس کے کھوکھے پر چلے آئے اور التجائیں کیں کہ ان نوجوانوں کو چھڑا کر لائے۔ کیونکہ اس کے قلعداروں سے قریبی تعلقات ہیں۔ دینار نے کھوکھے پر ایک رشتہ دار کو بٹھایا دم دلاسہ دے کر مضطرب لوگوں کو ان کے گھروں کی راہ دکھائی اور خود قلعہ کی راہ لی۔ سبھی اسے جانتے تھے اسے اندر بلوایا گیا۔ دینار کے مطالبے پر وہ پریشان سے ہو گئے۔

''انہوں نے ہمارے ٹرک کو پتھر مارے ہیں''

''یہاں پھول نہیں کہ مارتے۔ پتھروں میں تو پتھر ہی ہوا کرتے ہیں۔ کوئی زخمی بھی نہیں ہوا نہ ہی لوہنے کے ٹرک کو کنکریوں سے کچھ ہوا ہے۔ ان کی عمریں تو دیکھو۔ بالکل بچے ہیں۔ یہ تو ان کا احتجاج ہے۔''

سپاہی بات سننے پہ آمادہ نہ تھے ''دینار ماما! یہ عام ٹرک نہیں سرکاری ٹرک ہے اس کو مارنا جرم ہے''

دینار جذباتی ہو رہا تھا ''سرکاری ٹرک کو مارنا جرم ہے اور خدا کے بندوں کو مارنا ثواب ہے۔ اچھا تاوان لے لو مجھ سے''

سپاہی مسکراتے رہے ''نقصان تو ہوا ہی نہیں۔ بے عزتی ہوئی ہے سرکار کی۔''

دینار نے خیری جھاڑ کر زمین پر بچھائی اور احتجاجاً دھرنا دے دیا ''میں تو ان بچوں کے بغیر نہیں جاؤں گا'' اس بحث و تکرار کی آوازیں کمیدان تک گئیں تو اس نے بلوا بھیجا تھا۔ جہاندیدہ اس نے دینار کی ضعیف العمری کا احترام کرتے ہوئے کرسی پیش کی۔

''میں یہاں کے بارے میں سنتا چلا آیا ہوں کہ یہاں امن و سکون تھا۔ سڑکیں محفوظ اور لوگ پرسکون تھے۔ دس برس میں یہ کیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سپاہی بتا رہے تھے تم گاؤں کے کماش ہو۔ تم ہی بتلاؤ۔ اس لڑائی کا بھی تو کوئی کماش ہوگا'' دینار نے صاف گوئی سے کام لیا ''میرا تعلق اسی علاقے سے ہے، مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا'' کمیدان خوشی میں میز پر جھک سا گیا اور دینار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اس ہنگامہ آرائی اور جنگ و جدل کا کماش کوئی تو ہوگا۔ بس نام بتا دو ہم خود اس تک جا پہنچیں گے'' دینار نے عہد لینا ضروری سمجھا ''کماش کی نشان دہی پر آپ ان بچوں کو چھوڑ دیں گے'' کمیدان کا چہرہ غیر متوقع جواب پر کھل اٹھا۔ کمیدان نے سینہ ٹھونکا ''یہ ایک سپاہی کا وعدہ ہے، لو ہاتھ ملاتا ہوں''۔ دینار کے جواب سے کمیدان ہکا بکا رہ گیا تھا ''تو ابھی چلیں میرے ساتھ'' کمیدان کو اس غیر متوقع کامیابی کی قطعاً امید نہ تھی۔ کمیدان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دینار کو جیپ میں پیچھے بٹھایا اور دو ٹرکوں میں سپاہی بھر کر دینار کے بتلائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دینار انہیں تاج محل ہوٹل ہی لے آیا اُدھر دور پہاڑوں پر شام اتر رہی تھی۔

سپاہیوں نے عسکری مہارت سے ہوٹل کو گھیرے میں لے لیا۔ مختلف جگہ پوزیشن سنبھال لیں۔ کمیدان کے ہمراہ دینار بڑی سی میز کے پاس پہنچا۔ جہاں درجنوں ٹی وی دیکھنے والے رضا کارانہ طور پر ہینڈز اپ ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر تعجب اور خوف تھا۔ دینار کو تو یوں کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مانو اسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ وہ سبھی برے پھنسے کی تفسیر اور تصویر بنے ہوئے تھے۔ ''ان میں سے کماش کون ہے''۔ کمیدان نے سوال کیا۔ وہ کھلا جا رہا تھا۔ کماش کی گرفتاری سے علاقے بھر میں امن و امان آ جاتا۔ کیا کمال کی بات تھی۔ بنا گولی چلائے امن۔ اسے ہی تو عقلمندی کہتے ہیں۔

دینار اسے ٹیلی ویژن کے پاس لے آیا۔ ہوٹل کی میز پر پڑا ٹی وی لاتعلقی سے پروگرام دکھائے جا رہا تھا۔ اس نے نہ تو ہاتھ اوپر اٹھائے اور نہ ہی خوف زدہ ہوا۔ بے جان ٹی وی سے جاندار پروگرام جوت جگا رہے تھے۔

''یہ ہے کماش۔ یہ ہے سارے فسادات کی جڑ گرفتار کر لو اس کو ہتھ کڑیاں ڈالا دو اس کے ہاتھوں میں۔ اس کی مسخ شدہ لاش پھینک دو ویرانوں میں'' کمیدان کو تاؤ چڑھا ''یہ ٹی وی کماش ہے کیا؟'' دینار غصے میں آگ اگلنے لگا۔ ''جب کوئٹہ کراچی روڈ بنا تو ان دنوں سبھی قسمت پر قناعت کیا کرتے تھے وہ اپنی غربت افلاس لاچاری اور بیماری کو عطیہ قدرت سمجھتے۔ پھر یہاں سڑک کے ساتھ ساتھ ہوٹل کھلنے لگے۔ انہوں نے ڈش لگالی، ٹیلی ویژن پر باقی دنیا والوں کو باقی علاقوں کو دیکھ دیکھ کر لوگ باؤلے ہونے لگے۔ وہ اپنا مقابلہ باقی دنیا سے کرنے لگے۔ ان کا دماغ جاگ اٹھا بھوک اور غربت سے مرنے کی بجائے انہوں نے گولی سے مرنا پسند کیا۔ صحراؤں میں بے گور و کفن مرنے کو ترجیح دی۔ نہ کفن کا خرچہ اور نہ ہی گورکن کی مزدوری۔ یہ ٹیلی ویژن گرفتار کر کے قلعہ میں لے جاؤ دوبارہ یہاں امن آ جائے گا۔ تھانہ سونا خان سے حب چوکی تک امن ہی امن ہوگا''

کمیدان کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس کے چہرے پر رنگ آتے جاتے رہے پھر اس نے خوفزدہ لوگوں کو جو ابتک ہینڈز اپ کھڑے تھے۔ ہاتھ نیچے کرنے اور آرام سے بیٹھ جانے کا عندیہ دیا پھر وہ اپنی جیپ میں بیٹھا جانے کیا کچھ سوچتا رہا۔ تا آنکہ اس نے دینار کو بلوایا جو تذبذب کے عالم میں تھا۔ ''لڑکے تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ میں وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ مگر انہیں کہنا دوبارہ ایسی حرکت نہ کریں''۔ جیپ کا انجن انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تو سبھی روانہ ہو گئے۔ سپاہیوں کے جاتے ہی لوگوں نے دینار کو کندھوں پہ اٹھا لیا ''کماش کیوارہ بند'' کے نعرے بھی لگے۔ دینار اس پذیرائی سے خوش ہونے کی بجائے نالاں ہوا۔ اور داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے مجمع کو چھوڑ کر ڈگ بھرتا کھوکھے تک جا پہنچا۔ کھوکھا بند کر کے یہ جا وہ جا نظروں سے ہی اوجھل ہو گیا۔ ''کوئی میرا شکریہ ادا کرنے نہ آئے'' اس نے فاطمہ کو تنبیہ کی اور چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

باقی صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ کیجیے

شجر ممنوعہ کی چاہ میں

پرویز شہریار
(نئی دہلی، بھارت)

اس نے کہا تھا۔

''ازدواج کی عارضی ادلا بدلی سے فرسودہ رشتہ میں نئی بہار آجاتی ہے جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر پر نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

اس نے جھوٹ کہا تھا۔

''میں اس شجر ممنوعہ پر چڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس سے کراہیت ہوتی تھی۔ لیکن، اس کی خوشی کے لیے، میں نے خود کو سمجھا لیا تھا۔

اپنے دل کی ایک نہیں سنی تھی اور بے قرار دل پر پتھر رکھ کر اس کی باتوں میں آگئی تھی۔''

مجھے نیچے سے دھکا دے کر جب وہ شجر ممنوعہ پر چڑھانے لگا، تب میرا ماتھا ایک دم سے ٹھنکا تھا۔ میں نے نیچے گہرا کنواں دیکھ لیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا جواب دینے لگے تھے۔ میں درخت سے نیچے گرنے ہی والی تھی کہ تبھی کسی نے اوپر درخت سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے دیکھا، کوئی شخص پہلے ہی سے وہاں مجھے سہارا دے کر اوپر اٹھانے کے لیے موجود تھا۔ ایک پل کو مجھے لگا میرے تن پر ایک کپڑا نہیں ہے۔ دنیا مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ لیکن جب حواس ٹھکانے لگے اور غور سے دیکھا تو وہاں ہر طرف ہمارے ہی جیسے لوگ موجود تھے۔ شجر ممنوعہ کا سرسبز و شاداب نخلستان اور دور دور تک ریگستان کا لامتناہی گھُپ اندھیرا۔ ہر درخت پر کوئی آدم زاد موجود تھا اور حوا کی بیٹیاں شجر ممنوعہ پر زبردستی چڑھائی جارہی تھیں۔ درخت کے پھل کھاتے ہی احساس زیاں جاتا رہا اور گہرے کنویں کا خوف بھی کافور ہوگیا۔ ہر طرف اٹھکھیلیاں چل رہی تھیں اور خشک ریگستان کے ٹھیک بیچوبیچ قہقہوں کے قل قل کرتے چشمے پھوٹ رہے تھے۔

ہم محبت کے رس میں بھیگے ہوئے تھے۔ ہمیں غیر مرد کی آغوش میں خود سپردگی کے لیے خود ہمارے شوہر آمادہ کررہے تھے۔ ان کی مدد سے ہم اپنے لباسوں کی قید سے انتہائی حساس طریقے سے دھیرے دھیرے آزاد ہورہی تھیں۔ ہمارے جسم کے تمام رونگٹے کانٹے دار گرگٹوں کی طرح کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ جُوں جُوں مردانہ ہاتھوں کے لمس سے ہماری حساس جلدیں مس ہوتی جاتی تھیں۔ اوپر سے نیچے تک ہمارے اعضا بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے تھے... کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون سا ہاتھ اپنے اور کون سا پرائے مرد کا ہے۔ پورے بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ ہم پر بے خودی اس قدر طاری تھی کہ کچھ بھی سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ہر پل بلکہ ایک ایک پل کے ہزارویں حصے میں بھی احساس کی لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہمارے جنسی غدودوں میں اس قدر ہلچل مچی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پراکرتی اور پرش کے اس ملن نے فطرت کے کاموں میں دخل در معقولات کرکے جوالا مکھی، طوفان اور سیلاب تینوں کے گیٹ بیک وقت کھول دیئے ہوں۔ ہم خس وخاشاک کی طرح جنسی ہیجان کے سیل رواں میں بہتے جارہے تھے۔

ہوش جب آیا جب دھیرے دھیرے موسیقی کی دھن مدھم پڑنے لگی اور جلتی بجھتی برقی قمقموں کی رنگ برنگی روشنی ماند پڑنے لگی۔ جسموں کے ملن کا سنگم چھتری ہوئی پرچھائیوں کی اوٹ میں گم تھا۔ وہاں تو صرف لیزر بیم کی چھٹکتی روشنی میں کوئی مخصوص عضو روشن ہوا اٹھتے تھے۔ کون سا عضو کس کا تھا، اسے دیکھنے کا ہوش کسے تھا۔

میرا شوہر شروع سے شہوت پرست اور حسن کا پرستار تھا۔ لیکن ہماری شادی شدہ زندگی میں جب چنگاریاں سرد پڑنے لگیں تو ایک دن، شام کی ملگجی روشنی میں اس نے سرگوشی سے میرا دل ٹٹولتے ہوئے کہا تھا۔ جان من! میں ایک ایسی جگہ جانتا ہوں جہاں جانے سے ہماری ازواجی زندگی کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔''

میں اپنی پوری شدت سے اُسے اُس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے منع کرتی رہی...

لیکن مجھے معلوم تھا۔ وہ ایک بار کسی چیز کی ضد پکڑ لے تو اسے منع کرنا بہت ہی مشکل کام ہوجاتا تھا۔

مجھے جس بات کا سب سے زیادہ ڈر تھا، آخر وہی ہوا۔ دھیرے دھیرے اس نے احساس محرومی میں مبتلا ہوکر بہت زیادہ شراب نوشی کرنی شروع کردی۔ رات میں گھر دیر سے آنے لگا۔ ہر وقت اس کا موڈ اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا۔

مجھے طرح طرح سے، اس نے یہ باور کرانے کی کوشش کرنی شروع کردی کہ ''وہ سہی'' ہے اور میں اس کی بات مان لوں...، آخر ایک دن اس کی ضد کے آگے میں جھک گئی۔ کیونکہ، میں اسے زیادہ دنوں تک روٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آخر کار، ایک دن جب میں اچھے موڈ میں تھی تو میں نے اُس کے لیے ''حامی'' بھرلی۔

وہ خوشی سے ناچ اُٹھا۔ اُس کے دل کی مراد پوری ہوگئی تھی۔

وہ مجھے اُس پُراسرار جگہ پر لے گیا۔

وہ جگہ کیا تھی، ایک خفیہ کلب تھا۔ جہاں زوج کی ادلا بدلی ہوتی تھی۔ اصل میں، وہ کلب کثیر جنسی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ کھمبے کے ساتھ ریشم کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور وہ مست ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ نسائی ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کے لمس سے اس کی گردن، پیٹھ اور پہلوؤں میں متواتر سہرن سے دوڑ جاتی تھی۔ یہ جسم وجاں کے اندر موجود مثبت حیوانی توانائیوں کو ہوا دے کر اسے تسخیر کرنے کا عمل تھا۔ جسے عرف عام میں کالا جادو جگانے کے عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اوّل اوّل مرد وزن خوشنما پوشاکوں میں ملبوس یہاں وہاں گھوم ٹہل رہے تھے۔لیکن جوں جوں موسیقی کی دھن میں تیزی آتی گئی، ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز ہوتے چلے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، مادر زاد انسانوں کا وہاں ایک جمگھٹا سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ سب کسی اور ہی دُنیا سے آئے ہوئے دُم کٹے جانور معلوم ہوتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ عریانیت کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔جب خدا، گوڈ اور ایشور نے ہمیں اسی روپ میں بنایا ہے تو پھر اس پر سے یہ آورن کیوں اوڑھا جائے۔ ننگے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔جب ہم دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں تو ہمارے اندر منفی توانائی پیدا ہوتی ہے جس کا انخلا ضروری ہے۔اس طرح سے آزادانہ رہ کر ہم جس استری سے جی چاہے سنبھوگ کر سکتے ہیں۔بشرطیکہ وہ استری بھی آپ کے اندر کشش محسوس کرتی ہو۔

اس عمل سے ہمارے اندر مثبت توانائی پیدا ہوتی ہے اور وقفے وقفے سے بطن اور دماغ میں مجتمع ہونے والی منفی توانائیوں سے ہمیں نجات ملتی ہے۔ہم برے خیالات سے بچتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ایشور ہمیں ایسے روپ میں زیادہ پسند کرتا ہے۔ہاں! جس کے اندر شہوانی جذبات کو مہیج نہ ملتی ہو وہ شانت رہ سکتا ہے۔اسے اسی میں آنند آتا ہے لیکن جس کی ترشنا جتنی تیز ہوتی ہے، وہ ترپتی کے لئے اتنا ہی زیادہ پریاس کرتا ہے۔یہ فطری بات ہے۔آپ پیاسے گھوڑے کو پانی پینے سے روک تو سکتے ہیں لیکن جس گھوڑے کو پیاس ہی نہ لگی ہو اُسے آپ زبردستی پانی نہیں پلا سکتے۔اسی طرح آپ کسی بھی کام کو زبردستی نہیں کر سکتے۔اگر روچی نہ ہو تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لینے ہی میں بھلائی ہے۔

میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

اس وقت میری عمر چھیالیس سال کی ہو چکی تھی۔لیکن میرے شوہر کی بھوک تھی کہ اس کی عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی، اس کی شہوانی خواہشات مزید جوان ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے بناؤ سنگھار کر کے کلب لے جاتا۔میرے گورے گورے انگوں میں ایک قدرتی کساؤ برقرار تھا اور میرے جوبن کے اُبھار بھی ماند نہیں پڑے تھے۔لیکن اندر سے میں خود کو کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔میں اپنے شوہر کی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھی جس سے کہ وہ خوش رہے۔ مجھے غیر مردوں کے ہاتھوں میں جھولنے، ان کی بانہوں میں مچلنے اور اپنے ہونٹوں کے زوایے میں ان کی زبان کی پھسلن محسوس کرنے میں کچھ مزہ نہیں آتا تھا۔لیکن جب اپنے شوہر کے سامنے دوسرا مرد آپ کے وجود کو جھنجھوڑتا ہے تو یقیناً آپ کے اپنے مرد کے اندر رقابت اور حسد کا ایک شعلہ سا لپک اٹھتا ہے اور وہ اس کی تپش میں جھلس کر اپنے اندر کی گرمی دوسری عورتوں کے اندر جا کر ٹھنڈا کرتا ہے۔ یہ شعلوں سے کھیلنے کا ایک غیر فطری عمل ہے۔لیکن یہی کام میرے شوہر کے اندر ہر بار جینے کی ایک نئی امنگ پیدا کر دیتا تھا۔کئی ماہ تک آنکھ مچولی کا یہ سفلی کھیل چلتا رہا۔اس کے اندر تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہماری ازدواجی زندگی میں ایک ایسا بھی موڑ آیا جب مجھے اس کی خوشی سے نفرت اور چڑھ سی ہونے لگی۔

دراصل، وہ نیا نیا امیر ہوا تھا اور اپنی اسی امارت کے گھمنڈ میں دُنیا کی حسین ترین دوشیزاؤں کو اپنے بستر کی زینت بنا رہا تھا۔اس کا دل ہر پل کسی ایسی الھڑ اور البیلی حسینہ کو ڈھونڈتا جو اس کے پہلوؤں کو ہر وقت گرم کرتی رہے، ----- اُس کا ماننا تھا کہ آج جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ سب اس کی نجی محنت کا ثمرہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرا شوہر بہت لکی تھا۔اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ریئل اسٹیٹ کا کاروبار شروع کیا تھا۔اسے دن دوگنی رات چوگنی ترقی ملی۔گویا کوئی پارس پتھر اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایمپائر کھڑے کر لیے، فارم ہاؤس خرید لیے اور شہر کے گرد و نواح میں کئی ہوٹلیں کھول لیں۔ ہر ہوٹل میں باربی کیو اور ڈانس فلور بنوا رکھے تھے جہاں نوجواں جوڑیاں ڈنر سے پہلے بھوک بڑھانے کے لیے ڈانس کیا کرتے تھے۔کبھی کبھی میں اپنے شوہر کے ساتھ جاتی تو ان کا دل رکھنے کی خاطر میں بھی کچھ اسٹیپس کر لیا کرتی تھی۔وہ مزید ضد کرتا لیکن میں زیادہ ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔

میری شادی جب ہوئی میں سولہویں سال کے میٹھے شباب کے دور سے گزر رہی تھی۔ جب بالی عمر کی لڑکیاں سپنوں میں اپنے شہزادے کو گھوڑے پر آتا ہوا دیکھتی ہیں۔مہوئے کے رس سے جب انگ انگ مہک رہا ہوتا ہے اور درد کے میٹھے چبھن سے سارا جسم ٹوٹ رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں من کرتا ہے کہ کوئی آپ کو ٹوٹ کر چاہے، کوئی پیار کرے اور کوئی آپ پر اپنی جان نثار کرے۔ میں بھی چاہتی تھی کہ میں ایسے سپنوں کے راجکمار کے ہاتھوں میں اپنے حسن کے خزانے سونپ کر اس کی بانہوں میں سکھ چین کی بانسری بجاتی ہوئی عمر بسر کر دوں۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جب میری شادی ہوئی۔میری شوہر کی عمر بیس سال تھی۔اس کے ہاتھوں میں اپنا کوئی کاروبار نہیں تھا۔وہ اپنے مالدار بھائی کا شافر تھا۔بھائی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔وہ پیر و فقیر اور درگاہوں کی خاک چھان کر تھک چکے تھے۔تبھی انھیں کسی نے مشورہ دیا کہ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کر دو شاید اس کی قسمت سے اولاد کا سکھ نصیب ہو جائے۔ میرے شوہر کے ماں باپ بچپن میں ہی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ وہ یتیم تھا۔ میں بیاہ کر آئی۔ گھر میں پھول جیسے دو بچے ہوئے۔ بڑے لاڈ پیار سے ان کی پرورش ہوئی۔ بڑے ہوئے، پڑھنے کے لیے یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔تعلیم مکمل کی ملازمت ملی پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

ایک دن میرے شوہر نے اداسی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

اتنی کم عمر میں شادی ہوئی۔کیسے بچے ہوئے۔کب پلے بڑھے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔شادی تو گڈے گڑیے کا کھیل ہو گیا۔جب تک سمجھ میں آیا کہ شادی کیا ہوتی ہے، کیوں ہوتی ہے اور زندگی کا لطف کیسے لیتے ہیں۔تب تک پُل کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔اس کا خیال تھا کہ یہ زندگی نہ ملے گی دوبارہ! وہ اسے کھل کر اپنی پوری قوت سے جینا چاہتا تھا۔

اُس نے کہا تھا۔

میں ایک خود ساختہ انسان ہوں۔ میں سڑک سے اُٹھ کر یہاں تک پہنچا ہوں، جہاں دُنیا کی عظیم الشان چیزوں تک آج میری رسائی ممکن ہے۔ انھیں میں جب چاہوں حاصل کرسکتا ہوں۔ آج گلوبل گاؤں کا تصور عام ہو چکا ہے۔ آج کوئی بھی شخص دُنیا کی کسی بھی حسینہ کو جب چاہے اپنے بستر کی زینت بنا سکتا ہے۔ یہ سب ہم نے اپنے عزیز ترین جذباتی رشتوں کو کھو کر حاصل کیا ہے۔ اس مشینی دور میں اپنے سچے اور معصوم جذبات کا ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہے۔

تم جانتی ہو، میں ایک مابعد جدید انسان ہوں۔ میں ان سب چیزوں سے کسی بھی قیمت پر تیاگ نہیں لے سکتا۔ میں سنیاسی بن کر جینا نہیں چاہتا۔ یہ زندگی صرف ایک بار ہی ملی ہے۔ میں اس سے لطف اُٹھانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جنسی تشنگی کو تہہ دامن دبا کے مہاپرش اور مہاتما بننے کا آڈمبر نہیں رچا سکتا.....

میرے شوہر کے دماغ میں ازدواجی زندگی سے متعلق ایک تشنگی سی گھر کر گئی تھی۔ بس، یہی فتنہ سا خیال تھا۔ جس کے انکورنے کے بعد کونپلیں متواتر پھوٹتی رہیں اور پھر ایک دن، وہ ایک پورا تناور درخت بن گیا۔ اس کی بوالہوسی نے کسی برگد کی جڑوں کی طرح سے اپنے شاخسانے چاروں طرف پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے اب وہ ایک جگادری درخت بن چکا تھا۔

ہاں! وہی شجر ممنوعہ۔

اس شجر ممنوعہ کی جڑوں سے لگا ایک گہرا کنواں بھی تھا جسے دیکھ کے ڈر لگتا تھا۔ مگر اس درخت کے پھل نے مجھے اوّل اوّل ایسا مدہوش کیا کہ اس کی سرشاری میں میرے حواس ٹھکانے نہ رہے اور جب ہوش آیا تو میری دنیا پوری طرح سے اُجڑ چکی تھی۔

وہ کالی بھوجنگ تھی۔ جیسے کوئی کوؤں کی پری!

اُس کی بوٹی بوٹی چمکتی تھی، کسی ناگن کی طرح۔ ایک بار جو اُسے آنکھیں بھر کے دیکھ لیتا مجال نہیں کہ اس کی نگاہیں اس پر سے دم کو بھی ہٹ جائیں۔ یہ سچ ہے کہ اس کے اندر بلا کی کشش تھی۔

میرا شوہر اُس پر لٹو تھا۔ اسے ایسی پُرکشش عورتیں بڑی مرغوب تھیں۔ لیکن اس کے اندر اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ انھیں اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ وہ انھیں مخاطب کرنے سے ڈرتا تھا۔ کیوں کہ وہ ہکلاتا تھا۔ تبھی اسے اس کلب کا پتہ چلا تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنے منصوبے کے مطابق مجھے شیشے میں ڈھال لیا تھا۔

اس نے جھوٹ کہا تھا۔

''ازدواج کی عارضی ادلا بدلی سے فرسودہ رشتے میں نئی بہار آجاتی ہے جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

لیکن ------ جب کبھی سوچتی ہوں تو لگتا ہے۔

اس نے سچ ہی کہا تھا۔

''محبت کے بوسیدہ شجر میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

ہاں! کونپلیں تو پھوٹیں اور خوب پھوٹیں لیکن یہ اور بات ہے کہ اس کے ساتھ ہی میری قسمت بھی پھوٹ گئی۔

وہ میرے سامنے اس کلجگ کی گوپیوں سے پینگیں بڑھاتا رہا اور میں گم صم بنی اپنی آنکھوں سے یہ سب تماشہ دیکھتی رہی۔ بھانت بھانت کے رنگ روپ کے مرد وزن جب ایک دوسرے میں پیوست ہوتے تو آدم زادوں کا ایک ایسا ہیولہ تیار ہو جاتا تھا، جو اپنے آپ میں کسی شجر ممنوعہ سے کم نہ تھا۔ اس پر مستزاد، وہ لمبی سیاہ زلفوں والی ڈائن تھی جو مردوں کے ہاتھوں میں شراب سے لبریز کسی پیمانے کی طرح گردش کرتی رہتی۔ حتیٰ کہ اس کے گرد مردوں کی لام لگ جاتی اور وہ سب اکٹھے اسے اپنے گرم گرم ہونٹوں سے چومتے تھے۔

اِدھر میں اپنے ہاتھوں سے اپنے نصیبوں کو رو پیٹ کر بیٹھ چکی تھی۔ میری حیثیت اُس چوسی ہوئی آم کی گٹھلی کی مانند ہو چکی تھی جو آدم زادوں کی ٹھوکروں کی زد پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر جا کر گر پڑتی ہے۔ جسے گدھے بھی سونگھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔

میرا شوہر بھی بہت بڑا گدھا تھا۔ اس کا سر گدھے ہی جیسا لمبا تھا جسے وہ سنبھال کر اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ جب اسے عشق کا دورہ پڑتا تو ڈھینچو ڈھینچو کرتا ہوا، سرعام اپنی سنک پوری کرنا شروع کر دیتا تھا۔

ایسے ہی کسی افسردگی کے اداس لمحوں میں میرے شوہر کے بڑے بھائی نے مجھے شہر کے سب سے قدیم سینے گاج کے ایک ربّی سے ملاقات کروائی تھی۔ میری دردبھری داستان سننے کے بعد اُس نے مجھے توریت کا ایک واقعہ سنایا تھا۔

انھوں نے کہا تھا۔

آدم جب جنت میں اپنے اکیلے پن سے گھبرانے لگے تو خدا نے ان کی دل جوئی کے لیے آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا۔ ایک ساتھی مل جانے کے بعد آدم اور حوا جنت میں خوب شاداں وفرحاں رہنے لگے۔ تبھی للت جس کی شکل عورت کی تھی مگر اس کا بدن سانپ کا تھا۔ اُسے یہ سب دیکھ کے برداشت نہ ہوا۔ کیونکہ وہ جنت میں اس وقت سے موجود تھی جب حوّا کا وہاں وجود بھی نہ تھا۔ دراصل، حوّا وہاں بعد میں آئی تھی اور للت وہاں پہلے سے رہ رہی تھی۔ ایک دوسری عورت کو دیکھ کے للت کے اندر جلاپا شروع ہو گیا۔ اس نے آدم اور حوّا کے خلاف ایک سازش رچی اور باغِ بہشت کے ایک خاص شجر ممنوعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ کیا بات ہوئی کہ جنت کا جو سب سے بہترین پھل ہے، بھلا اسے ہی کھانے سے منع کر دیا گیا ہے۔

دیکھو حوّا! تم یہ پھل ضرور کھانا۔ اس جیسا جنت میں کوئی دوسرا پھل نہیں ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ حوّا اپنی فطری معصومیت کی وجہ سے سازش کا شکار ہو گئیں۔ جنت کا پھل چکھتے ہی ان کی شرمگاہیں عیاں ہو گئیں اور پھل کھا لینے کی

باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ کیجیے

آٹھواں دروازہ

رومانہ رومی

(کراچی)

کہانی اپنے کلائمکس کی جانب بڑھ رہی تھی، لکھتے لکھتے میری انگلیوں میں درد ہونے لگا تھا میں نے ایک ہلکی سی انگڑائی لی کہ اچانک کسی نے میرے ہاتھوں سے قلم لے کر اُسے احتیاط سے میز پر رکھے قلم دان میں رکھ دیا۔اس سے پہلے کے میں اُن ہاتھوں پر اپنی توجہ مبذول کرتی اچانک تیز ہوا کے جھونکے نے میز پر رکھی میری کہانی کے صفحوں کو کمرے میں بکھیرنے کی کوشش کی میں نے جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ کاغذ پر رکھا اور کوئی وزنی سی شے اُن کاغذوں پر رکھنے کے لیے نظریں دوڑائیں کہ اچانک کسی نے کرسٹل کا پیپر ویٹ چپکے سے میری کہانی پر دھر دیا۔میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر کمرے میں سوائے میرے اپنے وجود کے کوئی اور نہ تھا میں عجیب سی شش و پنج میں تھی کہ یکدم اُس کرسٹل کے پیپر ویٹ میں سے روشنی سی نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرا پورا کمرا اُس صاف شفاف روشنی میں نہا گیا۔

کچھ دیر بعد جب اُس کی چکا چوند تھوڑی ماند پڑی تو میں نے غور سے اُس پیپر ویٹ کو دیکھا میں حیران تھی کہ آخر اُس بے جان سے پیپر ویٹ میں روشنی کا یہ سوت کہاں سے پھوٹا تھا مگر مجھے اُس میں کچھ نظر نہیں آیا۔اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچتی اچانک اُس میں کچھ حرکت محسوس ہوئی اور پھر غیر متوقع طور پر اس کے اندر سے ایک نازک اور حسین سا ہاتھ باہر نکلا اور میرا دایاں ہاتھ تھام کر مجھے پیپر ویٹ کے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔میں نے گھبرا کر خود کو اُس سے آزاد کرانے کی کوشش کی مگر بظاہر کمزور نظر آنے والے اُس نازک سے ہاتھ میں بلا کی طاقت تھی اور پھر میں اُس کی اس طاقت کے آگے ہارتی چلی گئی۔پیپر ویٹ کے اندر آنے کے بعد میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باہر سے وہ جتنا روشن اور شفاف تھا اندر سے بھی وہ ویسا ہی خوبصورت اور لاجواب تھا۔میں نے خوف اور حیرانگی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اپنے حواس کو مجتمع کر کے وہاں سے باہر جانے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنے لگی۔میں نے مدد کے لیے آوازیں لگائیں مگر جواب میں مجھے اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سنائی دی۔ اُس پیپر ویٹ کے اندر ایک ہال نما کمرا تھا جو ایک دائرے کی شکل میں تھا اور اس دائرے میں سات دروازے بنے ہوئے تھے جو سب کے سب ایک جیسے تھے، میں سوچنے لگی کہ آخر اس میں وہ کون سا دروازہ ہے جو مجھے پھر سے میری دنیا میں لے جائے گا۔سب ہی دروازوں کے سائز اور بناوٹ ایک جیسی تھی اگرچہ وہ سب ہی کرسٹل کے تھے مگر اُن کے دوسری جانب دیکھنا ناممکن تھا۔میں نے باری باری سب دروازوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے پہلا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی مگر یہاں تو چاروں جانب گھُپ اندھیرا تھا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، اس سے پہلے کہ میں کچھ دیکھ یا سمجھ پاتی اچانک گرم اور تیز ہوا کے جھکڑ نے مجھے آلیا اور تپتے ہوئے ریت کے باریک ذرّات میرے چہرے سے ٹکرانے لگے میں نے ان سے بچنے کے لیے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور اندازے سے آگے بڑھتی چلی گئی کہ شاید یہی میری نجات کا راستہ ہو، اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں اوندھے منہ جا گری۔۔۔مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا میں نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے اِردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر یہ کیا؟۔۔۔یہ تو شاید کوئی چھوٹی سی قبر تھی، میں نے مزید تصدیق کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اُفوہ! یہاں تو چاروں جانب چھوٹی چھوٹی قبروں کا ایک پورا قبرستان آباد تھا، میں ڈر گئی اور خوف سے کانپنے لگی۔۔۔ہوا کے گرم اور ریتیلے طوفان کا شور تھم چکا تھا اور اب اُس کی جگہ انگنت معصوم بچیوں کے رونے کی آوازیں میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔۔۔گرمی، حبس، آندھی، قبریں اور اب یہ معصوم بین کرتی ہوئی آوازیں۔۔۔ میں گھبرا گئی، میرے اندر کی ممتا تڑپ اُٹھی میں چلائی 'کون ہو تم سب؟۔۔خدارا خاموش ہو جاؤ۔۔۔مجھے بتاؤ۔۔۔کیا دکھ ہے تمھیں؟۔۔۔کیوں مجھے تم سب کی آوازوں میں ایک سی فریاد سنائی دے رہی ہے؟' میرا سوال سن کر فضا میں ایک لمحہ کے لیے سناٹا چھا گیا، چند لمحوں کی یہ خاموشی مجھے اندر ہی اندر دہلا رہی تھی اور پھر اُس خاموشی کو ایک ننھی سی معصوم آواز نے توڑا۔۔۔'ہم سب اس ننھی منی قبروں کے قیدی ہیں'۔۔۔میں نے ہمت کی اور پوچھا 'مگر تم سب کو کس ظالم نے ان قبروں میں بے دردی سے قید کیا ہے؟'۔۔۔ایک سسکی اُبھری 'ہمارے اپنوں نے'۔۔۔میں نے حیرت سے کہا 'اپنوں نے؟ میں سمجھی نہیں'۔۔۔وہ بولی 'ہم سب اُن گھرانوں کی بیٹیاں ہیں جہاں لڑکی کی پیدائش گھر والوں کے لیے باعثِ شرمندگی ہوتی ہے۔۔۔اور اُن سب کا ایک ہی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں زندہ درگور کر دیں۔۔۔اس طرح ہمیں اس دنیا میں آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی موت کی تاریکیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔۔۔ہم صدیوں سے یہاں قید ہیں۔۔۔ہم ہی نے تمھیں اپنی مدد کے لیے یہاں بلوایا ہے۔۔۔ہم جانتے ہیں کہ تم ایک قلم کار ہو اور قلم میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔۔۔تمھیں ہمارے لیے اور ہمارے بعد آنے والی تمام نسلوں کے لیے احتجاج کرنا ہوگا تا کہ ظلم کی یہ داستان جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے اس سے آنے والوں کو محفوظ کیا جائے'۔۔۔میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔۔۔اور پھر ہر طرف سے احتجاج۔۔۔احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔۔۔میں گھبرا کر پلٹی اور بھاگتی ہوئی دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔۔۔

باہر آ کر میں نے لمبی سی سانس لی اور اپنے حواس درست کیے میں اندر سے ابھی تک لرز رہی تھی مگر مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ بھی تلاش کرنا تھا سو پھر سے ہمت کی اور اگلے دروازے کو کھول کر اس میں داخل ہوگئی۔ یہاں

چاروں طرف ہلکی زرد روشنی سی پھیلی ہوئی تھی ابھی میری آنکھیں اُس روشنی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئی ہی تھیں کہ ایک دل خراش چیخ نے مجھے سہما کر رکھ دیا وہاں کا منظر کسی بھی سخت سے سخت دل انسان کو لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔۔۔ افوہ۔۔۔ یہاں چاروں جانب بے شمار حاملہ عورتیں زمین پر لیٹی تھیں اور دردِزہ سے گزر رہی تھیں جب کہ کچھ بچہ جن کر مر چکیں تھیں اور اب ان کے وہ بچے بھی اپنے زندگی کے آخری سانس پوری کر رہے تھے۔۔۔ میں دہشت زدہ کھڑی تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اچانک اُن میں سے ایک عورت نے چلاّ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا 'تم آئیں؟۔۔۔ کتنی دیر کر دی ہے تم نے آنے میں ہم سب کب سے تمھارا انتظار کر رہے تھے'۔۔۔ میں نے حوصلہ کیا اور ہمت کر کے پوچھا 'کون ہو تم سب۔۔۔ اور اس حالت میں بے یار و مددگار کیوں یہ درد جھیل رہی ہو؟'۔۔۔ میرا سوال سنتے ہی بیک وقت کئی سسکیاں یوں اُبھریں جیسے سب اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی ہوں۔۔۔ 'ہم سب وہ بدنصیب عورتیں ہیں جنھیں عورت ہونے کی سزا میں لوٹ کا مال سمجھ کر بے درد انسانوں نے لوٹا ہے اور پھر اپنی درندگی کا تحفہ دے کر ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔۔۔ ہم وہ ہیں جو دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے جسم اور دل پر اُٹھائے پھر رہی ہیں'۔۔۔ میں نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا 'اپنی بے بسی کا ماتم کرنے سے بہتر نہ ہوتا کہ تم سب معاشرے سے بغاوت کرتیں اور اپنے حق کے لیے احتجاج کرتیں'۔۔ میری بات سن کر وہ سب پھر زور زور سے کراہنے لگیں اور بولیں 'احتجاج۔۔۔ کس سے کرتے احتجاج۔۔۔ اُن اپنوں سے جن پر ہم اعتماد کرتے تھے اور جنھوں نے ہمارے اعتماد کا خون کیا۔۔۔ جب کہ یہ وہ مقدس رشتے تھے جو ہماری سروں پر چادر مثال تھے لیکن جب وہ ہی بھوکے بھیڑیے بن جائیں تو احتجاج کس سے؟۔۔۔ بولو کس سے؟'۔۔۔ میں اُن سب کی باتیں سُن کر کانپنے لگی اور منمناتے ہوئے بولی 'مگر تم' ابھی میرا جملہ شروع ہی ہوا تھا کہ کسی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا 'یہ کیا تم ہمیں نصیحتوں پر نصیحتیں کر رہی ہو، حالانکہ تم وہ پہلی عورت ہو جس نے ہمارے درد کو محسوس کیا ہے تمھارے ہاتھوں میں قلم ہے تمھاری ذمہ داری ہے کہ اب اس کا حق ادا کرو اور ہمارے لیے احتجاج کرو۔۔۔' اور پھر ہر جانب سے درد میں ڈوبی احتجاج۔۔۔ احتجاج۔۔۔ کی آوازیں بلند ہونے لگیں میں گھبرا گئی اور باہر کی جانب لپکی دروازے سے باہر آ کر میں نے سکون کا سانس لیا اور سوچنے لگی کہ آخر میں کس جگہ آ کر پھنس گئی ہوں یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔

میں نے دوبارہ اپنی ہمت کو یک جا کیا اور تیسرے دروازے کی جانب بڑھی۔۔ میں جیسے ہی تیسرے دروازے میں داخل ہوئی مجھے ایک عجیب سے گھٹن کا احساس ہوا، کمرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی میری آنکھیں جب اس روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو بے اختیار میرے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکل گئی، کمرے میں چاروں طرف معصوم بچیوں، جوان لڑکیوں، ادھیڑ عمر اور بوڑھی عورتوں کی لاشیں ہی لاشیں تھیں۔۔۔ کوئی رسی سے لٹکی پھانسی کی حالت میں تھی۔۔۔ تو کوئی زمین میں گردن تک دھنسی ہوئی۔۔۔ کوئی کسی تیز دھار آلے سے کٹی ہوئی تو کوئی آگ سے جلی ہوئی۔۔۔ کوئی دم توڑ چکی تھی تو کوئی اپنی زندگی کی آخری ہچکی کے انتظار میں تڑپ رہی تھی۔۔۔ یہ دل خراش منظر مجھے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔۔۔ اس سے پہلے کے میں وہاں سے بھاگتی ایک معصوم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔۔۔ 'چھوڑ دو۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔ میں بے گناہ ہو۔۔۔ مجھے کاری مت کرو۔۔۔ مجھ پر یقین کرو میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔ مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔۔۔' میں نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گئی ایک معصوم سی دس بارہ برس کی بچی کو ایک درخت کی اونچی سی شاخ سے لٹکایا ہوا تھا اور ٹھیک اُس کے نیچے آگ کا ایک دہکتا الاؤ روشن تھا رسی بہت نازک سی تھی اور کسی بھی لمحہ وہ معصوم لڑکی آگ میں گر کر جلنے والی تھی میں دہشت زدہ حالت میں اُس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک اُس نے اپنا رخ میرے جانب کیا اور بولی 'تم آ گئیں؟۔۔۔ مجھے یقین تھا تم ایک دن ضرور آؤ گی اور مجھے بچا لو گی۔۔۔ مجھے بچا لو۔۔۔ میں بے گناہ ہوں'۔۔۔ میں نے ہمت کی اور پوچھا تم سب کون ہو؟ اور یہ سب کیا ہے؟'۔۔۔ وہ بولی 'میں ایک بے بس اور مجبور لڑکی ہوں اور یہ سب بھی میرے ہی جیسی لڑکیاں اور عورتیں ہے۔۔۔ جو بے قصور اور بے بسی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں' 'مگر تم سب کے ساتھ یہ کیا ماجرا ہوا ہے؟' میں نے سوال کیا۔۔۔ وہ بولی 'ہم سب وہ ہیں جن کے اپنے ماں باپ، بھائی اُنھیں اپنی وراثتوں اور جائدادوں میں حصے نہ دینے کی غرض سے ان پر گندے اور جھوٹے الزامات لگا کر اپنی مرضی سے کوئی بھی سزا تجویز کرتے پھر لوگوں کے سامنے غیرت کا جھوٹا مکھوٹا پہن کر معاشرے میں عزت سے سر اُٹھا کر چلتے ہیں۔۔۔ ہم سب اسی طرح کے ظلم کا شکار ہوئی ہیں۔۔۔' ابھی اُس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ رسی ٹوٹ گئی اور وہ الاؤ میں جا گری میں چیخ چیخ کر رونے لگی، میں اُسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائی تھی ابھی میں اِس صدمہ میں تھی کہ الاؤ سے اُس کی آواز آئی۔۔۔ 'نہیں۔۔ نہیں۔۔۔ تمھیں ہمارے لیے رونا نہیں ہے۔۔۔ بلکہ ہماری مدد کرنا ہے اُٹھو اور ہمارے لیے احتجاج کرو۔۔۔ اس ظلم کے خلاف آواز اُٹھاؤ۔۔۔ تم بہت مضبوط اور طاقت ور ہو۔۔۔ تمھارے پاس علم کی روشنی ہی نہیں بلکہ قلم کی طاقت بھی ہے۔۔۔ تمھیں ہمارے لیے لڑنا ہوگا۔۔۔ احتجاج کرنا ہوگا' اور پھر ہر طرف احتجاج احتجاج کی صدائیں بلند ہونے لگی میں نے دوڑ لگائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میں نے اپنے منتشر اعصاب کو یکجا کیا اور چوتھے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔۔۔ اب میں ذہنی طور پر تیار تھی کہ یہاں بھی مجھے کوئی غیر معمولی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن چوں کہ مجھے واپسی کے راستے کی تلاش تھی سو مجھے خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔۔۔ میں چوتھے دروازے سے جیسے ہی اندر داخل ہوئی، یہ ایک نہایت خوبصورت، روشن اور شاندار کمرہ تھا اس کی سجاوٹ اور آرائش آنکھوں کو خیرہ کیے جا رہی تھی ابھی میں اس راز کو سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ

اچانک میری نگاہ کمرے کے کونوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بنے ان ستونوں پر جا ٹھہری جو تھے تو کمرے کی بناوٹ اور سجاوٹ کی طرح خوبصورت مگر ہر ایک ستون میں ایک چھوٹی سی مضبوط سلاخوں والی کھڑکی تھی اور ہر کھڑکی کے پیچھے سے ایک خوبصورت چہرہ مجھے گھور رہا تھا میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا' کون ہو تم سب اور یہاں اس طرح کیوں قید ہو؟' ایک آہ ابھری' ہم سب محبت کرنے کے جرم میں یہاں قید کئے گئے ہیں'۔۔۔'کیا؟ میں سمجھی نہیں'۔۔۔میں نے حیرت سے پوچھا۔۔۔'تم نہیں سمجھیں حیرت ہے!۔۔۔تم ایک لکھاری ہو اور محبت جیسے لطیف جذبے کو تم نہ سمجھ پاؤ یہ ناممکن ہے'۔۔۔ان سب کے چہروں پر بیک وقت میرے لیے افسوس اور تعجب کے جذبات نظر آنے لگے میں گھبرا گئی اور بولی' مجھے معاف کرنا میں تم سب کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ پائی۔۔۔ذرا وضاحت کر دو تو عنایت ہوگی'۔۔۔سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ان میں سے ایک گویا ہوئی' ہم سب تاریخ کے وہ کردار ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دور میں روایات سے بغاوت کی، سماج کی جھوٹی رسم ورواج کو توڑنے کی کوشش کی اور کسی ذات پات کے فرق یا غریب امیر کے امتیاز کو پسِ پشت ڈال کر اپنے سے کم رتبہ مالی لحاظ سے کمزور انسانوں کو زندگی گزارنے کے لیے اپنا ساتھی چُنا ۔۔۔بس پھر کیا تھا قبیلوں، ذاتوں اور مذاہب میں بانٹنے والوں اور خود ساختہ معیارِ زندگی کو دولت کے ترازو میں تولنے والوں نے ہماری خواہشات کا قتلِ عام کیا اور یوں ہم سب زندہ دیواروں میں چنوا دی گئیں۔۔۔اور اب ہم صدیوں سے اپنی رہائی کے انتظار میں ہیں۔۔۔کہ کوئی آئے اور ہماری اس قید کو ختم کروا دے۔۔۔'میں تعجب سے ان کی باتیں سن رہی تھی جب وہ خاموش ہوئیں تو میں نے پوچھا' کیا تم سب نے مل کر کبھی اپنی رہائی کی خود بھی کوئی کوشش کی؟ ۔۔۔آخر تم سب یہاں کس کے انتظار میں ہو؟۔۔۔کیوں کہ جو انسان اپنی مدد آپ نہیں کرتا کوئی اور اُس کی مدد کیسے کر سکتا ہے۔۔۔'وہ حسرت سے بولیں' تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔مگر ہم سب مجبور ہیں۔۔۔اور اسی لیے تم کو بلوایا گیا ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ تمھارے ہاتھ ہمارے طرح خالی نہیں بلکہ اُن میں قلم کی صورت میں ایک طاقت ور ہتھیار ہے جو کسی بھی قوم کی قسمت بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔تمھیں اب ہم سب کے لیے قلم اُٹھانا ہوگا تمھیں ہمارے حق کے لیے لڑنا ہوگا، ہمارے دُکھوں کو سب کے سامنے بیان کرنا ہوگا۔۔۔اور ہمیں اس زمین پر اپنے حق کے ساتھ اپنی مرضی سے جینے کا حق دلانا ہوگا۔۔۔ہمارے لیے اب تم ہی روشنی کی وُہ کرن ہو جو ہم جیسوں کو ایک زندہ روح وجسم والا انسان ثابت کرنے کا حوصلہ اور ہمت رکھتی ہو۔خدا کے لیے ہمیں معاشرے کے خود ساختہ غیرت مندوں کی بھینٹ چڑھنے سے روک لو۔۔۔احتجاج کرو۔۔۔دل سے ۔۔۔زبان سے۔۔۔ارادوں سے اور سب سے زیادہ قلم سے۔۔۔یہ سب تم کر سکتی ہوں۔۔۔تم ہی ہم سب کی آخری اُمید ہو۔۔۔'اُس کی بات پوری ہوتے ہی کمرے کی فضا احتجاج احتجاج کے نعروں سے گونج اُٹھی۔۔۔میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو چکی تھی میرے اعصاب تھک چکے تھے میں نے کمرے سے باہر چھلانگ لگائی۔۔۔میں ایک عجیب وغریب صورتِ حال کا شکار ہو چکی تھی میں ہر دروازے کو اس اُمید کے ساتھ کھولتی کہ مجھے باہر کا راستہ دکھائی دے گا مگر ہر بار ایک نئی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مجھ میں مزید جھٹکے سہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔۔۔غم۔۔۔صدمے۔۔۔غصے۔۔۔بے بسی۔۔۔اور لاچاری کی کیفیات اب مجھ پر حاوی ہونے لگی تھی۔۔۔لیکن یہاں سے جلد از جلد نکل بھاگنے کی خواہش بھی اپنی جگہ موجود تھی۔۔۔خود کو نیا حوصلہ دیتے ہوئے میں نے اگلے دروازے کی جانب رخ کیا اور سہمے سہمے قدموں سے اندر داخل ہوگئی۔۔۔

اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں روشنی کی چکاچوند سے دھندلا گئی اور جب ذرا دیکھنے کے قابل ہوئی تو میں اور پریشان ہو گئی یہاں تو پہلے چار دروازوں سے زیادہ الگ اور مختلف صورت حال تھی۔۔۔ہر طرف رنگ وروشنیوں کا بسیرا تھا اور خوشبُوں نے جیسے یہاں اپنا ڈیرا جما یا ہوا تھا۔۔۔چاروں طرف خوبصورت اور نازک سی تتلیوں جیسی گل بدن لڑکیاں بنی سنوری طبلے کی تھاپ پر ناچ رہی تھیں محفل اپنے عروج پر تھی۔۔۔میں حیران تھی کہ یہاں کس کو میری ضرورت ہے یہاں تو سب خوش باش لوگوں کا میلہ لگا ہوا ہے ابھی میں اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک ایک آواز نے مجھے میرے نام سے پکارا میں نے پلٹ کر حیرت سے اُس سمت دیکھا۔۔۔آخر میرے نام سے مجھے پکارنے والا اس طلسم کدہ میں کون تھا؟۔۔۔میرے داہنی طرف ایک بوڑھی سی عورت ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لیٹی تھی اور کراہ رہی تھی میں نے اُس کے قریب پہنچ کر پوچھا' کیا آپ نے مجھے میرے نام سے پکارا ہے؟'۔۔۔ایک کمزور سی آواز آئی' ہاں! میں نے ہی تمھیں پکارا ہے اور یہاں بھی میں نے ہی تمھیں بلایا ہے'۔۔۔میں نے کھوجتی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا' مجھے! مگر میں تو آپ کو جانتی ہی نہیں۔۔۔پھر آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'۔۔۔اُس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔'ہاں تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں تمھیں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔۔۔تمھارے نام اور تمھارے قلم کے چرچے اب زبان زدِ عام ہیں، کون ہے جو تمھیں نہیں جانتا۔۔۔تمھارے قلم کی سچائی نے تمام مظلوموں کو تمھارا گرویدہ بنا دیا ہے۔۔۔بس میں بھی تمھیں ایک تلخ حقیقت بتانا چاہتی ہوں۔۔۔'میں اب بھی اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی سو ہچکچاتے ہوئے پوچھا' آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ؟۔۔۔اور میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'۔۔۔چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی شاید وہ ذہن میں لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی یا سوچ رہی تھی کہ آغاز کہاں سے کرے اُس کے چہرے پر یہ دونوں کشمکش پڑھی جا سکتی تھی آخر وہ گویا ہوئی' تم نے کمرے میں داخل ہو کر جو منظر دیکھا میں بھی کبھی اسی منظر کا ایک حصہ تھی۔۔۔میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں یہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔۔۔ہاں جانتی ہوں تو بس اتنا کہ جب ہوش سنبھالا تو پاؤں میں گھنگرو دیکھے اور کانوں تک طبلے کی تھاپ پہنچتی رہی۔۔۔پھر میں بھی اس گناہ آلود زندگی کا حصہ بن گئی۔لڑکپن ختم ہوا

تو جوانی مصیبت بن گئی جس دن میری پہلی بولی لگی اُس کے بعد تو میں پھر اِس دلدل میں اور گہری اُترتی چلی گئی۔۔۔زندگی صرف ایک شخص کے نام کرنے اور گھر بسانے کا تصور بھی کبھی ہمارے قریب آتا تو ہمیں ایسی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا کہ روح تک کانپ اُٹھتی۔۔۔اور جب دوسروں کی گندگی اپنے اندر اُتارتے اُتارتے ہمارے اپنے جسموں میں کیڑے پڑ گئے اور ہم جب کسی کام کے نہ رہے تو یہاں پہنچا دیئے گئے جہاں نہ کوئی پرسانِ حال ہے اور نہ فریاد سننے والا۔۔۔ہم نے اپنی پوری زندگی دوسروں کے رحم و کرم پر بسر کی۔۔۔جذبات۔۔۔احساسات۔۔۔محبت۔۔۔رشتے ناتے۔۔۔دوست۔۔۔احباب۔۔۔یہ سب باتیں ہماری زندگی میں کبھی نہیں آئیں۔۔۔ہمارے جسموں کی کمائی کھانے والوں نے ہم سے ہمارے جینے کا حق چھین لیا۔۔۔نہ ہم کسی کی بیٹی کہلائے نہ کسی کی بیوی بنے اور نہ ہی ہمارے قدموں کے نیچے جنت ہی آئی۔۔۔ہمیں سماج کے بھوکے بھیڑیوں کی خوراک کے طور پر استعمال کر کے دولت کمانے والوں کے خلاف اب تمھیں ہی قلم اُٹھانا ہے۔۔۔بولو کرو گی نا ہم سب کے لیے احتجاج۔۔۔''اور پھر پورا کمرہ ہی ایسی بے شمار آوازوں سے گونج اُٹھا جو احتجاج احتجاج کا نعرہ لگا رہی تھیں۔میں نے یہاں سے بھی بھاگ جانے میں ہی میں عافیت جانی اور باہر نکل آئی۔۔۔میں سر پکڑ کر بیٹھتی چلی گئی کہ اب کیا ہوگا ؟میں باہر کیسے نکل پاؤں گی؟۔میں پریشان ہو چکی تھی اب دو دروازے ہی باقی بچے تھے میں نے اپنی ساری طاقت کو استعمال کرتے ہوئے اپنے حواسوں کو یکجا کیا اور چھٹے دروازے کی جانب بڑھی۔۔۔

اندر کے گھٹے گھٹے ماحول کی وجہ سے میری سانسیں رکنے لگیں۔کمرے میں چاروں طرف زردی مائل روشنی پھیلی ہوئی تھی یہاں ہر طرف نقاب پوش خواتین اکڑوں حالت میں بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں سب ہی اپنی اپنی جگہ ساکت اور خاموش تھیں۔میں کچھ حیران بھی تھی اور کچھ پریشان بھی کہ الٰہی آخر یہاں کیا ماجرا ہے ابھی میں کچھ سمجھنے کی کوشش میں ہی تھی کہ اچانک ایک برقعہ پوش خاتون زمین پر گر کر تڑپنے لگی اور باقی سب اُس سے ڈر کر دور بھاگنے لگیں میں نے صورت حال کو دیکھتے ہوئے اُس خاتون کی مدد کا فیصلہ کیا۔اُس کے قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ شدید بیمار تھی اُسے علاج کروانے کا مشورہ دینے پر وہ بولی کہ ہمارے علاقے میں عورتوں کو گھر سے باہر جانے اور کسی بھی طرح کے معاملے میں کسی نامحرم سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔۔۔میں نے حیرت سے کہا مگر تم تو شدید بیمار ہو اور دنیا کا ہر مذہب انسان کو اپنی جان کی حفاظت کا پورا حق اور پورا اختیار دیتا ہے۔۔۔کون ہے وہ جو تم سے تمھاری یہ آزادی چھیننا چاہتے ہیں۔۔۔وہ بولی ایک میں ہی کیا یہاں موجود ہر برقعہ پوش عورت اسی ظلم کا شکار ہے ہم سب سے مذہب کے نام پر ہماری آزادی، ہمارے حقوق اور ہم سے زندگی کی ساری خوبصورتی کو چھیننے والے کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے اپنے لوگ ہیں جو خود کو ہمارے وارث بتاتے ہیں اور اگر ہم میں سے کوئی اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے تو اُس کا انجام نہ صرف بھیانک ہوتا ہے بلکہ وہ دوسروں کے لیے عبرتناک بھی ہوتا ہے۔۔۔ہم آج بھی انہی پرانی روایتوں میں بندھے ہوئے ہیں اور ابھی تک ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں۔۔۔ہم نے تمھیں اس لیے ہی یہاں بلوایا ہے تاکہ تم ہم سب کے بارے میں لکھ سکو اور ہمیں اس نام نہاد قید سے رہائی دلوا سکو تمھیں ہم سب کے لیے احتجاج کرنا ہوگا۔۔۔احتجاج احتجاج۔۔۔اور میں پھر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔۔۔باہر آ کر میں نے آخری دروازے کی جانب دیکھا کیوں کہ یہی میری اُمید کی آخری کرن تھا۔۔۔

میں نے آخری دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا۔۔۔یہاں کوئی نہیں تھا ہر طرف خامشی کا راج تھا لیکن جو بات قابلِ غور تھی وہ یہ کہ یہاں چاروں جانب شیشے ہی شیشے لگے ہوئے تھے۔۔۔مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا تھا میں نے ہمت کی اور ایک شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی مگر یہ کیا میرا باقی جسم تو میرا ہی تھا مگر میرے چہرے کی جگہ ایک نوزائیدہ معصوم سی بچی کا چہرہ تھا۔۔۔مجھے یقین نہیں آیا میں گھبرا کر دوسرے شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی مگر یہاں بھی جسم میرا تھا مگر چہرہ اُس خاتون کا تھا جو حالتِ درد زہ میں مجھے ملی تھی میں نے خوف زدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور پھر۔۔۔میری آنکھ کھل گئی۔۔۔میرا لکھا ہوا افسانہ میرے ہی آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔۔۔میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کافی گہری سوچ کے بعد فیصلہ کیا کہ مردوں کے اس معاشرے میں میرا احتجاج کہیں مجھے بھی کسی داستان میں نہ بدل دے۔۔۔اور کہیں اس عبرت کدہ میں آٹھویں دروازے کا اضافہ نہ ہو جائے۔۔۔میں نے ڈر کے مارے اپنا افسانہ اُٹھایا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔۔۔

''درہم برہم تصویریں''

ٹوٹے پھوٹے آئیں جیسے، گھٹتے گھٹتے سانس
پیروں سے چمگادڑ چمٹے، سر پر کھڑکیں بانس
جھاڑو جھاڑن موج منائیں، ان کا اپنا راج
پپا بیٹھا ڈھول بجائے، کتھک ناچے چھاج
درہم برہم سب تصویریں، طرفہ تر احوال
مرزا غالبؔ اُلٹے لٹکیں، سجدے میں اقبالؔ
اُڑتی پھرتی جھاڑی پکڑے لوگوں کی شلوار
جب تک وہ شلوار چھڑائیں، رخصت ہو دستار

(نذیر احمد شیخ)

''شہادت کی راہ''

غالب عرفان
(کراچی)

لشکرِ شعور و فکر کا جب صف بہ صف ہوا
آگاہیوں کا شہر ہمیشہ ہدف ہوا

سر ہو گیا قلم تو شہادت کی راہ میں
ہونٹوں پہ رُک کے دم، لہو آ لود کف ہوا

قربانیوں کی راہ میں جہاں خون بہہ گیا
تاریخ میں وہ شہر ہی شہرِ نجف ہو ا

پانی میں زندہ رہ کے بناتا گیا گہر
ذرّہ جو ریت کا بھی اسیرِ صدف ہوا

تہذیبِ ربط و ضبط کے معنی بدل گئے
ایثار، زندگی سے جو بالکل حذف ہوا

ہو جائے پل میں زیر و زبر نظمِ کائنات
طوفان کا جو رخ کبھی میری طرف ہوا

منصف نے فیصلہ جو کیا ثبوت پر
اک جرم بے گناہی سزا کا ہدف ہوا

حل کر گیا ہے میری نواؤں میں تشنگی
بکھری ساعتوں کا جو مجھ کو شرف ہوا

صحرا میں نغمگی کو نیا روپ دے گیا
خاموشیوں میں ہاتھ جو مصروفِ دف ہوا

لمحات روز و شب کے تقاضے بدل گئے
عرفانِ زندگی جو کہیں سر بکف ہوا

○

غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور، بھارت)

جو تجھ جیسا کوئی داتا نہ دیکھا
تو ہم نے اور دروازہ نہ دیکھا

کسی نے اُس کو در پردہ نہ دیکھا
وہ جیسا ہے اُسے ویسا نہ دیکھا

ہمارا جاگنا اکثر ہوا ہے
کہ جب تک صبح کا تارا نہ دیکھا

نکلنا بچ کے اس کا دیکھتے تم
مری کشتی نے پھر دریا نہ دیکھا

سراب ایسا نظر کو میری بھایا
کہ قدموں کے تلے صحرا نہ دیکھا

تکلّف ہوتا مجھ کو دیکھنے میں
دکھایا تو نے تو کیا کیا نہ دیکھا

بہت غوطے لگائے ہم نے راہیؔ
سمندر کو بھی گہرا نہ دیکھا

○

انتظار باقی

(جھنگ)

ہم حقیقت ہیں یا خیال سے ہیں
ایک سائے کے خدّ وخال سے ہیں

داستانِ سفر تھکن خور دہ
اور الفاظ بھی نڈھال سے ہیں

باندھ لیتے ہیں تار کرنوں کے
چارسُو روشنی کے جال سے ہیں

خود کو دیکھے ہوئے زماں گزرے
آئنوں میں عجب بال سے ہیں

بھولا بسرا ہُوا کوئی قصّہ
ہم گئے وقت کی مثال سے ہیں

نقل و حرکت عجیب جاری ہے
چارسُو رنج و غم فعال سے ہیں

تربتِ یار کے فصیح کتبے
اپنے ابلاغ میں محال سے ہیں

ریشہ ریشہ ہیں داستان کے لفظ
حل طلب سینکڑوں سوال سے ہیں

گیسوئے یار کا وہ لمس ہے، یا؟
ہاتھ میں ریشمی رومال سے ہیں

ہم ہر اک جسم کے لیے باقیؔ
سرد موسم میں گرم شال سے ہیں

○

مہندر پرتاپ چاندؔ

(انبالہ، بھارت)

ہم عبث آپ سے اُمیدِ وفا کرتے ہیں
خارزاروں میں کہیں پھُول کِھلا کرتے ہیں

یوں سرِ بزم نہ تحقیر ہماری کیجیے
بے رُخی کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں!

ہم تو ناکردہ خطاؤں کو بھی کرتے ہیں قبول
ظرف والے کہاں اپنوں کو خفا کرتے ہیں؟

آپ اس جبر و تشدد پہ نہ حیراں ہوں حضور!
یہ تماشے تو شب و روز ہوا کرتے ہیں

بدسلوکی نہیں واجب کسی محنت کش سے
ان غریبوں کے بھی ارمان ہوا کرتے ہیں

اپنے اسلاف کی تہذیب کی ہے دین کہ ہم
اپنے بدخواہوں کے بھی حق میں دعا کرتے ہیں

بھُول جاتے ہیں کہ اعمال کی اپنے ہے سزا
ہر گھڑی ہم جو مقدر کا گلہ کرتے ہیں

یوں تو معمولی سی ہے بات، یہ پوچھیں کس سے؟
کیا خدا والے کبھی خوفِ خدا کرتے ہیں؟

چاندؔ! بس ہوتے ہیں شرمندۂ تعبیر وہی
جاگتی آنکھوں میں خواب ہوا کرتے ہیں

○

کوثر صدیقی

(بھوپال، بھارت)

کس احتیاط سے نکلے تھے بچ کے کانٹوں سے
نصیب میں تھے مگر زخم وہ بھی پھولوں سے

خدا کرے مرے خوابوں کی موت ہو جائے
کہاں تلک میں پھروں چھپا اپنی آنکھوں سے

نہ کر سکا میں روایت سے انحراف مگر
چراغ میں بھی جلاتا رہا چراغوں سے

شرارِ جاں کی رگوں میں لہو رواں ہے ابھی
میں نا اُمید نہیں ہوں مرے چراغوں سے

ترے نہ آنے کا ہوتا یقیں تو مر جاتے
بس اک اُمید پہ ہم جی رہے ہیں برسوں سے

پلا رہے ہیں سمندر کو پانی دریا کا
خراج مانگ رہے ہیں غریب پیاسوں سے

جوان ہو کے بھی بالغ نہ ہو سکا کوثرؔ
کوئی ذرا میں لُبھا لیتا ہے کھلونوں سے

○

سہیل غازی پوری

(کراچی)

خوشبو، بہار، رنگِ دگر سب فضول ہیں
اُس کے بغیر شام و سحر سب فضول ہیں

کوشش کے باوجود نہ دامن پہ رُک سکے
آنسو جو بن رہے ہیں گہر سب فضول ہیں

دیوانگی یہ کہنے لگی ہے جنون میں
دیوار و در، زمین، یہ گھر سب فضول ہیں

جب تک نہیں خلوص کی منزل میں جستجو
رستے کے پیچ و خم، یہ سفر سب فضول ہیں

اک سائباں ملے نہ جہاں دھوپ میں تو پھر
دیہات، شہر، قریہ، نگر سب فضول ہیں

رہ جائے گا اندھیرے اجالے میں فرق کیا
مہتاب و آفتاب اگر سب فضول ہیں

گلشن سے کچھ نہ کچھ تو غریبوں کو چاہیے
ورنہ یہ پیڑ، برگ و ثمر سب فضول ہیں

ہر شعر کے مزاج میں ابہام ہو اگر
حسنِ خیال، طرزِ ہنر سب فضول ہیں

زخمی ہوئے جو حرفِ ملائم کی ضرب سے
پھر تو سہیلؔ جان و جگر سب فضول ہیں

○

سریواستورنؔد
(نوئیڈا، بھارت)

چاند کی قندیل جلتے ہی اُجالا ہو گیا ہے
رات کے گنبد میں یادوں کا بسیرا ہوگیا ہے

خامشی کی آندھیاں باغی نظر آتی ہیں مجھکو
رات کالی ہے تو سنّاٹا بھی کالا ہوگیا ہے

اب محبت ہے، مروّت ہے، نہ اب وہ انکساری
آج کے اس دور میں ہر شخص ننگا ہو گیا ہے

قصّۂ ریگِ رواں جب آندھیوں کی زد پہ آیا
دُھند کا حیرت زدہ آسیب تنہا ہوگیا ہے

ہر قدم پر دائمی افتاد، الجھن بیکرانی
اب مزاجِ دشتِ تنہائی عجب سا ہو گیا ہے

اب تو بس تیزابیت کا ذائقہ چکھنا ہے باقی
زہر مرے جسم کا کافی پرانا ہوگیا ہے

زہر آلودہ ہوائیں رینگتی پھرتی ہیں ہر سو
میرے گھر کا راستا بھی سانپ جیسا ہوگیا ہے

راس کیوں آنے لگی ہے نیم کے پھولوں کی خوشبو
رنؔد صاحب آپ کے احساس کو کیا ہوگیا ہے

○

جاوید زیدی
(امریکہ)

قلم کی روشنائی ، خام ہوتی جا رہی ہے
سیاہی دل کی یارو عام ہوتی جا رہی ہے

سُنا ، اہل خبر پھر سے ہوئے دست و گریباں
صحافت شہر میں بدنام ہوتی جا رہی ہے

فضائے دہر میں آلودگی گھولی گئی یوں
کہ خاموشی بھی اب الزام ہوتی جا رہی ہے

جہانِ معتبر ، اہل ہوس اب محتسب ہیں
دوکانِ عاشقی نیلام ہوتی جا رہی ہے

کہاں شجرہ کروں اے بے خودی، میں بحرِ ہستی
یہاں تو بندگی بھی کام ہوتی جا رہی ہے

کوئی دشتِ وفا میں آبلہ پا پھر سے آئے
کہ اب دار و رسن بے نام ہوتی جا رہی ہے

جو آئے منبر دنیا و دیں وہ کچھ بھی کہہ دے
یہاں بے ہودگی ، اسلام ہوتی جا رہی ہے

فن شہرت ہوا کچھ اس قدر دیکھو نمایاں
کہ جنسِ اصل اب گمنام ہوتی جا رہی ہے

درِ وحشت کھُلا ایک میکدہ ہے اور شبِ غم
اے صبح زندگی یوں شام ہوتی جا رہی ہے

فرات زیست زیدیؔ تشنگی اور دشتِ ہجرت
فضیلت جذب کی تیرے نام ہوتی جا رہی ہے

○

اشرف جاوید
(لاہور)

جو اُس کو دیکھے، اُسے روح تک نہال کرے
ہزار معجزے اُس کا مگر جمال کرے

جب اُس کے شہر سے گزرے تو پھر کمال کرے
ہوا چراغوں کی خود بڑھ کے دیکھ بھال کرے

مرے بدن سے نکل آئی ہیں جڑیں اُس کی
کوئی کہاں تلک اب درد کی سنبھال کرے!

اُسے کہو! کہ کبھی شکل ہی دکھا جائے
اُسے کہو! کہ مری سانس تو بحال کرے

اُسے کہو! کہ کریں زندگی کہاں جا کر!
اُسے کہو! کسی بے گھر کا ہی خیال کرے

اُسے کہو! مجھے لوگوں میں بانٹتا نہ پھرے
اُسے کہو! مجھے ایسے نہ پایمال کرے

میں اُس کو دیکھوں، اُسے چھولوں، اُس سے بات کروں!
مگر وہ میرے ہر اِمکان کو محال کرے

خموشیوں میں تھکن اور بڑھتی جاتی ہے
اُسے کہو! کہ وہ بولے نہ یوں نڈھال کرے

اُسے کہو! کہ ادھورا ہوں، آدھا ہوں اُس بن
اُسے کہو! نہ مری زندگی وبال کرے

○

کاوش پرتاپ گڑھی
(بھارت)

وہ خوش نصیب ہے سکھ چین سے جو گھر میں رہا
تمام عمر بلا وجہ میں سفر میں رہا
کچھ ایسا کام ہی اس سے لیا تھا قدرت نے
اسی کا چرچا تھا چاروں طرف خبر میں رہا
نئے ٹھکانے کی چنتا ستا رہی ہے اسے
جو سایہ ٹھاٹ سے اب تک گھنے شجر میں رہا
کہیں نہ جمنے دیا اس نے آج تک ہم کو
وہ اک بگولہ جو ہر دم ہمارے سر میں رہا
ملی نہ کٹیا بھی پھر اپنے گھر سے نکلا کیا
محل کی چاہ میں تا عمر میں ڈگر میں رہا
مرے قیام کی مدت کہیں طویل نہ تھی
میں گاؤں گاؤں پھرا اور نگر نگر میں رہا
کسی کی محفل شادی میں جو ملا تھا کبھی
تمام عمر وہ چہرہ مری نظر میں رہا
ہر ایک بار یہی لگتا تھا کہ اب ڈوبا
ندی میں زیست کی سو مرتبہ بھنور میں رہا
وہ ذائقہ، وہ مزہ، وہ مٹھاس اب ہے کہاں
اناج میں بھی نہیں اور نہ کچھ ثمر میں رہا
میں پیش پیش تھا اس کے ہر ایک دکھ سکھ میں
مگر نہ زیر رہا اور نہ اب زبر میں رہا
ہوئے ہیں جب سے قویٰ مضمحل سرور کہاں
نہ عیب میں ہے وہ جو ہر نہ اب ہنر میں رہا

○

عرش صہبائی
(کراچی)

جو زندگی میں رہِ حق پہ چلتا رہتا ہے
وہ شخص اہل زمانہ کو کھلتا رہتاہے

یہ دل ہے اس کی بڑی معتدل ہے آب وہوا
خوشی کے ساتھ یہاں غم بھی پلتا رہتا ہے

دیارِ زندگی میں ہے غموں کی تیز ہوا
چراغ آرزو کا پھر بھی جلتا رہتا ہے

جہاں والے کیا پہچان پائیں گے اس کو
ہر ایک لمحہ وہ چہرہ بدلتا رہتا ہے

چھلکتے رہتے ہیں آنسو مری ان آنکھوں سے
دلِ حزیں میں بھی اک درد پلتا رہتا ہے

بس ایک بار سرِ انجمن یہ چھڑ جائے
کسی کا ذکر پھر تا دیر چلتا رہتا ہے

وجود اس کا کبھی ایک سا نہیں ہوتا
خیال برف کی صورت پگھلتا رہتا ہے

نہیں ہے اس کو کبھی میرِ کارواں کی تلاش
یہ کاروانِ محبت ہے چلتا رہتا ہے

کبھی جو وقت کی کرتا نہیں ہے قدر اے عرشؔ
وہ شخص زندگی بھر ہاتھ ملتا رہتاہے

○

کرامت بخاری
(لاہور)

محبت کا محل مسمار کرنا
بہت مشکل ہے دل پہ وار کرنا

اگر نفرت کی دیواریں گراؤ
مجھے بھی تم شریک کار کرنا

یہاں پر دوسری باری نہیں ہے
جو کرنا ہے وہ پہلی بار کرنا

اگر ممکن ہو دریائے محبت
بدن کشتی بنا کر پار کرنا

میں سچائی سرِ بازار کہہ لوں
خوشی سے پھر سُپرد دار کرنا

چھپایا خونِ ناحق کو ہے کس نے
عدالت یہ سرِ بازار کرنا

ازل سے چاند چہروں کی ہے عادت
کبھی چھپنا کبھی اظہار کرنا

کرامتؔ زندگانی کے سفر میں
ہمیشہ زندگی سے پیار کرنا

○

''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''

رینو بہل

(چنڈی گڑھ، بھارت)

بادلوں کے گرجنے کی آواز سن کر پریتو کمرے بُڑبُڑاتی ہوئی تیز قدموں سے باہر صحن میں آ گئی۔ آسمان کی طرف نظریں اُٹھائیں تو دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے تو موسم بالکل صاف تھا جب وہ صحن میں بیٹھ کر برتن صاف کر کے باپو جی کے کمرے میں انہیں دوائی دینے گئی تھی۔ دوائی دے کر وہ جانے لگی تو بے بے نے ہاتھ پکڑ کر پاس ہی بٹھالیا:

''کچھ دیر تُو بھی آرام کر لے سارا دن کام میں ہی لگی رہتی ہے۔''

''بے بے آرام تو اب ایک بار ہی ملے گا۔ کیا کروں تیرا پُتر بھی تو اندھیرے منہ کا نکلا ہوا ہے۔ تُو تو جانتی ہی ہے اب مزدور ملنے کتنے مشکل ہو گئے ہیں۔ ایک تو منہ کھول کھول کر مزدوری مانگتے ہیں اوپر سے شرطیں الگ۔ روٹی پانی کے علاوہ رات کو دارُو بھی چاہیے۔ اتنا کچھ انہیں دینا ہے تو اپنے لئے کیا بچتا ہے۔''

''ہمارا وقت اچھا تھا بھرا پُرا خاندان ہوتا تھا۔ ایک ساتھ کتنا ہی کام نپٹا لیتے تھے اور گاؤں میں ہی مزدور مل جاتے تھے وہ بھی ہماری شرطوں پر کام کرتے تھے''

''بے بے اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اپنے ہی گھر میں دیکھ لو۔ رب نے ایک ہی بیٹا دیا۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اُسے پڑھایا لکھایا کہ اپنے بزرگوں کی طرح ان پڑھ نہ رہ جائے مگر ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہم اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار رہے ہیں۔ جس مٹی میں وہ کھیل کُود کر جوان ہوا اب وہی مٹی سے اُس کے ہاتھ گندے ہوتے ہیں۔ کھیت سنبھالنے نہیں نوکر ملتی نہیں۔ نوکری کی تلاش میں دردر بھٹکنا منظور ہے پر اپنے کھیتوں پر کام نہیں کرنا۔ آوارہ اور نشئی لڑکوں کے ساتھ بے مقصد گھومتے رہو۔ مجھے تو ڈر ہے بے بے کہیں وہ بھی نشہ تو نہیں کرنے لگا! آج کل لچھن کچھ ٹھیک نہیں اُس کے۔'' اُس کی آواز میں مایوسی کے ساتھ ساتھ انجانا خوف بھی تھا۔

ملکیت سنگھ بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹے لیٹے ساس بہو کی باتیں سُن رہے تھے۔ ناتواں جسم میں دھڑکتا دل بھی اب بڑھاپے میں کمزور ہو گیا تھا۔ بیٹے کی مجبوری اور جوان پوتے کے بہکتے قدم سینے میں ہُوک بن کر اٹھے۔ آنکھوں کے دونوں کونوں سے بہتے پانی نے سرہانے پر اپنے نشان چھوڑ دیئے اور ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی تکیئے نے اس پانی کو اپنے اندر خاموشی سے جذب کر لیا۔

''بے بے لگتا ہے موسم خراب ہو رہا ہے'' اتنا کہہ کر وہ بنا کچھ کہے بے بے کی بات سُنے بُڑبُڑاتی ہوئی باہر آ گئی۔ کالے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے قافلہ بنا کر نہ جانے کہاں سے جھومتے جھومتے اس طرف اُمڈ آئے تھے۔ اکثر وہ ان بادلوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھتی تھی مگر آج اُسے یہ بے موقعے اور محل کے بادل خوفزدہ کر رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی رسوئی میں ہاتھ چلانے لگی اور ساتھ ہی ساتھ ارداس بھی کرتی گئی ''بابا جی مہر کرنا بس یہ بادل چُپ چاپ آنکھیں بند کئے یہاں سے نکل جائیں نہیں تو ہم لوگوں کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا'' پھر وہ دل ہی دل میں جپ جی صاحب کا پاٹھ کرنے لگی۔ کام تو وہ صحن میں بنی رسوئی میں کر رہی تھی مگر اس کی پوری توجہ آسمان میں مچلتے، اُمڈتے، گرجتے بادلوں کی طرف تھی۔ خیر خیر کر کے یہ وقت بھی ٹل ہی گیا۔ بادل آئے، گرجے ایسے جیسے دھمکا رہے ہوں، ڈرا رہے ہوں اور پھر شرارت سے مسکرا کر آگے نکل گئے۔ کھیتوں میں فصلوں کی کٹائی کرتے کسانوں کے چہرے سے خوف کے بادل بھی چھٹ گئے اور پُرسکون مسکراہٹ پھر واپس لوٹ آئی کٹائی اور تیز ہونے لگی۔

گُرنام سنگھ جب کھیتوں سے گھر لوٹا تو شام ڈھل چکی تھی۔ بے بے، پریتو اور لاڈو آنگن میں ہی بیٹھیں کچھ کام کر رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح باپو جی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے تھے۔ اسے دیکھتے ہی لاڈو باپ کے لیے پانی لینے اُٹھ کر رسوئی میں چلی گئی تو پریتو نے نلکے کے پاس ہی بالٹی میں پانی بھر کر رکھ دیا۔

مُنہ ہاتھ دھو کر پانی پی کر وہ بے بے کے پاس ہی چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھکان سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ بے بے نے پیار سے اُس کا سر سہلانا شروع کیا تو اُس کی آنکھیں خود بخود موندنے لگیں۔

''جا پریتو لاڈو کو کہہ گُرنام کے لیے لسی یا سکنجوی بنا دے''

''نہیں بے بے اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں، بس تھوڑی دیر میں کھانا کھاؤں گا۔ آج باپو کی طبیعت کیسی رہی؟''

''جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ نہ کچھ بول سکتے ہیں نہ ہل سکتے ہیں بس باتیں سُنتے رہتے ہیں اور آنسو بہاتے رہتے ہیں اپنی بے بسی پر۔ چل پہلے اُن سے چل کر مل لے، تیرا راستہ دیکھ رہے ہونگے'' بے بے اُٹھ کر اندر چل دی تو وہ بھی اُٹھ کر اُن کے پیچھے چل دیا۔

پچھلے دس مہینے سے اُس کے باپو جی نے بستر پکڑ لیا تھا۔ اس لیے پہلے تو کبھی نہ تو بیمار ہوئے اور نہ ہی کبھی ایک دن کے لیے بھی بستر پر بے وقت آرام کیا۔ اپنے کھیت اور اپنا گاؤں بس یہ ہی اُن کی زندگی تھی۔ اُن کے والد کے پاس چھ ایکڑ زمین تھی۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو یہ زمین دونوں بھائیوں میں برابر بٹ گئی۔ وہ اپنے حصّے کے تین ایکڑ زمین میں ہی خوش تھا۔ دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں ٹیوب ویل لگوا لئے تھے اور چھ مہینے گیہوں اور چھ مہینے بعد دھان کی فصل اُگائی جاتی۔ تھوڑے سے زمین کے حصّے میں آلو، پیاز، سبزیاں اور دالیں اُگا دی جاتیں۔ اس طرح گھر کی زمین سے ہی سال بھر کا راشن نکل آتا۔

گھر میں دو بھینسیں بھی بندھیں تھیں جن کا سارا کام پہلے بے بے

سنبھالتی تھی جس سے گھر کے لیے دودھ بھی نکل آتا اور کچھ بِک بھی جاتا۔ جب رجت سنگھ پیدا ہوا تو اُن کا سینہ خوشی سے اور چوڑا ہو گیا۔ اُنہیں اپنی زمینوں کا وارث مل گیا تھا۔ پوتے کی شکل دیکھتے ہی اُمیدوں نے بھی دل و دماغ میں پنپنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے رجت سنگھ عمر میں بڑھتا گیا ویسے ویسے اُن کی حسرتیں بھی بڑھتی گئیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ ایک روز وہ نہ صرف اُن کی زمین کو سنبھالے گا بلکہ اس میں اضافہ بھی کرے گا۔ اپنے باپ کا ہاتھ بٹائے گا۔ مگر جب اُس کی پڑھائی کے لیے شہر کے اخراجات گُرنام سنگھ کی پہنچ سے باہر ہو گئے تو اُس نے زمین کا ایک ٹکڑا بیچ دیا۔ اُس وقت باپو جی نے بڑے بھاری من سے اپنی رضامندی دی تھی۔ زمین بڑھنے کے بجائے جب ہاتھوں سے کھسکنے لگی اور چار ہاتھوں کی جگہ صرف دو ہاتھ ہی رہ گئے تو اُن کے دل و دماغ پر درد کا غبار چھانے لگا اور جب یہ غبار برداشت اور اُن کی ضبط سے باہر ہو گیا تو فالج نے حملہ کر کے اُنہیں اپاہج کر دیا۔ اُن کے علاج میں اُس نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قرضے کا بوجھ بھی سر پر اُٹھایا مگر صحت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

''باپو جی ٹھیک ہو؟'' اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اونچی آواز میں پوچھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ آنکھوں میں ہی مُسکرائے اسے دیکھ کر ایک چمک سی اُن کی آنکھوں میں کوندی۔ ''چنگا ہے'' انہوں نے کہا ضرور مگر اُن کی آواز اُن کے لبوں میں دب کر دم توڑ گئی اور بیٹے نے لبوں کی جنبش سے ہی اُن کا جواب پڑھ لیا۔ کچھ پل اُن کے پاس بیٹھا اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اُسے پیار سے سہلاتا رہا۔ جو سکون اُنہیں اس وقت میسر ہو رہا تھا وہ اُن کے چہرے سے صاف نمایاں تھا۔

''جا پُتر جا کر کچھ کھا پی لے۔ آرام کر لے صبح پھر تجھے جلدی نکلنا ہوگا'' بے بے نے بیٹے کا تھکا ہوا چہرا دیکھ کر اُسے آرام کرنے کو کہا۔

وہ صحن میں آ کر چارپائی پر پھیل گیا تو پریتو نے پاس آ کر پوچھا۔

''سردار جی چائے بنوا دوں یا کھانا لگوا دوں؟''

''پریتو آج تو جسم کا روم روم درد سے ٹوٹ رہا ہے۔ آج چائے کیا کام کرے گی''۔

وہ اُس کا مطلب سمجھ گئی، چُپ چاپ اُٹھی اور کمرے سے بوتل، گلاس اور پانی لے کر آ گئی۔

''لاڈو کچھ نمکین اور ایک پلیٹ میں کھیرا ٹماٹر کاٹ کے لے آ''

اُس کی آواز سُن کر وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔

''پریتو تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ آج تو بن مانگے موتی مل گئے'' بوتل دیکھ کر اُس کی ساری تھکان چھو منتر ہو گئی۔

''تمہاری بیوی ہوں۔ جانتی ہوں اس وقت تمہیں اس کی سخت ضرورت ہے۔''

وہ پاس ہی بیٹھ کر اُسے پنکھا جھلانے لگی۔ لاڈو کھانے کا سامان رکھ کر اندر چلی گئی اور وہ گلاس میں شراب اُنڈیل کر پینے لگا اور دن بھر کی رام کہانی اُسے سناتا رہا۔

''سردار جی کل تک پوری فصل کٹ جائے گی نا؟ آج تو بادلوں نے گرج کر جان ہی نکال دی تھی۔ بس واہے گُرو جی کو کی ہوئی ارداس ہی کام آئی۔ بس کل کا دن بھی نکل جائے تو لاڈو کی شادی کا انتظام ٹھیک ہو جائے گا''

''کل لاڈو کے ساتھ تُم بھی آ جانا۔ میں منگت سنگھ کو بھی کہہ کر آیا ہوں کہ تھوڑا ہاتھ میرا بھی بٹائے۔ اگر رجت ہاتھ بٹا دیتا تو لوگوں کی مدد نہیں لینی پڑتی۔ کوئی اتا پتا معلوم ہے لاڈلے کا؟''

''دو دن کے لیے کہہ کر گیا تھا پورے سات دن ہو گئے۔ کہتا تھا نوکری لے کر ہی آؤں گا۔ آگے وہ جانے یا اُوپر والا۔ آپ فکر مت کرو ہم لوگ یہ وقت بھی نکال ہی لیں گے''

''وقت تو نکل ہی جائے گا رُکے گا نہیں بس ملال اس بات کا ہے جو سہارا بیٹے کو بننا چاہیے تھا وہ فرض بیٹی نبھا رہی ہے''

''تقدیر کا لکھا کوئی مٹا تو نہیں سکتا سردار جی۔ سب باتیں چھوڑ کر بس یہ دُعا کرو کہ گیہوں ٹھیک ٹھاک منڈی میں پہنچ جائے تا کہ اچھی رقم مل جائے۔ کچھ قرضہ اُتر جائے اور لاڈو کے ہاتھ بھی پیلے ہو جائیں''

''تو ٹھیک کہتی ہے پریتو تقدیر کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ بس ہم لوگ دُعا ہی کر سکتے ہیں۔ اس بار موسم نے پورا ساتھ دیا ہے آگے بھی اسی طرح ساتھ رہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا''

''اب آپ بس کرو۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔ صبح پھر جلدی نکلنا ہوگا''

یہ کہہ کر وہ کھانا لگانے چلی گئی۔ رات وہ آرام سے سویا اور صبح سویرے اندھیرے منہ جب وہ کھیتوں پر جانے لگا تو بے بے نے کہا:

''پتر میں آج جتندر کو کہہ دوں گی تیری مدد کے لیے آ جائے گا''

''تو میری فکر نہ کر بے بے۔ تیرے بیٹے میں ابھی بھی دم ہے۔ میں نے منگت کو کہہ دیا ہے اور پھر لاڈو اور پریتو بھی آ جائیں گی۔ تو بس باپو جی کا خیال رکھ۔ میرے سر سے سارا بوجھ اپنے آپ اُتر جائے گا۔ بس باپو جی ایک بار پھر سے پہلے کی طرح چلنے پھرنے لگیں''

''رب دی مرضی اگے کسی دی نہیں چلی'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور واپس کمرے میں لوٹ آئی۔ ملکیت سنگھ ابھی بھی گہری نیند سو رہے تھے۔ شوہر کی بیماری، بیٹے کی مجبوری اور پوتے کی لاپرواہی نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا پھر بھی وہ سب سے زیادہ اپنے بیٹے کی سلامتی کی دُعائیں کرتی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اُس کے بیٹے کی تکلیفیں دُور ہو جائیں۔ اپنی پریشانی کو کبھی اُس نے پریتو، لاڈو اور گُرنام تک کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ یہ جانتی تھی کہ پیار اور لاڈ کے دو بول بھی اُن کو اس مشکل گھڑی میں نہ صرف راحت دیں گے بلکہ اُن کے حوصلے بھی بلند

کریں گے۔ جب بھی اور جتنا بھی اُس سے بن پڑتا وہ گھر کے کاموں میں ماں، بیٹی کا ہاتھ بٹانے کی کوشش ضرور کرتی۔ یہ بات اور ہے کہ وہ دونوں اُسے کسی کام کی اجازت ہی نہیں دیتی تھیں بس ایک ہی بات کہتیں:

''بے بے تُو آرام کر۔ بس باپو جی کا خیال رکھ باقی کام ہم دونوں سنبھال لیں گی''

صبح ہونے سے پہلے ہی جب گُرنام سنگھ کھیتوں کے لیے نکل گیا تو لاڈو بھی ماں کا، گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر اپنے باپو کے لیے روٹی اور لسّی لے کر کھیتوں پر پہنچ گئی۔ اُنہیں کھانا پروس کر وہ خود اُن کے ساتھ کھیتوں میں کٹائی کے کام میں ہاتھ بٹانے لگی۔

پریتو جلدی جلدی باقی گھر کے کام نپٹا کر دوپہر کا کھانا لے جانے کو تیار تھی۔ جانے سے پہلے وہ بے بے کے پاس گئی تو باپو جی سو رہے تھے اور بے بے اُن کے پاس بیٹھی کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اُنہیں پریتو کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

''بے بے سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے بے بے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ یک دم چونک اٹھی۔

''سب ٹھیک ہے پُتر بس رب ول دھیان لگ گیا سی''

''کھانا لے آواں؟ مجھے کھانا لے کر جانا ہے لاڈو اور اس کے باپو کے لیے''

''تُو جا پُتر ہماری فکر نہ کر۔ تیرے باپو جی ابھی دوائی کھا کر سوئے ہیں۔ اٹھیں گے تو انہیں کھلا کر خود بھی کھا لوں گی۔ بس آج کٹائی کا سارا کام ختم کر آنا۔ ضرورت پڑے تو جتندر کو بُلوا بھیجنا''

''بے بے فکر نہ کر۔ بس دعا کر یہ کام بھی ٹھیک ٹھاک نپٹ جائے''۔ اُس نے ایک نظر باپو جی کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔

''جا پُتر رب راکھا''

دوپہر کا کھانا کھا کر گُرنام، منکت، لاڈو نے کچھ دیر سُستانے کے بعد پھر سے کام شروع کر دیا۔ آسمان پر پھر کالے بادل آنکھ مچولی کھیلنے لگے تھے۔ پریتو بھی اُن کے ساتھ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ جیسے جیسے آسمان پر کالے بادلوں کے ٹکڑے، اُمڈتے، گرجتے نظر آتے اُن کے ہاتھوں کی رفتار اور تیز ہو جاتی۔ گرنام دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ چند پیسے بچانے کی خاطر اُس نے خود کو اور اپنے گھر کی عورتوں کو بھی تکلیف دے ڈالی۔ اگر اُس کے پاس بھی اچھی خاصی رقم ہوتی تو وہ بھی دوسرے کسانوں کی طرح فصل کی کٹائی ایک دن میں مشین سے کروا لیتا یا پھر دو مزدور ہی رکھ لیتا۔ ایک دن میں کام نپٹ جاتا تو موسم کا خطرہ ٹل جاتا۔ یہ کالے بادل تلوار کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں۔ اگر فصل بارش میں بھیگ گئی تو کام بھی بڑھ جائے گا اور دام بھی اچھے نہیں ملیں گے۔ پھر باپو جی کی دوائی، لاڈو کی شادی اور رجت کے شہر کے اخراجات کے لیے پھر سے قرضہ لینا ہوگا۔ بادل پھر گرجے تو اُس نے خیالوں کو جھٹک کر پوری توجہ کام پر لگا دی۔ بس اب تو تھوڑا سا ٹکڑا ہی رہ گیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں ارداس کرنے لگا۔

شام ہوتے ہوتے رب رب کرتے کٹائی بِنا کسی رُکاوٹ کے مکمل ہوگئی۔ سب نے چین کی سانس لی اور واہے گُرو جی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

''تم دونوں گھر چلو میں اور منکت بس تھوڑی دیر میں سب سمیٹ کر آتے ہیں۔ اب تو بادل بھی ڈرا کر نکل گئے۔ اب کوئی خوف نہیں بارش کا''

وہ دونوں روٹی کے برتن اُٹھا کر خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

سورج تو پہلے ہی بادلوں کے آنچل میں چھپ گیا تھا۔ شام کے سرمئی اندھیرے دھیرے دھیرے پیر پھیلانے لگے تھے۔ کچھ کچھ گھروں میں بتیاں بھی جل چکی تھیں۔ اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھتے ہی دونوں ٹھٹھک گئیں۔

صحن میں بچھی چارپائی اور کُرسیاں اکٹھی کر کے کونے میں پڑی تھیں اور پورے آنگن میں صفِ ماتم بچھی دیکھ کر وہ کمرے کی طرف لپکیں۔ بے بے ویسے ہی کُرسی پر خاموش بیٹھی تھیں اور باپو جی بستر پر۔ فرق اتنا تھا کہ اب بے بے نے اُن کا چہرہ بھی سفید چادر سے ڈھانپ دیا تھا جو اُسے دوپہر کو پریتو کے کھیتوں پر جانے سے پہلے ہی ڈھانپ دینا چاہیے تھا۔

بقیہ: کماش

رات گئے گاؤں میں شور وغوغا مچا کہ سپاہیوں کا ٹرک چلا آ رہا ہے۔ ماؤں کے پاس وقت نہ تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو جگانے کے لیے ان کے چہروں پر گلاسوں سے پانی پھینکا ان کے منہ پر طشت سے پانی مارا۔ نوجوانی کی نیند بڑی گہری ہوتی ہے اور میٹھی بھی۔ لیکن اس غیر شفیقانہ عمل سے وہ ہڑبڑا کر اٹھے تو ماؤں نے انہیں پہاڑوں کے رخ پر گھروں سے باہر دھکیل دیا۔ ٹرک دینار کے گھر پر آ ٹھہرا۔ دینار بھی آنکھیں ملتا باہر نکلا تو دلاور سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

''بھئی رات گئے جگانے کی معذرت چاہتا ہوں۔ مگر کمیدان صاحب کہتا ہے کہ سرکار نہیں مان رہی۔ کوئی اور طریقہ بتاؤ''

دینار اس غیر متوقع صورتحال سے ہراساں ہو کر اب سنبھل چکا تھا۔ ''ان سے کہہ دو کماش کے سامنے بیٹھنے والوں دیکھنے والوں کی آنکھیں ہی نکلوا ڈالے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری''

دلاور نے بات کو تولا۔ پھر معنی خیز انداز میں تشویش کا اظہار کیا ''مگر اتنی آنکھیں ہم کیا کریں گے؟''

دینار نے تسلی دی ''چار چار لگا لینا، ان کا کھوکھا کھول لینا''

رہائی

ڈاکٹر عمران مشتاق
(آسٹریلیا)

جینی کے لیے وہ ایک المیہ تھا۔ عُمر کے اٹھارہ سال ایک شخص کے ساتھ گُزارنے کے بعد اب وہ تہی دامن اور خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ پیٹر سے طلاق کا خیال ہی تکلیف دہ تھا اور اب وہ اُس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نِکل چُکا تھا۔ وہ تو ہاتھوں سے پھسلتی ریت ثابت ہوا تھا۔ دِل ابھی خون کے آنسو ہی رو رہا تھا کہ ماں کو دِل کے دورے نے ہسپتال تک پہنچا دیا۔ وہ سب کُچھ بھول بھال کر ممی کی خدمت میں لگ گئی۔ پاپا کو فوت ہوئے گیارہ سال گُزر چُکے تھے اور ممی تب سے اکیلے ہی رہتی تھیں۔ ممی ہمیشہ اچھی صحت والی مُتندرست خاتون تھیں۔ عُمر بھی ابھی صِرف اڑسٹھ سال ہی تھی۔ ممی ہسپتال سے واپس آئیں تو وہ بھی وقتی طور پر اُن کے ساتھ ہی شفٹ ہوگئی۔ زندگی کی تلخی کو بُھلانے کا شاید اِس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ ممی کو نہ جانے کیا روگ لگ گیا تھا کہ اُن کی صحت بہتر ہی نہ ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُنہیں جینے کی آس ہی نہ رہی ہو۔ جینی کے لیے وہ لمحات بے حد دشوار تھے۔ اب زندگی اُس سے کُچھ فیصلوں کی مُتقاضی تھی۔۔ وہ ممی کو ایسے ہی نہیں چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ اُسے کُچھ عرصہ تو لگا مگر بلا آخر وہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ اُس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پیٹر سے علیحدگی کے بعد اُن کا مشترکہ گھر اب ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے مارکیٹ میں تھا اور جیسے ہی وہ فروخت ہوتا تو جینی کو اُس کا حصہ مِل جاتا۔

ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ اُس شہر سے بھی چلے جانا چاہتی تھی جہاں اُس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے اٹھارہ سال گُزارے تھے۔ ممی کے ساتھ رہنے میں اُسے کئی فوائد نظر آئے اور سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہی تھا کہ ماضی سے فرار کا موقعہ مِل رہا تھا۔

ممی کی طبعیت کو ٹھیک ہوتے ہوتے بھی تین ماہ لگ گئے۔ ممی نے جب اپنی روٹین کے مُطابق زندگی کو بِتانا شُروع کر دیا تو پھر اُس نے بھی اپنی زندگی میں تبدیلی لانا چاہی۔ پہلی ضرورت اور مصروفیت ملازمت تھی۔ وہ آسانی سے مِل گئی۔ وہ ٹرینڈ سیکرٹری تھی۔ ملازمت غنیمت تھی۔ تنخواہ پہلے والی ملازمت سے تو کم تھی البتہ کام آسان تھا اور پھر آفس ممی کے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ اُس نے سوچا تو تھا کہ ملازمت کے بعد ایک کمرے کا فلیٹ لے کر الگ ہو جائے گی مگر ممی کی صحت کے مسئلے جب ''مسائل'' بننے لگے تو اُسے اپنے خیال سے دست بردار ہونا پڑا۔ وہ اپنی ممی سے محبت کرتی تھی۔ اُس کی ذاتی زندگی میں اب محبت کا خانہ خالی تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس حوالے سے وہ اپنی خوشیاں جی چُکی ہے۔ وہ رومن کیتھولک تھی اور بچپن سے مذہبی ماحول میں رہنے کی وجہ سے اُس کے خیالات کافی مذہبی تھے۔ پیٹر کے بعد کئی مردوں نے اُس کی زندگی میں داخل ہونا چاہا مگر اُس نے کِسی کو موقعہ نہیں دیا۔ مارٹن اُس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ اُسے پسند کرتا ہے۔ وہ اُس کی پسندیدگی سے واقف ہوتے ہوئے بھی ناواقف ہی رہی۔ مارٹن ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ آہستہ آہستہ وہ اُسے متاثر کرنے لگا تھا۔ وہ خوش گُفتار و خوش لباس تھا۔ عُمر بھی مناسب تھی اور دیکھنے میں بھی دِل کو بھلا لگتا تھا۔ کم سے کم جینی کا دِل تو اب یہ ہی کہنے لگا تھا۔ وہ دانستہ اُس کے التفات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک دِن اپنی خواہشوں سے مات کھا گئی۔ اُس دِن وہ گھر لیٹ پہنچی تھی اور ایک عرصے کے بعد اُس نے ممی سے جھوٹ بولا۔ وہ اندر ہی اندر خود سے بھی شرمندہ تھی کہ وہ اپنے ارمانوں پہ بند کیوں نہ باندھ سکی تھی اور کیوں مارٹن کے ساتھ جذبات میں بہہ گئی تھی۔ اب اُسے اندر ہی اندر کوئی چیز کاٹ رہی تھی۔ شرمندگی کا احساس نظریں اُٹھانے نہ دیتا تھا۔ یہ وہ کیا کر بیٹھی تھی؟ کیوں اپنی نفسانی خواہشات سے ہار گئی تھی؟

مارٹن سمجھا تا کہ ''ایسا ہونا فطرت کے مُطابق ہے۔ اُس نے وہ ہی کیا جو ساری دُنیا کر رہی ہے۔'' اُسے دُنیا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ احساسِ گناہ دِل پہ سانپ کی طرح کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا اور ہر لمحے اپنا ڈنک اُس کی رگوں میں اُتارتا رہتا۔

اُن ہی دِنوں ممی کی طبعیت بہت خراب ہوئی تو تین دِن اُنہیں ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ممی کافی کمزور ہوگئی تھیں۔ وہ اُن کے ساتھ مصروف ہوئی تو وقتی طور پر اُسے پریشان کُن سوچوں سے نجات مِل گئی۔ وہ جب ممی کی جانب دیکھتی تو اُسے محسوس ہوتا کہ ممی کی کھوجتی نظریں اُس کے تن بدن سے لپٹ رہی ہوں۔ وہ ممی کی نگاہوں سے خائف رہنے لگی تھی۔

''ممی ہمیشہ سے کہتی آئی ہیں کہ وہ میری سوچوں کو بھی پڑھ سکتی ہیں۔ تو کیا وہ یہ بھی جان گئی ہیں۔'' ممی نے کبھی کُچھ کہا نہیں اور وہ خود پوچھ کر اپنی مُشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایک دِن ممی کی تیز نظریں اُس کے آر پار ہو رہی تھیں اور وہ خامخواہ ہی نروس ہو رہی تھی۔ ممی نے اچانک پوچھا۔ ''یہ تُم آج کل کِن سوچوں میں گم رہتی ہو؟''

''کیا ممی جان گئی ہیں کہ میں نے شادی کے بغیر ہی ایک مرد سے۔۔۔۔۔'' ممی کے سوال نے ایک اور سوچ کو جنم دیا۔

اپنی طرف سے تو اُس نے ممی کو اطمینان دِلا دیا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ممی نے جواباً کُچھ نہ کہا تو وہ سمجھی کہ وہ مُطمئن ہوگئی ہیں۔

ممی کے دِل کی حالت اب ایسی تھی کہ اُنہوں نے اپنی وصیت بنوا

لی تھی اور اپنے سبھی معاملات جینی پہ چھوڑ دیئے تھے۔ایک دِن تو وہ ممی کی بات سُن کر حیران ہی رہ گئی۔وہ کہہ رہی تھیں۔''جینی! تُم میری بہت اچھی بیٹی ہو۔میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔تمہیں میرے کھانے پینے،سونے جاگنے،دواؤں کی ترتیب اور تمام دوسرے معاملات کی کتنی فکر رہتی ہے۔''اِس سے پہلے،انہوں نے کبھی بھی جینی کی ایسی تعریف نہ کی تھی۔

''اور اگر ممی کو پتہ چل جائے تو۔۔۔''اِس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

مارٹن کئی دِنوں سے''دوبارہ''مِلنے پہ اصرار کر رہا تھا۔وہ اپنے دِل کو سمجھاتی،اُسے نظر انداز کرتی رہی مگر کب تک؟ایک دِن پھر وہ اُس کی بانہوں میں تھی۔اِس بار ضمیر کی چبھن پہلے سے کم تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ اُس کے اندر رہی اندر شرمندگی کی فصل اُگا دیتی۔اِس کا ایک حل تو یہ تھا کہ وہ شادی کر لیتی مگر مارٹن شادی شدہ تھا۔مارٹن اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا کہ اِس میں کوئی بُرائی نہیں کہ شادی کے بغیر بھی ہم ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں۔وہ سمجھتے ہوئے بھی اِسے گناہ ہی جانتی تھی۔یہ چیز اُس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ممی نے ہمیشہ مذہب کو ہر شے پہ فوقیت دِی تھی اور ثواب و گناہ کا نظریہ ایک بے حد غیر لچک دار عقیدے کی صورت اُس کے اندر دور تک جڑیں گاڑے بیٹھا تھا۔

ممی کی طبعیت کئی دِن سے ناساز چل رہی تھی۔وہ بھی اپنے دفتر نہ جا سکی تھی۔مارٹن سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ایک رات دونوں نے ملنے کا پروگرام بنایا۔وہ ممی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔اِس لیے پلان یہ ہی بنا کہ مارٹن آدھی رات کے بعد جب ممی سو جائیں گی تو آئے گا اور وہ چپکے سے اُسے گھر کے اندر بُلا لے گی۔اُس دِن اُسے لگا کہ جوانی کے دِن لوٹ آئے ہوں۔پھر ایسا ہی کیا گیا۔ممی سو چکی تھیں اور وہ مارٹن کی بانہوں میں بکھری پڑی تھی۔

جب وہ مارٹن کے ساتھ ہوتی تو گناہ کا احساس زیادہ نہ ستاتا تھا۔وہ جاتے جاتے اُس کا سکون بھی جیسے ساتھ ہی لے جاتا۔کئی دِن اُسے اپنے اندر کی عورت سے لڑتے ہوئے گزر جاتے۔گناہ کا احساس روح کو پیس ڈالتا اور ہر وقت اُس کے وجود کو جہنم کی آگ میں جلائے رکھتا۔وہ ابھی انہی سوچوں میں گھری ہوئی تھی کہ مارٹن نے دوبارہ اُسے بانہوں کی زنجیر پہنا دِی۔وہ اُس کی جانب دیکھ کر دل کش انداز میں مُسکرائی اور وہ خوشی کے عالم میں اُس پہ جُھک گیا۔وہ شاید ابھی مزید آگے بڑھتے مگر اچانک کسی آواز نے اُسے چونکا دیا۔وہ تڑپ کر مارٹن کی آغوش سے الگ ہوئی مگر اُسے دیر ہو چکی تھی۔اُس کے کمرے کا دروازہ کُھلا ہوا تھا اور مدھم روشنی میں وہ ممی کو دروازے کو ایک ہاتھ سے تھامے کھڑے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔وہ تو ممی کو دیکھ کر پتھر کی ہو گئی تھی۔ممی کی ساکت نگاہیں ایک نقطے پہ ٹک گئی تھیں۔وہ اُس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھیں۔نہ جانے وہ کہاں دیکھ رہی تھیں۔نہ جانے کتنے بوجھل پل،وقت کی لگام کو تھام کر ٹھہر سے گئے تھے۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔''ایک منمناتی ہوئی،سہمی سی آواز نے پتھر کو اپنی جگہ سے سرکایا۔مارٹن اُس سے دور،اُس کی ماں سے قریب ہوتے ہوئے،دروازے کے فریم میں ایک لمحے کو نظر آیا اور پھر یوں نظروں سے اوجھل ہوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔

''یہ شخص قابلِ اعتبار نہیں۔جو عورت کو ایسی حالت میں بزدلی کے عالم میں چھوڑ کر فرار ہو جائے وہ کیسے ایک سچا مرد ہو سکتا ہے؟''ممی نے مارٹن کے جانے کے بعد پہلا جملہ کہا تو اُس کی ساری حسیات سمٹ کر اُس کے چہرے کو زندگی دے گئیں۔

''ممی! آئی ایم سوری(مُجھے افسوس ہے)۔''اُسے کُچھ تو کہنا تھا۔وہ بیڈ کی چادر کو کھینچ کر ستر پوشی کا فوری اہتمام کر چکی تھی۔

''تُم تو میری اتنی اچھی بیٹی ہو۔''ممی نے کئی دِن پہلے کی کہی ہوئی بات کو دُہرایا تو شرمندگی سے اُس کا سر سینے سے آ لگا۔

''تُم نے میرا بے حد خیال رکھا۔''ممی کہہ رہی تھیں۔''تُم نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے پاپا کے بعد میں کیسی زندگی گزار رہی ہوں۔اُن کو گئے ہوئے گیارہ سال ہو گئے۔اُن جیسا کوئی سچا مرد کوشش کے باوجود مِلا نہیں ورنہ میں۔۔۔''اُن کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں میں ڈوب گئی۔

پل بھر کے توقف کے بعد وہ پھر بولیں۔''اگر کوئی سچا مرد مِلے تو پھر سوچنا نہیں اور نہ ہی پیچھے مُڑ کر دیکھنا ورنہ زندگی پچھتاوا بن کر رہ جاتی ہے۔''

بدن کے گرد لپٹی ہوئی چادر اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی مگر اُسے اِس بات کا ہوش کہاں تھا۔وہ اُس کی گناہ کے بوجھ تلے دبی روح کو رہائی دے کر جا چکی تھیں۔

''تواضع''

ابھی ڈپو سے آجاتی ہے چینی
گوالا گھر سے چل پڑا ہے
چائے پی کر جایئے گا حضور
ملازم لکڑیاں لینے گیا ہے

(انور مسعود)

''سوئے چرخ''

چاند پہ جا کے اُنھوں نے تو علم گاڑ دیا
اور سوئے چرخ،غبّارے بھی نہ چھوڑے ہم نے
بیٹھے، اس مصرعِ اقبال کو دہراتے رہے
''بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے''

(ڈاکٹر شاہد الوریٰ)

جب جسم جاگتے ہیں

محمد طارق علی

(راولپنڈی)

خالد کے گھر کے ساتھ والے پلاٹ پر مکان کیا بنا، وہ ذہنی اور دلی طور پر بے سکون ہو کر رہ گیا۔ اس سے پہلے بہت چین سے جی رہا تھا۔ ہر کام، ہر چیز اپنے موڈ اور اور مرضی کے مطابق، سونا، جاگنا اپنی خوشی کا اور وہ بھی دن رات کے مختلف اوقات میں۔ جب جی چاہا ٹی وی کھول کر کوئی اچھا سا پروگرام دیکھ لیا یا مطالعے کی خواہش ہوئی اور وہ اکثر ہوتی ہی رہتی تھی تو کوئی پسند کی کتاب یا رسالہ کھول کر بیٹھ گیا۔ رات کے تنہا لمحوں میں وہ اپنا ایک خاص کام شروع کر دیتا یعنی قلم و قرطاس لے کر بیٹھ جاتا۔ یہ خاص کام اُس کا من پسند بھی تھا اور پیشہ ورانہ بھی کہ اسی سے اس کی روزی روٹی چل رہی تھی۔ وہ صبح دس گیارہ بجے ایک روزنامے کے دفتر چلا جاتا تھا۔ تنخواہ کم تھی لیکن دلی اطمینان زیادہ تھا۔ ہفتہ واری چھٹی کے دوران کبھی کوئی دفتری ساتھی یا کوئی ادبی دوست آ نکلتا تو اس کے ساتھ چائے کی پیالی پر گپ شپ رہتی۔ بس یوں ہی شب و روز گذر رہے تھے۔ جو رونہ جاتا، فکر نہ فاقہ اور اللہ میاں سے ناتہ۔

لیکن ایک دن گھر کے ساتھ والا خالی پلاٹ جو کہ خالد کا اپنا تھا، اُسے فروخت کرنا پڑ گیا۔ اُس نے پلاٹ سے حاصل شدہ رقم گاؤں میں اپنے گھر والوں کے حوالے کر دی۔ ایسا کرنا بہت ضروری تھا اس لیے کہ بہن کی شادی سر پر آ گئی تھی۔ سو، یہ فرض بہ خوبی نبھ گیا اور اُس کے کاندھوں سے بھاری بوجھ اُتر گیا۔

پلاٹ کا نیا مالک، راشد، خالد کا واقف تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھا۔ اس نے دو ہفتے کے اندر اندر ہاؤس بلڈنگ والے دفتر سے قرض لے کر فٹافٹ مکان بنانا شروع کر دیا اور تین ماہ کے قلیل عرصے میں خالد کے گھر کے ساتھ ایک سنگل مکان بن کر کھڑا ہو گیا۔ رنگ و روغن کے بعد راشد اپنا ہلکا پھلکا سامان لے کر اس میں شفٹ ہو گیا۔ مزید چند ہفتے گذرے تو ایک دن اس مکان میں چراغاں ہوا، ڈھولک بجے، گیت گائے گئے اور راشد ایک سجی سجائی کار میں اپنی دلہن لے آیا۔

یہاں تک تو خیریت ہی خیریت تھی۔ خالد خوش تھا کہ اس کے گھر کے بالکل ساتھ ایک نیا مکان بنا اور جلد ہی آباد بھی ہو گیا۔ خالد کے گنے چنے عزیز گاؤں سے کبھی کبھی اس کے پاس آ جاتے اور چند دن رونق رہتی۔ وہ خالد پر زور دیتے ''اب تم بھی اپنا گھر بسا لو، کب تک چھڑے بنے رہو گے'' پڑوسی راشد بھی کبھی کبھی علیک سلیک کے بعد یہی موضوع چھیڑ دیتا اور خالد سے کہتا ''بس جی اب اس گھر میں ہماری ایک بھابی آ جانی چاہیے''۔ وہ ہر بار ان سوالوں کے جواب میں مسکرا دیتا یا خاموش رہتا اور کیا کرتا اس لیے کہ بہن کی شادی کے بعد اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ گاؤں والی زمین سال میں اتنے ہی دانے دیتی تھی کہ خالد کے گھر والے عزت سے دو وقت کی روٹی کھا لیں اور شکر کریں۔ رہی اس کی اخبار کی تنخواہ، تو ایسی آمدنی میں بس شادی کا خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ سو، وہ اکثر رنگین خواب دیکھتا اور خود کو خوش کرتا رہتا تھا۔

پڑوسی راشد نے اپنا مکان بہت سوچ سمجھ کر کم خرچ بالا نشین والے طریقے سے بنایا تھا۔ اُس نے خالد کے گھر کی دیوار کے ساتھ سنگل اینٹ کی پتلی سی دیوار کھڑی کر کے دو بیڈ جوڑ لیے اور اُن ہی سے متصل ایک ڈی ڈی، اور کچن، باتھ وغیرہ بنا کر اُن پر ایک لمبی سی چھت ڈال دی۔ اس کی بیوی نے مزید سمجھ داری دکھائی اور صرف ایک بیڈ روم میں اپنا ڈیرہ جما کر ڈی ڈی اور دوسرا بیڈ ایک نئے نویلے جوڑے کو کرائے پر دے دیا۔ یہ دونوں ملازمت پیشہ تھے۔ اس پورشن میں بہ خوشی آباد ہو گئے۔ ان کے بیڈ روم کے ساتھ خالد کا بیڈ روم جڑا ہوا تھا جبکہ اُس کے دوسرے بیڈ سے راشد والا بیڈ چپکا ہوا تھا۔ صرف ایک پتلی سی دیوار نے انہیں علیحدہ علیحدہ کر رکھا تھا۔ ہوا یوں کہ مختصر سے وقت کے اندر ان دونوں پڑوسیوں کی قربت سے خالد کے دماغ کے ڈھکے چھپے بند کھول دیئے۔ اس کا سارا سکون نچوڑ لیا۔

دن تو خیریت سے گذر جاتا تھا اس لیے کہ خالد اخبار کے آفس میں ہوتا اور اُس کے دونوں پڑوسی اپنے اپنے دفتروں میں۔ لیکن شام ڈھلتے ہی جب وہ گھر آتا تو رات بھیگنے تک اُن دونوں پڑوسیوں کی طرح طرح کی ذاتی باتیں خود بہ خود اُس کے کانوں میں آ ساتیں اور اُسے لگتا کہ اُس کی کھوپڑی میں فقط کچرا بھرا ہوا ہے اور بعض دفعہ بالکل خالی محسوس ہوتی، ٹناٹن کرتی ہوئی یہاں تک کہ وہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر کچھ بھی نہ کر پاتا، کوئی پڑھائی لکھائی والا کام تو دور کی بات ہے، خالی بیٹھنا یا مختصر آرام کرنا بھی دشوار ہو جاتا۔ ہوتا یوں کہ وہ جب بھی اپنے ایک بیڈ روم میں آرام کے لیے آ بیٹھتا تو پڑوسیوں کی باتوں کی لپیٹ میں آ جاتا، وہ بے چین ہو کر دوسرے بیڈ روم میں ہجرت کر جاتا لیکن تھوڑی دیر بعد اُسے وہاں بھی ویسی ہی کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا، نتیجہ وہی بے چینی۔

دونوں پڑوسیوں کی باتیں خالصتاً گھریلو اور نجی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک روز کرایہ دار اسلم نے اپنی گھر والی سے کہا ''رمزی ڈئر'' یہ ڈبل بیڈ یہاں سے ہٹا کر دوسری دیوار کے ساتھ جوڑنا پڑے گا، مجھے مشرقی جانب والی کھڑکی سے تھوڑی روشنی اور ہوا مل سکے گی'' چنانچہ ان کے بیڈ کے ساتھ ساتھ خالد کے دماغ کی بھی کھینچا تانی شروع۔ اس مشقِ ستم کے بعد جب اُسے کچھ سکون کا وقفہ ملا تو پھر ایک نئی بات۔

''رمزی ڈئر، تم یہ کیلینڈر بھی ڈبل بیڈ کے ساتھ والی دیوار پر ٹھوک دو، ہمیں تاریخ دیکھنے میں ذرا آسانی رہے گی۔'' سو، فوراً ہی ہتھوڑی کی ٹھک ٹھک شروع، جو سیدھی آ کر خالد کے دماغ کی چولیں ہلانے لیکن پڑوسی کے لیے آسانی لانے کی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد مسٹر اینڈ مسز اسلم کا ڈنر شروع ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ

قدرے اونچی آواز میں ٹی وی کے بدلتے چینلز پر مختلف پروگرام آنے لگے۔ وہ تنگ آ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دوسرے بیڈروم میں جا پہنچا۔ اس کے ساتھ راشد کا بیڈروم جڑا ہوا تھا جہاں اس کی وائف اپنی گونجیلی آواز میں بول رہی تھی۔

''آج سامنے والی پڑوسن مجھے ملنے آئی تھی، کانوں میں نئے کانٹے تھے، بہت خوبصورت اور جدید ڈیزائن والے، میری نظریں تو جیسے ان پر جم کر رہ گئیں، اس نے نیا کام دار جوڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ خوب بن بن کر مجھے بتانے لگی کہ اس کا گھر والا اسے اپنے سکوٹر پر موتی بازار لے کر گیا تھا اور ان چیزوں کی شاپنگ کروا کر لایا۔ اللہ، تم بھی مجھے موتی بازار لے جا کر ویسا ہی ایک جوڑا لے دونا، میرے اچھے راشد، تم سن رہے ہو نا؟''

''ہوں، آں''

''چھوڑو اخبار، میری بات کا جواب دو''

''اچھا، اچھا، دیکھیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی دونوں ڈنر کرنے لگے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ اس دوران خالد نے یہ مشکل کھانا زہر مار کر لیا۔ پھر تھوڑی دیر تک ایک کتاب کھول کر دیکھتا رہا، گیارہ بج گئے۔ وہ اپنے اخبار کے ادبی صفحے کے لیے ایک افسانہ لکھنے کا سوچنے لگا۔ آخر ایک اچھا سا پلاٹ سوجھ ہی گیا۔ قلم کاغذ اٹھا کر آغاز لینے کی کوشش کرنے لگا، پہلے ایک سطر لکھی، پھر دوسری، لیکن کچھ مزہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھوڑا رک کر مزید سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اونگھ آ گئی۔ پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا، وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے قلم کاغذ پھسل گیا۔ وقت کی لہر جانے اُسے کہاں لے گئی۔ کرسی پر بیٹھے پہلو بدلتے ہوئے اچانک اُس کی آنکھ کھلی تو قدرے سنبھل کر سامنے دیوار پر کلاک دیکھا، ایک بجا تھا۔ قلم کاغذ اٹھا لیا اور عین اُسی وقت پڑوس والے کمرے میں دو جسم جاگ اٹھے۔ چند ثانیے باہمی کھسر پھسر، نقرئی ہنسی، چوڑیوں کی چھنا چھن اور پیار کی مٹھاس میں شرابور کچھ تقاضے۔

''نہیں، قسم سے بالکل موڈ نہیں ہے، توبہ ہے، تمہاری یہ روز روز کی بھوک ختم ہی نہیں ہوتی، ٹھہرو ٹھہرو، اتنے کیوں بے صبرے ہوئے جا رہے ہو، کپڑے تو اتار لوں۔ اور تم مجھے اس طرح کیوں نوچ رہے ہو، میری ایک بریسٹ پر زخم ہے، اُف تم مت چھیڑو، مجھے درد ہوتا ہے''

ان کی آپس کی یہ انتہائی نجی باتیں سیدھی کانوں میں اتر کر خالد کے ہوش اڑانے لگیں۔ چند سیکنڈ کی خاموشی، پھر دو ندیدے بدنوں کی لپک جھپک، ترسیدہ سانسوں کی مٹھ بھیڑ اور اس کے بعد ایک مربوط ردم کے ساتھ بے اختیار چسکاریاں۔ معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا، خالد قلم کاغذ پھینک، کمرے سے نکل بھاگا اور دوسرے بیڈروم میں جا کر دم لیا، کارپٹ پر لیٹ گیا۔ سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا اور ذہن میں کوئی انوکھی سے فلم چل رہی تھی۔ خالد ایک تکیئے پر سر رکھ کر پلٹے کھانے لگا۔ لیکن اسی اثنا میں دیوار کی دوسری جانب لگے بیڈ نے ''چرخ چوں، چرخ چوں'' شروع کر دی۔ اُسے یوں لگا کہ یہاں بھی وہی جاگتے جسموں والا ڈرامہ چل رہا ہے، گو کمرے بدل گئے تھے۔

''بس جانی، اب جان چھوڑو، آرام بھی کرنا ہے صبح ہی صبح آفس کی تیاری بھی کرنی ہے''۔ نیند کے خمار میں لپٹی آواز نے کہا۔

''نہیں جانم، صبح اتوار ہے، سارا دن اپنا ہے''۔ اور اسی کے ساتھ بیڈ کی چرخ چوں، چرخ چوں۔

خالد یہ سوچ کر حیران تھا کہ کیا ان چاروں جسموں کے اندر کوئی ایسی گھڑی فٹ تھی کہ ایک ہی وقت میں ان کے الارم بج اُٹھے، وہ جاگ اٹھے اور ایک ہی نوعیت کے کام میں مصروف ہو گئے۔ پھر اُسے ارشد اور اسلم پر رشک آیا کہ ان کے ساتھ لیٹے ہوئے گدرائے بدنوں نے اپنے اپنے طور پر خود کو ان کے سپرد کر کے لذتوں کے تاب دار موسموں کے در اُن پر کھول دیئے تھے لیکن اُسے لگا کہ شاید خود اُس کے اندر بھی کہیں ایک ایسی گھڑی موجود تھی جس نے اسے جگا کر اُس کے بدن میں ایک عجیب سے کھولن بھر دی تھی اور وہ بے بس ہو کر سوچنے لگا کہ اب کہاں جائے اور کیا کرے۔ دماغ سُن، جسم میں خارش، بے چینی اور اکڑن۔ جب اُسے کچھ بھی نہ سوجھا تو باتھ روم جا کر سر گیلا کر لیا اور صحن میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

خالد کو یاد آیا کہ اُس کا گاؤں تھا تو پورے کا پورا ایک گاؤں ہی، لیکن وہاں کے مکینوں کے گھر الگ الگ تھے۔ اسی لیے کسی کو بھی اپنے پڑوسی کی انتہائی نجی باتوں کا کوئی علم نہیں ہوا کرتا تھا۔ کس جوڑے کا پیار کا بادل کتنی دیر برسا، اس بارش میں دو بدنوں کی کیسی کیسی لپٹ جھپٹ ہوئی، قریب ترین پڑوسی بھی اس سے بالکل بے خبر ہوتا تھا اور ہونا بھی چاہیے۔ پرائیویسی کا تقاضا تو یہی ہے۔ ''اب یہاں شہر میں آ کر تو مجھے زندگی یکسر مختلف لگتی ہے، نجی پردہ داری تو نام کو بھی نہیں'' اس نے سوچا اور یہ بھی کہ ''پڑوسیوں کی نجی باتوں پر میری توجہ کیوں خود بہ خود مبذول ہو جاتی ہے، اس مسئلے کا حل کیا ہے، اگر میں شادی کر لوں تو کیا پڑوسی اس طرف کی باتیں نہیں سنیں گے؟'' اس نے کچھ دیر سوچا آخر ایک فیصلے پر پہنچ ہی گیا۔

اگلی صبح خالد جلد اٹھا، نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ دماغ میں ایک فضول سے رت جگے کا خمار ابھی تک تھا۔ وہ آفس چلا گیا۔ اس کی خواہش پر آفس بوائے نے ایک کڑک چائے لا کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ چسکیاں لے لے کر اُس نے شہری زندگی کے خلاف ایک ''کڑک'' افسانہ لکھا۔ پھر آفس بوائے کو حکم دیا:

''حمید، تم ابھی جاؤ اور یہاں آفس سے قریب ہی ایک سپرٹ پورشن مجھے کرائے پر دلوا دو، دیر بالکل نہیں لگانی، تمہیں معقول انعام ملے گا''

کام بنتے ہی خالد اپنا گھر کرائے پر چڑھا کر خود اسی پورشن میں اٹھ گیا۔ اگلے روز سے وہ مختلف اخباروں میں ''ضرورت رشتہ'' کے کالموں میں بالخصوص ''گھر داماد'' والے اشتہار دیکھنے لگا۔ اور کیا کرتا؟ اس کا جسم بھی تو جاگ چکا تھا اور اُسی نے خالد کو ایک آسان سی راہ سُجھا دی تھی۔ پرائیویسی ملنے کے بعد اب اُسے ایک خاص جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وگرنہ اپنے گھر میں پڑوس سے اٹھ کر آنے والی بے گانی تپش سے اس کا جسم یوں ہی جل جل کر بھسم ہو جانا تھا۔

شُہد چٹنک

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

''دادو! پھر کیا ہوا' بتایئے نا.....؟''

''ہونا کیا تھا بیٹا.....! پوری کلاس' ہی ہی کر کے اِس طرح دانت کھسوڑنے لگی جیسے اُن سب کے پیٹ میں چوہے چھوڑ دیئے گئے ہوں..... اُس دن تو دولڑکے پریم اور عابد حبیب غیر حاضر تھے..... پوری کلاس تو نہ ہوئی..... ؟ چوبیس میں سے دو گھٹا دیئے جائیں باقی بچتے ہیں بائیس..... بائیس لڑکوں کو پوری کلاس نہیں کہا جا سکتا.....! پریم بھی عجب ڈرامہ تھا.....! ہر روز نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے پہن کر آتا اور ہم جماعتوں پر' رعب جھاڑتا.....! اِس طرح کی جرسی اشوک کمار نے' فلم ''ہم لوگ'' میں پہنی ہے.....! پتلون کا اسٹائل راج کپور سے ملتا جلتا ہے..... بالوں کی لَٹ دلیپ کمار کے انداز میں ترشوائی ہے..... قمیض کا کالر دیوآنند اسٹائل کا بنوایا ہے.....''

''اتنے ڈھیر سارے پیسے تیرے پاس آتے کہاں سے ہیں اور تجھے سلوا کر کون دیتا ہے فیشنی کپڑے.....؟''

''ابے یار.....! تم بھی باؤلے ہو سارے..... یہ کپڑے میرے بڑے بھائی سُدھیر کے ہیں' میں تو اس کی چوری سے پہن کر آتا ہوں.....!''

''اور بال.....؟'' پریم کی بات میں وقفہ آتے ہی ہم میں سے کوئی بول پڑتا.....

''بال کٹوانے' میں اپنے بھائی کے ساتھ جاتا ہوں۔ جس ہیرو کے اسٹائل میں سُدھیر کٹنگ کراتا ہے میں بھی ضد کر کے ویسے ہی بال ترشوا لیتا ہوں..... پچھلے دنوں سُدھیر نے دلیپ کمار طرز کی لَٹ ماتھے پر لٹکوائی تھی' اس مرتبہ دیوآنند اسٹائل کا کُپّا رکھوایا ہے.....!'' سر کے اوپری حصے کی جانب بالوں کے اُبھار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم چند شودگی دکھاتا اور ہم سب گونگلو بنے اُس کا منہ تکنے لگتے۔

''کیا بنے.....؟''

''بھئی محاورہ ہے..... پنجاب میں شلجم کو گونگلو بھی کہتے ہیں' سادہ بندے کو' گونگلو کی طرح' ڈب کھڑب سمجھتے ہوئے گونگلو سے ملا دیتے ہیں..... ڈب کھڑب کا مطلب نہ پوچھنے لگنا.....؟ ٹیڑھے میڑھے کے لئے استعمال ہوتا ہے.....''

''اُس وقت کے لحاظ سے ماڈرن اور پیسے والے ہوں گے پریم چند کے بڑے بھائی.....؟''

''آرٹسٹ بتایا کرتا تھا پریم چند حالانکہ اُس کے بھائی' سینما کے ہورڈنگ بنایا کرتے تھے اسی وجہ سے' اُن کے کپڑوں اور بالوں میں' فلمی ہیروز کی چھاپ نمایاں تھی..... تیسری دنیا میں غریب اور پسے ہوئے لوگ' فلمی ہیرو' ہیروئن سے اصل ہیروز کی طرح مرعوب ہوا کرتے ہیں اور اُن کی دیکھا دیکھی' ہیرو' ہیروئن بننے کی ناکام کوشش میں ضائع ہو جاتے ہیں.....''

''پیٹ میں چوہے چھوڑنے والی بات تو درمیان میں رہ گئی.....!''

''آتا ہوں..... آتا ہوں..... اُدھر بھی آتا ہوں..... پہلے پریم کی کہانی کا انت تو سُن لو..... ہماری تو خیر ہے وہ کم بخت مسلمان دوستوں کے ساتھ' اسکول اور گھر تک اس درجہ شیر شکر تھا کہ ہمیں اُس کے ہندو ہونے پر شک گزرنے لگا تھا..... غالباً سوموار کا دن تھا' اُس روز ناصر تاخیر سے پہنچا تھا..... آتے ہی اُس نے ساری کلاس کے سر پر آسمان گرا دیا تھا.....!''

''وہ کس طرح.....؟''

''ابھی ابھی میں نے پریم کو جم خانہ کلب میں جھاڑو دیتے دیکھا ہے.....!''

''ہیں.....!'' بہت سارے منہ ایک ساتھ کھُل گئے.....!

''قسم اللہ پاک کی..... اُس نے وہی قمیض پہن رکھی تھی جو مشہور ولن پران نے فلم ''آزاد'' میں پہنی ہوئی تھی..... جیسے ہی میں نے پریم اور اُس کی قمیض کو پہچانا' پریم اوپریم کہہ کر اُسے آواز دے ڈالی جس پر وہ چونک کر پلٹا اور اُس کے بعد اجنبی بن کر میری طرف پیٹھ کر کے پھر سے جھاڑو دینے لگا.....''

''ابے نہیں..... یہ کس طرح ہو سکتا ہے..... کل ہی تو اُس اُلّو کے پٹھے نے' میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ کر ایک پلیٹ میں مزے لے لے کر بھنڈی گوشت کھایا تھا اور کلاس میں کسی کو نہ بتانے کی تاکید کی تھی.....!'' شریف الدین حیرت کے غوطے میں ڈوبے کھاتے ہوئے' ایمان کی خرابی پر پریشان تھا.....!''

''کمال ہے یار.....! تجھے دھوکا تو نہیں ہوا.....؟''

''ابے باؤلا ہوا ہے..... کل کو آجائے گا سالا پریم' سب کے سامنے پوچھا دوں گا..... ہاں نہیں تو.....!'' ناصر نے گھڑے سا سر اور گوریلا آنکھیں نکالتے وجے کمار' افضال احمد اور اصغر علی کو لاجواب کر دیا.....!

''پریم کے آنے پر' بڑا ہنگامہ ہوا ہوگا کلاس میں.....؟''

''اُس دن کے بعد پریم کبھی سکول نہیں آیا..... لڑکوں نے پریم کا پیچھا کر کے اُس کا گھر ضرور دیکھ لیا تھا جو بھنگی محلے میں واقع تھا.....!''

''اور وہ دوسرا لڑکا..... کیا نام تھا..... عابد حبیب..... وہ کیوں غیر حاضر تھا اُس روز.....؟''

''عابد حبیب' کوڑھ مغز اور غبّی سا لڑکا تھا..... اُس روز' سبق یاد نہ کرنے پر ماسٹر جمعہ بخش کے مشہور زمانہ مولا بخش کی کارفرمائی سے اُس کا پاخانہ خطا ہو گیا تھا

جس کی وجہ سے وہ دوسرے دن کلاس سے غیر حاضر تھا..... ایک دن کے وقفے کے بعد عابد حبیب اسکول حاضر ہو گیا تھا..... دو ایک دن گُم سُم اور الگ تھلگ رہنے کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا کیونکہ ماسٹر جمعہ بخش نے سب لڑکوں کو تنبیہ کر دی تھی کہ اگر کسی نے اس واقعے کو بنیاد بنا کر عابد حبیب کو چھیڑنے یا کسی بھی طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کی تو اُس کی ایک ساتھ دونوں چیزیں خطا ہو جائیں گی.....!''

''اب اصلی بات بھی بتائیں نا.....!''

''ماسٹر اشفاق حسین تھے تو اچولی کے پٹھان مگر ہندی اور سنسکرت میں اُن کے پائے کا اُستاذ دُور دُور تک دستیاب نہ تھا۔ بھگوت گیتا کے اشلوک اور مہا بھارت کے کرداروں کے درمیان مکالمے کا آسان ترجمہ اتنی روانی اور عمدگی سے کرتے کہ آنکھوں کے سامنے زندہ ڈرامے کی کیفیت پیدا ہو جاتی..... کچھ ایسا ہی انداز کالی داس، تلسی داس، میرا بائی اور کبیر داس کے دوہوں کی تشریح اور ترجمہ کے وقت بھی پیدا کر دیتے..... ایک ایک نکتے کی وضاحت اتنی باریکی اور مہارت سے کرتے کہ بھوگول کے ماسٹر ترویدی صاحب اور انک گڑت کے اُستاد پرکاش چندر بھی ان کی مہارت کا لوہا مانتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتے..... ماسٹر اشفاق حسین نے اُس روز کلاس کے تمام لڑکوں کا ہندی میں عرضی یعنی چھٹی کی درخواست لکھنے کا ٹیسٹ لیا تھا اور سب سے اچھی درخواست لکھنے والے کو اپنی جیب سے نقد انعام دینے کا اعلان بھی کیا تھا..... کلاس کے سبھی لڑکوں کے لئے یہ مشکل بات نہ تھی..... ماسٹر اشفاق حُسین نے کئی بار ہمیں ہندی کی درخواست لکھنے کی مشق کرائی تھی جس میں ایک لفظ بھی دوسری کسی زبان کا شامل نہ تھا..... ایک لڑکے کو اس کے باوجود بھی ہول اُٹھ رہی تھی..... ہندو دھرم اور ہندو پریوار سے سمبندھ ہوتے ہوئے بھی ہندی زبان اُس کے لئے اجنبی اور اوکھی تھی..... مغربی پنجاب کے شہر راولپنڈی میں تعلیم پانے والا یہ بچہ اردو اور پنجابی زبان کے علاوہ دوسری کسی زبان سے اس قدر مانوس نہ تھا جس قدر اُس کے ہم جماعت ہندی زبان سے تھے.....!''

''ہیں دادو..... ؟ پُرانے وقتوں میں ہمارے دیش میں لوگوں کو اپنی بھاشا نہیں آتی تھی.....؟''

''آتی تھی..... بہت سوں کو آتی تھی..... مسلم اکثریت والے علاقے کے لوگوں کو کم کم آتی تھی یا بالکل نہ آتی تھی.....''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ہندی نہیں آتی تھی.....!''

''یہ میں نے کب کہا بیٹا..... مسلمانوں کو ہندی نہ آتی تو ماسٹر اشفاق حسین، ہندو ماسٹروں کے ہوتے ہوئے، ہندی اور سنسکرت کے اُستاد کیوں ہوتے.....؟ آپ اگر اپنے دادو سے اُس نالائق لڑکے کا نام پوچھ لیتے جو اپنی کلاس میں ہندی میں سب سے کمزور تھا تو آپ کے لئے آسانی ہو جاتی.....!''

''آئی۔ایم۔سوری دادو..... اب بتا دیجئے اُس لڑکے کا نام..... پلیز!''

''نام بتانے کی کیا ضرورت ہے..... وہ نالائق آپ کے سامنے جو بیٹھا ہے..... البتہ! اب اُسے لڑکا کہنا کسی قدر زیادتی ہو گی.....!''

''اوہ نو..... مائی پُور دادو.....!''

''بھئی آگے تو سنو.....! اِسی پُور دادو کو ماسٹر اشفاق حسین نے، اپنی جیب سے پورا ایک آنہ یعنی چار پیسے انعام میں دیئے تھے..... پتا ہے کیوں.....؟''

شری مان پردھان ادھیا پک،
فیض عام ہائی سکول،
صدر بازار میرٹھ

سیوا میں سوِنیئے نیوے دن یہ ہے کہ پرارتھی کو کل رات سے جُور آنے کے کارن پاٹھ شالہ میں آنے سے اسمرتھ ہے۔ اتے دو دن کا اوکاش پردان کیا جائے۔ دھنّے واد

آپ کا شُبھ چنتک
بنواری لال

''درخواست کے آخر میں، پرارتھی کے بجائے شُبھ چنتک لکھنے پر کلاس کے بائیس لڑکے، کھسوڑ رہے تھے.....''

''کھسوڑ رہے تھے.....؟''

''کھی کھی کر کے ہنس رہے تھے..... پر نہیں..... بائیسواں لڑکا تو میں خود تھا، اس کا مطلب ہے ہنسنے والے لڑکوں کی تعداد اکیس تھی.....!''

''شُبھ چنتک پر ہنسنے کی کیا تُک تھی بھلا.....!''

''ماسٹر اشفاق حسین کے انوسار، درخواست کے آخر میں درست طور پر 'پرارتھی' لکھنا تھا۔ ماسٹر اشفاق حسین کے خیال میں، میں نے Creativity کو کام میں لا کر 'پرارتھی' سے بہتر شبد شُبھ چنتک، تحریر کیا تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے مجھے انعام کا حقدار ٹھہرایا تھا حالانکہ چند دن پہلے پتا جی کے نام، جبل پور سے لالہ شیو نارائن کی چٹھی آئی تھی جس کے آخر میں لالہ شیو نارائن نے خط کے آخر میں اپنے نام سے پہلے، آپ کا شبھ چنتک تحریر کیا تھا..... میرے دماغ سے عرضی لکھتے وقت 'پرارتھی' گم ہو گیا تھا اور میں نے لالہ شیو نارائن کی نقل میں 'پرارتھی' کی جگہ شُبھ چنتک لکھ دیا تھا۔ اس طرح سارے لڑکوں کی کھی کھی کرتی بتیسیاں، ماسٹر اشفاق صاحب کی جانب سے ملنے والے انعام کے بعد شٹر دروازے کی مانند ایک جھٹکے سے گھرر کر کے بند ہو گئی تھیں.....!''

''پھر تو آپ مشکل میں پڑ گئے ہوں گے.....!''

''ایسی ویسی.....!''

''بڑے لوّ.....! اُس زمانے میں بھی اتنی بے شرمی تھی جتنی آج ہے.....؟''

''وراثت، روایت، معاشرت کو بے شرمی، بے حیائی یا بد تہذیبی کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا..... ان چیزوں کے باہمی ملاپ سے معاشرے کا رنگ روپ بنتا ہے جسے عرف عام میں ثقافت کہتے ہیں.....''

''اس کا مطلب ہے آپ نے اپنے دوست کے اصرار پر عشقیہ خط تحریر کر دیا تھا.....؟''

''لاکھ سمجھایا..... لاکھ بتلایا..... میں اس معاملے میں قطعی کورا ہوں.....!''

''اس کا مطلب ہے، تیرے ہوتے ہوئے مجھے کوئی اور در کھٹکھٹانا پڑے گا..... !اوئے کچھ تو شرم کر..... تُو میرا کیسا دوست ہے..... دوست کے بُرے وقت میں کام آنے سے انکار کر رہا ہے.....!''

''شرم.....! میں کروں..... شرم تجھے آنی چاہیے..... ہندو دھرم کا ہوتے ہوئے مسلمان لڑکی سے عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے اور ذریعہ ایک مسلمان کو بنا رہا ہے.....؟''

''اچھا..... !اب سمجھا..... لڑائی، دو دوستوں کی نہیں..... اللہ اور بھگوان کی ہے..... لے میرے پیو..... !کان پکڑ کر وعدہ کرتا ہوں جب تُو میرے عشق کا کفّارہ ادا کرنے کے لئے کسی ہندو لڑکی سے عشق، محبت، پریم..... جو بھی تیرا جی چاہے کرے گا تو میں تیرا بھرپور ساتھ دے کر اپنے کرموں کا پرائشچت کر دوں گا..... اب بھی یقین ہے کہ کھاؤں بھگوان کی سوگندھ.....!''

''پر یار بنّے..... !تیری اُردو تو مجھ سے بہت بہتر ہے..... تو خود ہی تو کہتا ہے کہ تجھے ہندی لکھتے ہوئے بڑی وہ..... چڑھتی ہے.....؟''

''کوڑھ.....!''

''پھر میرے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے.....؟''

''وہ اس لئے میری جان..... ہم پنجابی لوگ اُردو میں پنجابی کی گرائمر شامل کر کے بولتے ہیں..... مثال کے طور پر..... میں اُسے لکھوں گا..... آپ مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہیں..... اور تُو لکھے گا..... آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں..... میں لکھوں گا..... آپ کے بغیر سب کچھ سُونا سُونا لگنے لگا ہے..... تُو لکھے گا..... آپ کے بغیر سب کچھ سُونا سُونا لگتا ہے..... وغیرہ وغیرہ.....!''

''چچا بقراط.....! جب تجھے اپنی اور میری اُردو کا فرق معلوم ہے تو پھر تیرا مسئلہ کیا ہے..... تُو خود کیوں نہیں لکھ لیتا..... کیوں اتنی دیر سے میرا دماغ چاٹ رہا ہے.....؟''

''ویر میرے.....! تیری منّت اس لئے کر رہا ہوں کہ تُو خط لکھتے ہوئے..... میر شیر..... غالب شالب کے شعر شُور کا تڑکا لگا کر خط کو سوادی بنا سکتا ہے..... اوئے جب میں خط لکھنے بیٹھوں گا تو مجھے تھوڑا پتا چلے گا کہ میں اپنی اُن کو پنجاب کی اردو لکھ رہا ہوں یا یو پی کی.....!''

''پُتّر جی.....! وہاں بھی بتیرے دوست تھے..... فیقا، شیقا، اللہ دِسایا، مہر دین، اوم پرکاش، ٹیک چند اور نہ جانے کتنے..... نائی، دھوبی، ماشکی اور کریانہ والے کے بچوں سے بھی گلی محلے کی حد تک ڈھیر ساری دوستیاں تھیں..... ٹین ایج کی دوستی کی بات ہی اور ہے..... اس عمر کے جذبات ہانڈی میں آنے والے اُبال کی مانند ہوتے ہیں۔ جس کا ذائقہ انوکھا اور دل و دماغ میں چٹکیاں لینے والا ہوتا ہے جسے اُس وقت کے بے تکلف دوستوں، یار سنگیوں سے ہی کھُل کر شیئر کیا جا سکتا ہے..... یوں سمجھ لو بچپن کی دوستی دودھ کے دانت اور نوجوانی کی دوستی پکے دانت کی مانند ہوتی ہے..... ایک طرح سے دودھ اور شراب کا سا معاملہ بھی کہہ سکتے ہیں..... دودھ خالص ہوتا ہے، صحت بخش ہوتا ہے، لذیذ ہوتا ہے..... اس کے باوجود زیادہ نہیں پیا جا سکتا..... بندہ جلد چھک جاتا ہے..... شراب..... جتنی پیو نشہ اور طلب اُتنی بڑھتی ہے..... دودھ سے جیب میں سواد جب کہ شراب سے ''جی'' میں رچاؤ آتا ہے..... شریفا ملا بھی مجھے کڑے وقت میں تھا..... ہم آنا تھوڑا چاہتے تھے یہاں..... ہم نے تو پاکستان کے اعلان کے بعد بھی پکا پکا وہیں رہنے کا پروگرام بنا لیا تھا..... آدھے مسلمان تو ہم پہلے ہی تھے..... گوشت کھاتے تھے..... دم درود کے لئے مسجد اور مزاروں پر جاتے تھے..... دکھ بیماری میں مولوی مُلا سے تعویذ گنڈا لیتے تھے..... عید بقر عید، شبرات اور محرّم میں مسلمان پڑوسیوں اور دوست یاروں سے شِیر و شکر ہو جایا کرتے تھے اور جب بھی محلے میں آواز بلند ہوتی..... کُڑیو جاتکو..... ونڈے دی شے لے جاؤ..... ہر آواز پر دوڑتا ہوا میں باہر گلی اور کبھی کبھی گلی سے بہت دور نکل جاتا..... میرے ماتا، پِتا یا خاندان کے کسی بڑے بزرگ نے اس چیز کو کبھی بُرا نہیں سمجھا..... دیوی کے پرشاد کی طرح بڑی عزت اور محبت سے ونڈے کی شے کھائی جاتی تھی..... سورگیئے ماتا جی بتاتی تھیں کہ جب میں سال سوا سال کا تھا تو مجھے سوکھیا کی بیماری لگ گئی تھی..... ڈاکٹر کیلاش اور حکیم غلام حیدر کرتار پورے والے کے علاج سے جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو ماتا جی مجھے پیپل والی مسجد کے امام مولوی حبیب اللہ کے پاس لے گئیں.....''

''کُڑیئے اے کی تماشائے آئی اے تُوں..... نیک بختے تُوں تے ساڈا دل ای خراب کر دیتا اے..... ہُن دس میں کی کراں.....!''

''مولوی صاب.....! میں کملی کیہہ دس سکنی آں جو کجھ وی کرنا اے ہُن تُساں ای کرنا اے..... میں تے بڑی آس لے کے آئی آں تہاڈے کول.....!''

''دھیئے.....! کرن والی ذات خدا پاک دی اے میں تاں بڑا گنہہ گار بندہ واں..... تو ایس طرح کر، کاکے نوں لے کے کل آئیں تے نال دو تازہ وینگن لیندی آئیں..... رب بھلی کرے گا.....!''

''ماتا جی بتاتی تھیں کہ دوسرے دن مولوی صاحب نے ایک تعویذ گلے میں ڈالنے کے لئے اور ایک پانی میں ملانے کے علاوہ دونوں بینگن دم کر کے دیئے تھے اور ماتا جی کو کہا تھا کہ یہ بینگن کاکے کی منجی کے سرہانے رسی میں باندھ کر کیل پر لٹکا دینا، جُوں جُوں بینگن سوکھتے جائیں گے وُوں وُوں کاکا صحت مند ہوتا جائے گا اور ساتھ ہی مولوی صاحب نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ چالیس دن تک ہر روز شام کُفتاں کی نماز کے بعد مسجد سے نکلنے والے نمازیوں سے کاکے کو دم کرایا جائے..... ماتا جی کہتی تھیں کہ بینگن جس تیزی سے سوکھ رہے تھے اُسی تیزی سے میرے ناتواں جسم میں ہوا بھر رہی تھی..... پتہ ہے......! میں مولوی حبیب اللہ صاحب کے علاج کے باعث دوسرا جنم جی رہا ہوں..... وگرنہ..... حکیموں اور

ڈاکٹروں نے تو مجھے لاعلاج بتا کر ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے..... ایک مدت تک پِتا جی نے' جناح کیپ جست کے پرانے ٹرنک میں چھپائے رکھی..... برسات کے برسات ماتا جی گرم کپڑوں کو ہوا لگواتیں تو پِتا جی ٹرنک میں سے جناح کیپ نکال کر سر پر رکھ لیتے اور شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر کہتے.....

''ساوتری دیکھ' جناح کیپ پہن کر میں پکّا مسلمان لگتا ہوں ..... کاش.....! ہمارے سیاسی نیتا سوجھ بوجھ کے مالک ہوتے اور فسادات کی آگ نہ بھڑکتی تو آج ہم اپنے پُرکھوں کی ہڈیوں سے بے وفائی کا دکھ نہ بھوگ رہے ہوتے.....''

اصولی طور پر یہاں آ کر مجھے آٹھویں جماعت میں داخل ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہاں سے میں ساتویں جماعت کا امتحان دے کر آیا تھا اور سکول کا رزلٹ کارڈ بھی مل گیا تھا جس میں اٹھونجا فیصد نمبر لے کر پاس ہوا تھا..... یہاں آ کر مسلمانوں کے سکول میں مجھے داخل کرانے کی یہی وجہ تھی کہ وہاں ہم نے ہندی زبان کی ایک کتاب کے علاوہ سارا کورس اُردو میں پڑھا تھا جس کی وجہ سے میری ہندی بہت کمزور تھی..... فیض عام سکول کے ہیڈ ماسٹر حفیظ الرحمٰن صاحب نے پِتا جی کو مشورہ دیا تھا.....

''آپ کا لڑکا ہندی میں کافی کمزور ہے لہٰذا اسے آٹھویں جماعت کے بجائے دوبارہ ساتویں کلاس میں داخلہ دلائیں' اس طرح تمام مضامین میں محنت کرنے کی بجائے' لڑکا ایک سال ہندی میں محنت کرے گا تو اس کی بنیاد مضبوط ہو جائے گی.....!''

''ہاں بھئی سنا ہے بڑی دور سے کلاس میں نیا مہمان آیا ہے..... ذرا کھڑا ہو کر اپنا تعارف تو کرائے.....'' ماسٹر جمعہ بخش کے حکم پر میں کافی نروس ہو گیا تھا..... مجھے پھر سے مہاجر کیمپ کی یاد آ گئی تھی.....!

''ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا.....؟''

''جی..... کشوری لال.....!''

''ولد.....؟''

''دھنّی رام.....''

''کہاں سے آئے ہو.....؟''

''راولپنڈی سے جی.....''

''پتہ.....؟''

''مکان نمبر ۴۵۶۹ مدن پورہ گوالمنڈی راولپنڈی.....''

''ہیں.....! گوالمنڈی راولپنڈی.....؟ سنا ہے وہاں تو بڑا خون خرابہ ہوا ہے..... تم کس طرح زندہ بچ آئے.....؟''

''بس جی پرماتما بچانے والا ہے..... راولپنڈی میں اللہ کا ایک نیک بندہ' میاں حیات بخش بستا ہے..... انہیں کے دم کرم سے میں اور میرے کئی پڑوسی زندہ سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے ہیں.....!''

''جی میرا نام بنواری لال ہے..... میں راولپنڈی' پاکستان سے آیا ہوں.....'' کھردرے لہجے اور پنجابی تلفظ کے باعث لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے مشکل سے ہنسی ضبط کی.....

''کلاس میں آنے کے بعد کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی.....؟''

''نہیں جی . . . . . کوئی تکلیف نہیں ہوئی ماسٹر صاحب ..... شریف الدین میرا دوست بن گیا ہے اور میں اُسی کے ساتھ بیٹھ رہا ہوں ..... کلاس کے باقی لڑکے بھی بہت اچھے ہیں.....''

''شریف الدین کے نام پر مت جانا..... یہ ہے بڑا شرارتی.....!''

☆

''اختلافات کی بنیاد کیا تھی.....؟''

''ارے بیٹا..... گڑے مُردے کیوں اُکھاڑتے ہو..... جانے دو' مٹی ڈالو.....!''

''کبھی آپ نوجوان نسل کو عقل مندی' ہوشیاری اور بُردباری کا سرٹیفکٹ دے کر ذمہ دار بنانے کی بات کرتے ہیں .....اور ..... کبھی .....؟''

''سرسری نظر سے دیکھیں تو اس لڑائی میں بہت سے عوامل کی کارفرمائی نظر آئے گی..... مثلاً..... نظریاتی بُعد..... معاشی تگ و دو..... معاشرتی تغیر و تبدل..... مسئلہ حقیقت میں انائی تھا..... آپا نے شروع دن سے حاکمانہ مزاج پایا تھا..... اُن کی رائے سے اختلاف ایک طرح سے اُن کے لئے چیلنج ہوا کرتا تھا جسے قبول کر کے' مدمقابل کو ہر قیمت پر زیر کرنا اُن کی اولین خواہش ہوا کرتی تھی..... ہمارے نانا جنگلات ٹھیکے پر لیا کرتے تھے جس کے باعث روپے پیسے کی فراوانی تھی..... آپا چونکہ اُن کی پہلی اولاد تھیں اس لئے اُن کی پرورش میں بیجا ناز و نعم کو کافی دخل تھا..... اوّل تو نانا مرحوم اس رشتے پر تیار نہ تھے کیونکہ شادی کے وقت ہمارے والد صرف ساٹھ روپے ماہوار کے ملازم تھے..... لے دے کے ایک پلس پوائنٹ اُن کی وجاہت اور قد بت تھا جسے ڈھال بنا کر دادی صاحبہ نے ترکش کے تمام تیر آزما کر آپا کا رشتہ حاصل تو کر لیا ..... مگر..... سسرال والوں کے سر پر ہمیشہ اُن کی لات رہی۔

.....میں تو بڑے باپ کی بیٹی ہوں..... جہیز میں چاندی کی اینٹ اور تانبے کے پائے والا پلنگ لے کر آئی ہوں..... میرے برابر کوئی جہیز لا کر تو دکھائے..... میرے ابّا تو اس رشتے پر آمادہ ہی نہیں تھے..... میری تو قسمت پھوٹ گئی..... بھلا ساٹھ روپلّی ماہوار میں کبھی کوئی گھر چلا ہے..... سر ڈھکو تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھکو تو سر ننگا..... وغیرہ وغیرہ..... کئی برس تک ابّا کے 'لو پروفائل' نے معاملہ نبھائے رکھا..... دادی کے بقول ابّا نے آپا کی دلجوئی اور ناز برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جس کے باعث اوائل دنوں میں دونوں میاں بیوی کے درمیان محبت اور گرم جوشی کے آثار بھی نظر آیا کرتے..... ابّا جب بھی کانوائے پر دہلی جاتے تو واپسی پر آپا کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر آتے..... آپا بھی

آدھی آدھی رات تک دروازے میں کھڑے ہو کر اُن کا انتظار کرتیں اور ابّا کے آنے پر دونوں اکٹھے کھانا کھاتے..... آہستہ آہستہ خاندان میں اضافے اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث تمام محبت و اُنسیت سرد مہری اور تلخی میں تبدیل ہوتی گئی..... تقسیم کے بعد..... ہندوستان.....یا.....پاکستان کے انتخاب کی تکرار وقت گزرنے کے ساتھ شدت اختیار کرتی گئی..... بظاہر ابّا نے سیدھا سادا عُذر، سرکاری ملازمت کا تراش رکھا تھا..... آپا نہ صرف اس دلیل کو بودا قرار دیتیں..... بلکہ..... ابّا کی کسی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھیں.....ایک ہی استدلال.....بڑے ماموں کی پاکستان میں خوشحالی اور بار بار کے بلاوے تھے..... ابّا کو شروع دن سے اپنے بزرگوں سے بڑی اُنسیت اور لگاؤ تھا..... وہ کسی قیمت پر اپنے بزرگوں کی قبروں سے بے وفائی کرنا نہ چاہتے تھے..... ہر جمعرات کو باقاعدگی سے آبائی قبرستان جا کر فاتحہ خوانی کرتے اور گورکن کو کچھ نہ کچھ نذر نیاز دے کر خستہ حال قبروں کی صحیح نگہداشت کی تاکید کیا کرتے.....

ایک معقول عُذر ابّا کے پاس اپنی ضعیف والدہ کی خدمت اور تیمارداری کا بھی تھا..... ۱۹۵۰ء میں روز روز کے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر، دادی صاحبہ اپنے بڑے بیٹے یعنی ہمارے تایا کے پاس پاکستان روانہ ہو گئیں تو ابّا کے مضبوط سائبان میں اک اور بڑا شگاف پڑ گیا جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپا نے فیصلہ کُن جنگ کا آغاز کر دیا جس میں اُنھیں اپنے منجھلے ماموں یعقوب کی درپردہ اور ہمارے چھوٹے ماموں جمیل کی بھرپور حمایت حاصل تھی..... ابّا ہمارے ہوش سنبھالنے کے بعد سے دوپہر کا کھانا نہ کھاتے تھے رات کے باسی سالن سے دو روٹیاں کھا کر چائے کا ایک کپ پیتے اور اس کے بعد پھوّارہ چھاپ بیڑی سے جی بہلا کر دفتر چلے جاتے..... چار بجے شام دفتر سے واپسی پر گھر کا سودا سلف لا کر مغرب کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھاتے اور پھر مسجد چلے جاتے.....جب سے گھر میں ہندوستان اور پاکستان کے نام پر کھُلی جنگ کا آغاز ہوا تھا اُس دن کے بعد سے گھر کا چولہا اکثر ٹھنڈا رہنے لگا تھا..... والدہ کی چڑچڑاہٹ اور غصیلا پن زوروں پر تھا..... میاں بیوی کے جھگڑوں کا سارا زور اولاد کی مار پیٹ اور جھٹک پٹک پر ٹوٹتا..... آپا کا زیادہ وقت ماموں یا اپنے پیر جی کے پاس حاضری میں گزرتا تھا جس کے باعث گھر کا ماحول کشیدگی کی انتہاؤں کو چھونے لگا تھا..... کئی بار..... نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچی..... حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ گھر میں کئی کئی وقت چولہا نہ جلتا اس کے باوجود پونیا لالہ کا قرض بڑھتا جا رہا تھا..... ہم بہن بھائیوں کو روکھی سوکھی روٹی، باسی سالن یا سبّو چاچا، وحید چاچا، تاج بھیّا کے گھر سے مانگے کا سالن کھلا کر خاموش کر دیا جاتا..... ابّا اکثر راتوں کو چنے کھا کر سو جاتے اور کبھی کبھی ناشتے میں چندی چاچا کی دکان سے، دو پیسے کی چائے اور دو پیسے کا کھاسالے کر ناشتہ کرتے اور خاموشی سے دفتر چلے جاتے.....

ایک دن ابّا دفتر سے لوٹے تو گھر کا سامان غائب اور دروازے پر موٹا تالا پڑا ہوا تھا..... آپا گھر کا سارا قیمتی سامان لے کر جو بقول اُن کے انہیں جہیز میں ملا تھا اپنے ماموں کے گھر واقع تلّیا محلّہ چلی گئی تھیں..... بڑی بہن شاہدہ باجی کی والدہ سے بہت گھٹتی تھی اور وہ اُن کا کہا بھی مانتی تھیں اس لئے وہ بھی والدہ کے ہمراہ چلی گئی تھیں..... چھوٹا بھائی اسرار شیر خوار تھا اس لئے وہ بھی والدہ کے ہمراہ تھا..... میں اور نجمہ سکول سے واپس آئے تو گھر میں تالا دیکھ کر سیدھے، سُشیل چچا کے گھر والدہ کا پتہ کرنے پہنچ گئے..... سُشیل چچا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اُن کی بیوی ہر وقت شوخ رنگ کی ساڑھی پہنے مانگ میں سیندور اور ماتھے پر بڑی سی بندی لگائے، پیروں میں چاندی کی پازیب پہنے چھن چھن کرتی نظر آیا کرتیں اور سُشیل چچا کی ماتا جی دالان میں پڑے تخت پر، ماتھے پر بل ڈالے بیزاری سے اُنہیں دیکھا کرتیں..... ہمارے استفسار پر سُشیل چچا کی ماتا جی نے ہماری بات کا جواب دینے کے بجائے، ہمارے گھر کی لڑائی کے موضوع پر بے تکان بولنا شروع کر دیا وہ کبھی ابّا کو معصوم گردانے لگتیں اور کبھی آپا کو مظلوم کہنے لگتیں..... سُشیل چچا کی نئی نویلی دلہن نے ہمارے آگے کھانے کی کئی چیزیں رکھیں اُن کے اصرار کے باوجود ہم دونوں بہن بھائی، کچھ بھی ڈھنگ سے نہ کھا سکے بار بار ذہن آپا کی غیر موجودگی اور گھر کے دروازے پر پڑے تالے کی جانب جا رہا تھا.....

تین دن بعد آپا کی جانب سے خلع کا نوٹس ملا تو ابّا کے اوسان خطا ہو گئے..... گھبراہٹ میں کہتے کچھ تھے، زبان سے کچھ نکلتا تھا..... لے دے کے اُن کے واحد ہمدرد و غمگسار اُستاد عبدالرحمٰن تھے جن کا مختصر رقعہ لے کر شہر کے معروف وکیل تنصیر علی شاہ کے پاس پہنچ گئے..... شاہ صاحب نے نوٹس کا جواب اسلامی شرع کے مطابق تحریر کرایا۔ جس کی رو سے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالنے والی عورت نکاح سے باہر تصور کی جاتی ہے..... شاہ صاحب نے سات دن کے اندر والدہ صاحبہ کو بمعہ سامان گھر لوٹنے اور شوہر سے معافی مانگنے کی تاکید کی تھی بصورت دیگر عدالت میں بھاری ہرجانے کا دعویٰ دائر کرنے کی دھمکی دی گئی تھی.....

ابّا بتاتے تھے، نوٹس وصول کرتے ہی والدہ اور اُن کی ممانی زار و قطار، رونے لگی تھیں۔ اُس رات کافی دیر تک اُن کے گھر آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہا تھا..... دوسرے دن قریب دو بجے ہمارے گھر جمیل ماموں آئے ..... خلاف توقع اُن کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ جس کا ثبوت اُن کی جیب میں بھری ٹافیاں تھیں..... ماموں مجھے اپنے ہمراہ یہ کہہ کر لے گئے کہ آپا کی طبیعت سخت خراب ہے اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے بے چین ہیں.....

آپا کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اُن کی آنکھیں بھی سوجھی ہوئی تھیں..... کافی دیر تک وہ مجھے سینے سے لگائے روتی رہیں، بعد میں ابّا کی زیادتیوں کا گلہ کر کے اُنہیں بُرا بھلا کہنے لگیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا..... کچھ دیر بعد وقفے وقفے سے مجھے کئی بار بازار سے روزمرّہ ضروریات کی اشیا خریدنے کے لئے بھیجا گیا..... بعد از مغرب آپا اپنی خالہ کے گھر مجھے ساتھ لے کر گئیں اور اوپر کی کوٹھی میں کافی دیر تک، اُن کے ساتھ کھسر پھسر کرتی رہیں..... میں نے کئی بار، ابّا کی پریشانی اور ان کی اجازت کے بغیر آنے کا عذر پیش کر کے، آپا سے اجازت لینے کی

کوشش کی..... ہر بار آپا سے زیادہ اُن کی ممانی یہ کہہ کر میرا منہ بند کرا دیتیں.....

''باپ کی اتنی فکر ہے اور ماں مری جارہی ہے اُس کی کوئی پرواہ نہیں.....!''

کچھ دیر بعد شور بے والے آلو اور چند روٹیاں والدہ کی ممانی نے لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں.....

''تم کھاؤ میں ابھی آتی ہوں.....''

آپا پھر سے دوسری کوٹھری میں دروازہ بند کر کے مصروف ہو گئیں .....اتنے میں آپا کے ماموں رکشہ لے کر آ گئے اور یہ کہہ کر مجھے اور اسرار کو آپا کے ساتھ سائیکل رکشہ میں سوار کرا دیا گیا.....

''شرفو بیٹا.....! تمہاری والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور ڈاکٹر ناگن نے دلّی کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں دکھانے کو کہا ہے جہاں صبح صبح لمبی لائن لگتی ہے تب جا کر نمبر آتا ہے.....''

''مگر میں ابّا کو بتا کر نہیں آیا.....؟''

''تم اُس کی فکر نہ کرو میں ابھی تمہارے ابّا کو بتا کر آ رہا ہوں انہوں نے خوشی سے تمہیں والدہ کے ساتھ دلّی جانے کی اجازت دے دی ہے.....!''

میرٹھ سے دلّی تک کے سفر میں' میرا دل کافی کُھد بُد کرتا رہا اور جب دلی کے اسٹیشن پر اچانک جمیل ماموں وارد ہوئے اور اُن کے ساتھ شاہدہ باجی کے علاوہ لوہے کا ایک ٹرنک اور کپڑوں کی چھوٹی بڑی پوٹلیاں نظر آئیں تو میرا ماتھا ٹھنکا..... میں نے آپا سے احتجاج کرتے ہوئے حقیقت جاننے کی کوشش کی.....!

''اجی تم بتاتی کیوں نہیں..... ماجرا کیا ہے..... ہم لوگ کہاں جارہے ہیں..... ہاں نہیں تو..... مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے..... دسویں میں پڑھتا ہوں.....!''

''ابے تُو چُپکا نی رہ سکتا.....! بڑا آیا دسویں کا فلانا..... ایک رپٹا دوں گا سالے کی کنپٹی پر..... چاروں طبق روشن ہو جاویں گے.....!''

دلّی اسٹیشن کے ویران اور سنسان پلیٹ فارم پر' آدھی رات کے قریب ایک ریل گاڑی آ کر لگی جس میں ہماری طرح کے بہت سے ڈرے سہمے خستہ حال لوگ' بھاگا دوڑی کرتے ہوئے سوار ہو گئے..... آپا کے ماموں نے ہم پانچوں یعنی آپا' جمیل ماموں' شاہدہ باجی' اسرار اور مجھے ٹرین میں سوار کرایا اور خود کچھ دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑے' آپا کے کان میں اُنہیں کچھ سمجھاتے رہے اور پھر اونچی آواز میں مصنوعی طریقے سے اونچا اونچا بولنے لگے.....!

''ہاں ہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں پرسوں تک تو آ ہی جاؤ گے تم لوگ..... فکر کی کوئی بات نہیں' یہاں میں سب کچھ سنبھال لوں گا.....!''

☆

''آہ..... ہا..... انگریزی کے پیریڈ میں فرید کے لمبے بال کھینچتے ہوئے ماسٹر حشمت علی کہہ رہے تھے.....!''

''یور پین چلا گیا' چُوڑ پین چھوڑ گیا..... کل تک یہ گھنی زلفیں انسانی شکل میں نہ آئیں تو تمہیں بھی سکول آنے کی کوئی ضرورت نہیں.....!''

ماسٹر حشمت علی دھیمے مزاج کے انسان تھے..... خاندانی وجاہت بھی چہرے پر ٹپکتی تھی مگر بات کو کھینچتے بہت لمبا تھے..... خدا جانے فرید کی ابھی اور کتنی شامت آنا تھی' ہاتھ میں نیلے رنگ کا جہازی رجسٹر پکڑے' چچا کالے خان نمودار ہو گئے' پہلے ماسٹر حشمت صاحب سے کسی کاغذ پر دستخط کرائے پھر میری طرف منہ کر کے مخاطب ہوئے.....''

''تمہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نے بلایا ہے.....!''

''اُن سے کہنا پیریڈ ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی ہیں بنواری لال اُس کے بعد آئے گا.....''

ماسٹر حشمت علی کے حکم پر چچا کالے خان سر ہلاتے ہوئے.....

''جی بہت اچھا.....!''

کہہ کر باہر نکل گئے ساتھ ہی میری ہوا بھی نکال گئے..... پوری کلاس میں' ہیڈ ماسٹر صاحب کو صرف میری یاد کیوں آئی.....؟''

''مے آئی کم اِن سر.....؟''

''ہاں' ہاں آؤ..... تمہارے نام کا وارنٹ آیا ہے پاکستان سے.....' انہوں نے لکھا ہے کہ جلد از جلد تمہیں پاکستان پارسل کر دیا جائے.....!''

''جی سر.....؟''

حلق میں چبھتی خوف کی پھانس کو نگلتے ہوئے بمشکل آواز باہر آسکی.....

''ڈرو نہیں تمہارے کسی عزیز کا پاکستان سے خط آیا ہے.....!''

''میرے عزیز کا..... پاکستان سے.....؟''

''ہاں بھئی اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے..... بھیجنے والے نے صاف صاف لفظوں میں تمہارا نام و پتہ لکھا ہے..... بنواری لال' ولد کشوری لال' کلاس دہم' فیض عام ہائی سکول' صدر بازار میرٹھ' یوپی۔ انڈیا..... بھیجنے والے نے اپنا نام پتا لکھا ہوتا تو ابھی معلوم ہو جاتا کہ خط بھیجنے والا کون ہے..... خیر تم گھر جا کر آرام سے پڑھنا اور اپنے والد صاحب کو بھی پڑھوانا شاید یہ انہی کے لئے ہو.....!''

اسکول سے گھر کا فاصلہ چند منٹوں کا تھا جو آج گھنٹوں پر محیط لگ رہا تھا..... طرح طرح کے خیال دل کو ہولا رہے تھے..... پاکستان سے میرے نام کس کا خط آ سکتا ہے..... ہمارے سارے رشتے دار' ہماری طرح شرنارتھی بن کر اِدھر آ گئے ہیں..... ہوسکتا ہے میرے گوالمنڈی والے سکول سے آیا ہو یہ خط..... جس دن پتا جی نے آخری بار مجھے سکول کی فیس دی تھی اُس دن شہر میں ہنگامے ہو گئے تھے اور سکول لگنے کے تھوڑی دیر بعد ہمیں چھٹی دے دی گئی تھی..... میں نے فیس کے پیسے پتا جی کو لوٹانے کے بجائے خود ہی غائب غلہ کر لیئے تھے..... ہوسکتا ہے یہ لالہ لکشمی نارائن کا خط ہو' انہوں نے اپنا اُدھار طلب کرنے کے لئے' میرے نام سکول کے پتے پر ڈالا ہو..... ایک مرتبہ دُرگا پوجا کے لئے ماتا جی نے پیسے دے کر لکشمی نارائن سے پوجا کا سامان لانے کو کہا تھا' میں نے وہ پیسے گڈّی اور پتنگ

خرید نے پر لگا دیئے تھے بعد میں ماتا جی کا نام لے کر' لالہ لکشمی نارائن سے پوجا کا سامان اُدھار لے آیا تھا..... یہ کس طرح ممکن ہے.....؟ لالہ لکشمی نارائن بھی ہماری طرح ہندو تھا..... ہم تو پھر بھی مسلمانوں سے شیر وشکر تھے لکشمی نارائن تو کٹر ہندو برہمن تھا..... دکان کھولنے سے پہلے اشنان کرتا اُس کے بعد پوجا کے لئے کباڑی بازار کے مندر جاتا' دکان کھول کر چاروں پاسے پوتر جَل کے چھینٹے مارتا اور دیر تک آنکھیں بند کر کے من ہی من میں جاپ کرتا..... اس دوران کوئی گاہک آ جاتا تو اشاروں اشاروں میں لکشمی نارائن اُسے ڈانٹ کر سودا دینے سے منع کر دیتا..... بھلا وہ اب تک راولپنڈی میں کیا کر رہا ہوگا..... اچانک میرے ذہن میں ملک منظور کا چہرہ گھوم گیا۔ جس کی سائیکل کی دکان سے میں نے کئی بار کرائے پر سائیکل لے کر چلائی تھی..... ابھی بھی میرے ذمے اُس کے چھ آنے بقایا ہیں..... ہو نہ ہو یہ خط ملک منظور کا ہی ہے..... ملک منظور کو میرے سکول کا پتہ کیسے چلا.....؟

''پیارے بنواری لال عرف بنّے.....!''

خط کی پیشانی پر اپنا نام اور پیارے پڑھنے کے باوجود دل کی دھونکنی بے حساب دھونک رہی تھی..... من کی تسلی کے لئے بند دروازے پر پھر سے نظر ڈال کر کمرے میں اکیلے پن کا اطمینان کرتے ہوئے منجی پر ڈھیر ہو کر قمیض کے دامن سے ہوا کرتے ہوئے پھر سے خط پڑھنا شروع کیا.....

''پیارے بنواری لال عرف بنّے.....!''

سمجھ نہیں آتا.....! تجھے..... اسلام علیکم لکھوں' نمسکار' آداب یا رام رام.....! تُو کہا کرتا تھا کہ تجھے میرٹھ شہر پنجرے کی مانند لگتا ہے جس میں آزاد پنچھی کو قید کر دیا گیا ہے..... سچ مان' تیری بات سُن کر' میں دل ہی دل میں کُڑھتا تھا..... اُٹھتے' بیٹھتے راولپنڈی کے کنوؤں کا میٹھا پانی' کمپنی باغ کی اُجلی صبحیں' دسہرا گراؤنڈ کی ٹھنڈی ہوائیں اور راجہ بازار کی سلونی شامیں یاد کر کے تُو آہیں بھرا کرتا تھا تو میں تجھے عقل سے کھسکا ہوا سمجھ کر خاموش ہو جاتا تھا..... مگر دوست.....! بُرا مت منانا..... قسمت مجھے میرے ارمانوں کی خاک' میرٹھ سے اُڑا کر راولپنڈی لے آئی ہے تو مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پَر کاٹ کر میرے ارمانوں پر لوہے کا کنٹوپ پہنا دیا ہو..... مجھے بھی شدت سے' میرٹھ کی بھینسالی' بیگم پل کی پینٹھ' کوٹھی جنت نشاں' گھنٹہ گھر اور لالّہ کا مقبرہ یاد آتے ہیں..... شائد تُو میرے سچ پر' مجھ سے خفا ہو جائے..... مگر دوست میں اُس وقت تجھ سے خفا نہیں ہوا تھا جب تو میرٹھ کو بے کیف' ویران اور مُردہ شہر کہا کرتا تھا..... میں راولپنڈی شہر کے بارے میں یہ سب تو نہیں کہہ پاؤں گا البتہ.....! اتنا ضرور کہوں گا کہ میں خود تو راولپنڈی پہنچ گیا ہوں' میرے خواب میرٹھ میں بھٹک رہے ہیں.....!''

اِس کے بعد چار صفحے میں دوسرا پورا صفحہ شریفے نے اُس تفصیل سے بھر دیا تھا کہ وہ کس طرح رات کی تاریکی میں اپنی والدہ اور ماموں کے ساتھ' دہلی سے کھوکھراپار' کراچی' لاہور اور پھر راولپنڈی پہنچا اور کس طرح وہ اپنے والد اور بہن کے لئے تڑپتا اور ہر گھڑی اُن کو یاد کرتا ہے..... تیسرے صفحے پر پہنچ کر شریفے نے پھر سے آپس کی باتیں شروع کر دی تھیں.....!

''یار بنّے.....! یہاں آ کر میں بہت پچھتاتا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ چار سال کی دوستی میں اگر پنجابی کے چند بول سیکھ لئے ہوتے تو مجھے لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا..... راولپنڈی پہنچنے کے تیسرے روز ہی ماموں نے ملک بنارس کے گھر' مجھے دودھ لینے بھیج دیا..... مجھ سے پہلے بھی وہاں کئی لوگ' رنگ برنگے تہبند باندھے اور شلواریں پہنے دودھ لینے کے انتظار میں کھڑے' پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے جس کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہیں پڑ رہا تھا..... میری باری پر ملک بنارس نے' مجھ سے دریافت کیا.....

''کِنّا کھڑسو.....؟''

میں ہونّق بن کر اُس کا منہ دیکھنے لگا..... میری طرف سے جواب نہ پا کر اُس نے پھر دریافت کیا.....

''باؤ جی.....! کِنّا کھڑسو.....؟''

میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر' ساتھ کھڑے پکی عمر کے آدمی نے' بائیں ہاتھ کی چھنگلیا میں دبے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کہا.....!

''ان کا مطبل ہے آپ کو کتنا دودھ چاہیے.....؟''

گو کہ ان صاحب کا لہجہ بھی ایسا تھا جیسے کسی گھوٹ رہے ہوں مگر مفہوم میری سمجھ میں آ چکا تھا..... دو سیر کہہ کر جلدی سے برتن آگے بڑھا دیا.....

دو دن بعد دوپہر کے وقت ممانی نے کہا.....!

''اے بھیا.....! ذرا ہمیں آدھا سیر شلجم تو لا دو..... تمہارے ماموں کو شلجم گوشت بہت پسند ہے.....!''

سبزی والا کچھ دیر تو' حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر ہاتھ کے اشارے سے بائیں گلی میں حکیم کی دکان کا پتہ سمجھانے لگا..... میں نے شلجم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا.....!

''حکیم سے کیا کام مجھے تو شلجم چاہیں.....!''

دانتوں میں زبان دباتے ہوئے' سبزی والا پنجابی میں گویا ہوا.....!

''اینج کہو نا.....! ٹھہر چاہی دے نے..... تُسی کہیہ شلجام' شلجام لائی ہوئی اے.....؟''

کل رات کی بات ہے.....! ماموں کے دوست اور کاروباری شریک راجا زمان نے ہم لوگوں کی دعوت کی۔ جانا تو جمیل ماموں کو بھی تھا مگر وہ کاروبار کے سلسلے میں نیکاری بازار میں دکان دیکھنے چلے گئے..... ہم لوگ زمان ماموں کے گھر پہنچے تو آپا' شاہدہ باجی اور اسرار زنان خانے میں چلے گئے اور مجھے زمان صاحب کے ساتھ بیٹھک میں بٹھا دیا گیا..... کچھ دیر بعد زمان صاحب کے ایک دوست راجا مہربان بھی آ گئے جو تفصیل کے ساتھ میرٹھ کے لوگوں کے رہن سہن اور مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے رہے..... تھوڑی دیر میں زمان ماموں کا دس بارہ سال کا بیٹا سجاول باری باری چاول' سالن کے ڈونگے اور ڈش کے علاوہ پانی کا جگ' گلاس اور

پلیٹیں وغیرہ سینٹر ٹیبل پر سجا چکا تو میزبان نے مجھے کھانا شروع کرنے کی دعوت دی.....!

''شروع کرو بیٹا.....!''

''جی.....!''

کچھ دیر بعد زمان ماموں کے دوست بولے.....!

''دیر کس بات کی ہے..... شروع کیجئے نا.....!''

باری باری دونوں حضرات کی طرف دیکھتے ہوئے' دو مرتبہ میں نے جی جی کہا اور زنان خانے سے کچھ برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگا.....!

''بھئی آپ تو بہت شرمیلے ہیں.....!''

میری پلیٹ میں پہلے سادے چاول اور اُس کے اوپر' آلو گوشت کا سالن ڈالتے ہوئے زمان ماموں کے دوست نے میری مشکل آسان کر دی..... وگرنہ میں سالن کے ساتھ کھانے کے لئے روٹیوں کا انتظار ہی کرتا رہتا.....

ابھی بہت ساری باتیں لکھنے والی ہیں جن سے تم میری پریشانی کا اندازہ لگا سکتے ہو..... اب دیکھو اتنی دیر سے اُردو لکھتے ہوئے میری انگلیاں دُکھنے اور دماغ تھکنے لگا ہے..... میں تمہاری سہولت کے لئے آئندہ بھی تمہیں اردو میں خط لکھتا رہوں گا..... تم بھی میری ہندی کو درست رکھنے کے لئے میرے خط کا جواب ہندی میں تحریر کرنا..... تم اکثر راولپنڈی میں اپنے گھر اور محلے کی بابت بتایا کرتے تھے جسے ہم ہوا میں اُڑا دیا کرتے تھے..... گھر سے دوری کے عذاب نے' تمہارا درد سمجھنے اور محسوس کرنے کے ساتھ اُسے دور کرنے کی تڑپ بھی دل میں پیدا کی ہے..... تم اپنے خط میں میرٹھ کے موجودہ پتے کے ساتھ راولپنڈی میں اپنا سابقہ پتہ ضرور لکھنا..... میں تمہارا کھویا ہوا بچپن تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا' تم بھی میرٹھ کی گلیوں میں میری نوعمری کو گم نہ ہونے دینا..... اپنی پڑھائی اور کلاس کے تمام دوستوں کی خیریت کی اطلاع ضرور تحریر کرنا..... امتحان نزدیک ہونے کے باعث' مجھے اسکول میں داخلہ نہ مل سکا ہے..... ماموں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں دسویں کا امتحان پرائیویٹ دوں..... ایک ہفتے سے ماسٹر صاحب ٹیوشن پڑھانے آ رہے ہیں..... بظاہر بڑے ہنس مکھ اور لطیفہ گو ہیں مشکور صاحب مگر اُن کے کمزور سینے میں غم کے کئی پہاڑ کھڑے ہیں..... سنا ہے.....! ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے پاکستان آتے ہوئے اُن کا سارا کنبہ بمعہ اُن کی ایک سالہ بچی کے فسادیوں نے قتل کر دیا تھا..... مشکور صاحب اپنی زبان سے' ایک لفظ بھی اپنے اوپر بیتنے والے ظلم کی بابت بیان نہیں کرتے اگر کوئی ذکر چھیڑے تو صرف اتنا کہتے ہیں.....! ''وہ سب جانیں' میرے پاکستان کی امانت تھیں اور پاکستان پر قربان ہو گئیں..... پھر افسوس کس بات کا.....؟''

اتنا کہہ کر مشکور صاحب' دیر تک فضاؤں میں گھورتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اُن کے ہاتھ میں لگا سگریٹ جب اُن کی جلد کو جلانے لگتا ہے تو وہ چونک کر واپس پلٹ آتے ہیں..... بتّے میرے یار.....! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا کفّارہ ادا نہ کر سکوں گا..... تم اگر چاہو تو میرا قرض ادا کرنے کا ایک طریقہ تمہارے پاس ہے..... میرے والد کو کبھی میری کمی محسوس نہ ہونے دینا اور ہر طرح سے اُن کا اور میری بہن کا خیال رکھنا..... میں جب بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو ضرور اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی کوتاہیوں کی تلافی کروں گا..... اپنی اور اپنے گھر والوں کی خیر خیریت تفصیل سے لکھنا..... اور اُن کی بھی.....؟

راولپنڈی میں میرا پتہ یہ ہے مکان نمبر پی/۳۰۷' مائی ویرو کی بنّی' راولپنڈی پاکستان

تمہارا اپنا شریف الدین

☆

ہاں..... ہاں کیوں نہیں.....! کھُسر پھُسر اور خفیہ میٹنگ کے بعد سب کا خیال تھا کہ یہ خط ابّا نے بھیجا ہے..... جو مجھے ورغلا کر واپس بُلانا چاہتے ہیں..... خط کو پڑھنے اور اُس کے ایک ایک مندرجات پر غور کرنے کے بعد بھی خط کے پیچھے ابّا کی کارفرمائی تلاش کی جاتی رہی.....!

''سنو.....! یہ بنواری لال کون ہے.....؟'' آپا نے چبھتی نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''میرا دوست ہے..... یہیں کا رہنے والا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مہاجر بن کر گئے ہیں یہ لوگ..... فیض عام سکول میں ساتویں سے دسویں تک ہم دونوں ساتھ تھے..... بڑا گہرا دوست بن گیا تھا میرا..... چار سال تک ہم لوگ چاروں کلاسوں میں ایک ساتھ ہی بیٹھتے تھے..... آپ بھول گئیں یہ وہ ہی بنواری لال ہے جب ابّا نے آٹھویں کلاس میں بورڈ کا امتحان دینے کے بعد' رزلٹ آنے سے پہلے ہی مجھے سلائی مشینوں کے کام پر ڈال دیا تھا۔ یہ باقاعدہ ابّا سے آ کر لڑا تھا اور جب ابّا نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ سیدھا ماسٹر اشفاق حسین کے پاس چلا گیا تھا..... ابّا کی نسبت ماسٹر اشفاق حسین کو اس بات پر قائل کرنا آسان تھا کہ ایک لائق لڑکے کو پڑھائی سے اُٹھا کر کام پر لگانا غلط بات ہے..... بنواری لال ابّا کے آگے بے بس تھا اور ابّا ماسٹر اشفاق حسین کے آگے نہ بول سکے..... ماسٹر اشفاق حسین نے ابّا کی جانب سے اخراجات کا عذر پیش کرنے پر' میری پڑھائی کا سارا خرچ اپنے ذمّے لینے کی آفر کی تو ابّا پر گھڑوں پانی پڑ گیا جس کے بعد میری پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا.....!''

''اچھا..... اچھا یہ مٹّھی والا تو نہیں.....؟''

''آپا.....! مٹّھی نہیں..... مٹھی..... آپ نے تو کمال کر دیا' میں جب پہلی مرتبہ اُس کے گھر گیا تھا تو مٹّھی کو میٹھی کہہ رہا تھا جس پر بتّے نے میرا تلفظ صحیح کرتے ہوئے کہا تھا.....!''

''بھولے بادشاہ.....! یہ میٹھی نہیں نمکین ہے..... جس طرح آپ لوگ شام کی چائے یا مہمان نوازی میں نمک پارے استعمال کرتے ہو اسی طرح پنجاب کے لوگ' مہمان داری اور شام کی چائے میں اسے شوق سے کھاتے ہیں..... بزرگ اور بیمار لوگ جو صبح کے ناشتے میں لسّی وغیرہ نہیں پیتے اور ہلکا ناشتہ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسے شوق سے کھاتے ہیں..... تم لوگ نمک پارے

کے میدے کو سیدھا سیدھا نمک والے پانی میں گوندھ لیتے ہو جب کہ ہم لوگ مٹھی کے میدے میں' سفید زیرا' نمک' دودھ اور الائچی ملا کر گوندھتے ہیں۔ جس سے اس کا سواد چنک جاتا ہے.....!''

''اچھا اچھا..... جو بھی ہے مَٹھی' مُٹھی یا میٹھی..... ہمیں کیا لینا ہے تم یہ خط لو' لمبی چوڑی دوستی یا خط و کتابت کی ضرورت نہیں..... ویسے بھی ہمارا اب انڈیا سے کیا تعلق..... ختم کرو یہ چونچلے بازی.....!'' آپا کی سنگدلی پر بہت سے تیز دھار جملے' زبان کی نوک پر آ کر مچلنے لگے..... میرے لئے خاموشی کی چادر میں منہ لپیٹنا ہی مناسب تھا۔ کیوں کہ ابھی تک بنواری لال کا خط آپا کے ہاتھوں کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہا تھا.....!

☆

بے شرم..... بے مروت..... بے وفا.....!

رام رام..... سلام..... آداب..... یا نمسکار لکھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا..... فرق پڑتا ہے بندے کی سوچ سے..... اُس کے کرموں سے..... سمجھ نہیں آتا تیری جُدائی کو کیا نام دوں..... تجھے کس القاب سے پکاروں..... بھائی کہوں یا دوست..... اپنا کہوں یا بیگانہ.....! تیرا خط ملنے کے بعد سے میرے اوپر بڑی عجیب کیفیت طاری ہے۔ سچّی پسلی سے خوشی کی لہر اُٹھتی ہے اور کھبّی پسلی پر جا کر درد کی ٹیس میں تبدیل ہو جاتی ہے..... جانے کے بعد تُو نے مجھے یاد رکھا' اپنے دُکھ سکھ میں شریک کیا۔ اس سے میرا سینہ اور بھی چوڑا ہو گیا ہے..... تُو مسلمان ہے..... تیری تمناؤں کا مرکز کعبہ اور مدینہ ہے..... میں تو ہندو دھرم سے تعلق رکھتا ہوں..... میرا کعبہ اور مدینہ تو وہیں ہے جہاں تُو اب جا پہنچا ہے..... یہی سوچ کر میرے خون میں خوشی کے اُبالے پڑنے لگے ہیں..... ہمارے پنجاب میں..... عورتیں دوپٹہ وٹ بہنیں اور مرد صافہ بدل بھائی بنتے تھے..... قدرت نے ہم دونوں کو شہر وٹ بھرا بنا دیا ہے..... آج سے پہلے تُو میرا یار تھا..... آج کے بعد تُو میرا بھائی ہے..... شہر بدل بھائی..... ماں جائے سے بڑھ کر سگا اور عزیز.....!

اور یہ تُو زبان کے اُلٹ پھیر سے جی ہولا نہ کرنا..... زبان کا کیا ہے یہ تو ویسے بھی تِلک جاتی ہے..... پچھلے ہفتے یہاں بارشوں کا بڑا زور تھا..... ہمارے ساتھ والوں کی چھت اور ہماری چھت کا پانی ایک ہی نالی سے گزرتا ہے جس کا راستہ ساتھ والوں کی طرف ہے..... جب ہماری چھت پر بہت سا پانی کھڑا ہو گیا تو پِتا جی نے ساتھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹا کر پانی کی بابت بتایا..... کافی دیر تک دونوں بندے ایک ساتھ بولتے رہے پھر پِتا جی کی اونچی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی.....!

''شاہ صاحب! آپ نے جو عرض کی وہ میں نے سُن لی ہے جو کچھ میں فرما رہا ہوں وہ بھی تو سُنیں..... پرنالے کا رُخ آپ کی چھت پر ہے یا تو آپ اُس کی صفائی کا ذمہ نبھائیں یا ہمیں حکم کریں کہ آپ کی چھت پر آ کر بند پرنالے کو کھولیں.....!''

گفتگو کے آغاز میں شاہ صاحب مُٹھے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دیتے تھے..... پِتا جی کی گفتگو سُن کر ان کے ماتھے کے بَل بھی دُور ہو گئے اور وہ مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہو گئے.....

''اچھا' اچھا جیسے آپ فرمائیں گے ویسا ہی ہو گا.....!''

اور ہاں ایک بات پلّے باندھ لے' پنجابی زبان کو مشکل یا بیگانی بولی سمجھ کر گھبرائیں نا.....! یہ بڑی میٹھی اور سوادی زبان ہے..... بندہ اس میں جتنا کُھبتا جاتا ہے اُتنی ہی یہ بندے کے اندر رچتی جاتی ہے..... ماں کی محبت کی طرح کبھی نہ ختم ہونے والی..... تُو اِس طرح کر' روزانہ پنجابی کے دو چار اکھٹ بول..... میرا مطلب ہے سخت الفاظ کی' تنہائی میں مشق کیا کر..... جس طرح میں..... ہسپ تال کو ہسپتال..... گو... شت کو گوشت..... چول کو چاول اور مجھ کو پھینس اور اب بھینس کرنے پر لگا ہوں اِسی طرح تُو بھی..... آپ' جناب کو کم کر کے..... اُسی' تُسی شروع کر دے..... اور یاد رکھنا.....! پنجابی لوگ پیٹ کو ٹنڈھ کہتے ہیں جب کہ غیر پنجابی اس کو ڈِڈھ کے تلفظ سے خارج کرتے ہیں..... تمہارے یا آپ کے لئے تہاڈا استعمال ہوتا ہے جب کہ غیر پنجابی تاڈا بول جاتے ہیں..... یوں سمجھ لے.....! معاملہ' دل اور دماغ کا ہے..... اردو' دماغ اور پنجابی دل کی زبان ہے..... دل کے معاملہ میں..... تھوڑا بہت ہیر پھیر تو ویسے بھی جائز ہے.....! تُو فکر نہ کر اگلے خط میں پنجابی کے بہت سے مشکل الفاظ اور اُن کا صحیح تلفظ لکھ کر میں تجھے بھیج دوں گا' اِس طرح تیرا وہ قرض کچھ کم ہو جائے گا جو تُو چار سال تک میری اردو ٹھیک کرنے پر لگا رہا تھا.....

اور ہاں.....! ہر اتوار کو ٹھرک پوری کرنے کے لئے سورج کُنڈ جاتا ہوں اور شمشان گھاٹ کی سامنے والی سیڑھی پر بیٹھ کر پانی کا نظارہ کر کے لوٹ آتا ہوں' تیرے بغیر پانی میں چھال مارنے کو دل نہیں کرتا..... مَن میں عجب طرح کا ہول آتا ہے..... پچھلے اتوار ایک اور گڑبڑ ہو گئی..... میں شمشان گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا من ہی من میں تجھے یاد کر رہا تھا اور سیڑھیوں پر پڑی کنکریوں سے کھیل رہا تھا' جب پانی میں ایک کنکری پھینک کر میں نے اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی..... تو جانتا ہے کیا ہوا..... بجائے میرے' پانی پر تیری شکل نمودار ہو گئی..... میں نے جتنی بار بھی پانی میں کنکری پھینک کر اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی اُتنی ہی بار میرے بجائے تیری شکل نمودار ہوتی رہی..... سورج کُنڈ سے واپسی پر چنڈی کے مندر اور بالے میاں کے مزار پر بھی باقاعدگی سے جاتا ہوں مگر مزار کے اندر جانے کی ہمت نہیں پڑتی..... کیا پتہ کوئی مسلمان مجھے پہچان کر ہنگامہ کھڑا کر دے کہ ہندوؤں کا لڑکا مسلمانوں کے مزار پر کیا لینے آیا ہے' اور ہاں یار.....! میں جب بھی چنڈی کے مندر میں جاتا ہوں' پھول اور پرساد کے بیچ پڑے سکّے میرا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں مگر اُنھیں چُرانے کی ہمت نہیں ہوتی..... جب بھی ہاتھ بڑھاتا ہوں ایک انجانا سا خوف' من کو ہولا دیتا ہے..... ویسے یار ایک بات ہے جس طرح سیاست کے گورکھ دھندے ہماری سمجھ میں نہیں آتے اِسی طرح مُلّا اور پنڈت کے دعوؤں میں بھی بڑا جھول دکھائی دیتا

ہے.....دیکھ نا.....! مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ بالے میاں نے چنڈی کو زیر کر لیا تھا جب کہ ہندو بالے میاں کی ہار کا ڈھونڈرا پیٹتے ہیں..... مگر.....دونوں طرف کے سادہ دل بندے اپنی اپنی بات پر مدّت سے ڈٹے ہوئے ہیں.....نہ چنڈی کے مندر کی رونق کم ہوئی اور نہ بالے میاں کے مزار پر رش کم ہوا اور ہاں یار.....! میں تو یہ سوچ کر ہول رہا ہوں کہ تیرے بغیر نوچندی کے میلے میں ہلّے گلّے کا مزہ کیسے آئے گا.....؟ یاد ہے پچھلی مرتبہ ہم لوگوں نے اصغر علی کو ایک چالیس پینتالیس سالہ عورت کے پیچھے یہ کہہ کر لگا دیا تھا کہ یہ تجھے غور سے دیکھ رہی ہے..... کافی دیر تک اصغر علی اُس عورت کے آگے پیچھے گھومتا رہا.....بریلی کے سُرمہ والے مرزا جی کی دکان پر اُس عورت سے نہ رہا گیا.....! نقاب پلٹ کر بولی.....!

''کیوں بیٹا..... کیا بات ہے تجھے کوئی کام ہے مجھ سے.....؟''

اصغر علی ہونّق بن کر کہہ بیٹھا!

''جی.....! سُرمہ لینا ہے مجھے.....!''

''سُرمہ لینا ہے تو اِدھر آؤ برخوردار.....!''

مرزا جی نے کتنی بدمعاشی سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے نہ صرف اصغر علی کو قریب بُلایا بلکہ آنکھیں دیکھنے کے بہانے اُس کے چکنے گالوں پر بھی خوب ہاتھ پھیرے.....اللہ توبہ اصغر علی نے کتنی غلیظ گالیاں بکی تھیں ہم سب کو اور ہمیشہ کے لئے دوستی توڑنے کا اعلان بھی کر دیا تھا اور جب دوسرے دن ہم سب اُسے منانے گئے تو وہ فوراً مان گیا.....اور اُس دن میلے میں دو بوڑھی عورتوں کے درمیان گاڑھے میک اپ میں چٹک مٹک کرتی ایک لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے ہم اُس کے گھر تک پہنچے تو وہ اصغر علی کے محلے کی دھوبن نکلی جس پر اصغر علی نے ہمارا خوب مذاق اُڑایا اور پچھلے دن کا اپنا قرضہ برابر کیا۔

یار شریفے.....! تیرے جانے کے بعد سے رادھا کی چاٹ کھانے کو دل ہوا' نہ شنکر کا پان اور نہ بشیر بھٹیارے کے پائے کھانے کی ہمت ہوئی اور ہاں احمد سلام' اصغر علی' دلشاد عالم' وجے کمار' عابد حبیب' افضال احمد' نعیم الرحمٰن اور سلیم الدین کے علاوہ ماسٹر اشفاق حُسین تجھے بہت یاد کرتے ہیں.....اگلے خط میں تُو ان سب کے نام دعا سلام ضرور لکھنا' میں تیرا خط لے جا کر انہیں دکھاؤں گا تو وہ سب بہت خوش ہوں گے.....اس بار' میں زبانی ہی یہ کام کر دوں گا' اور ہاں.....! ایک کام تیرے ذمے لگا رہا ہوں چٹیاں ہٹیاں محلے میں پیپل والی مسجد کے امام صاحب مولوی حبیب اللہ کی خدمت میں میرا اور میرے گھر والوں کا سلام پہنچانا اور کہنا کہ میں گُفتاں کی نماز کے بعد دم کرانے تو نہیں آ سکتا مگر اُن کی دعاؤں کی ہمیں اب بھی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی وہاں رہتے ہوئے ہوتی تھی اور سُن ورزش کا شوق پورا کرنا ہو تو کمپنی باغ کے اکھاڑے میں ضرور جائیں.....وہاں میراں بخش پہلوان ہوں گے.....مجھے وہ نہیں پہچانتے' میرے پِتا جی کا نام لے کر اُن کی خدمت میں پِتا جی کا سلام ضرور پہنچانا..... اور یار شریفے.....! ملک منظور سائیکل والے سے بھی ملاقات کر لے تو تیری بڑی مہربانی ہے..... گوالمنڈی میں کمہار روڈ کے نکڑ پر دکان ہے.....اوّل تو ملک منظور نے' میرے ذمے واجب' پیسے معاف کر دیئے ہوں گے ..... نہیں تو میرا یہ قرض بھی تُو نے چکانا ہے.....!

یار شریفے.....! اتنا لمبا خط لکھنے کے بعد بھی' سر پر باتوں کی پوٹلی کا وزن جُوں کا تُوں برقرار ہے.....اس وزن کو خوشی خوشی میں اُس وقت تک اٹھائے پھروں گا جب تک تجھے دوسرا' تیسرا' نہ جانے کتنے خط لکھتا رہوں گا.....تُو نے اپنے والد صاحب اور ہمشیرہ کی بابت توجہ دلا کر' مجھے شرمندہ کر دیا ہے..... آئندہ کبھی اس قسم کی بات نہ لکھنا.....وہ صرف تیرے نہیں میرے بھی پِتا ہیں اور تیری بہن میری دیدی سمان ہیں مجھ سے جو بھی بَن پڑا میں کرتا رہوں گا.....

تیرا اپنا بنواری لال

☆

ارے بیٹا.....! آپ میں ہمت ہے نہ مجھ میں تاب.....! گنتی اور حساب میرا ویسے بھی کمزور ہے.....وزن میں پوچھو تو بے حساب..... گنتی میں پوچھو تو لاتعداد..... آخری خط اُس کا دستی آیا تھا.....پاکستان سے آنے والے ایک صاحب لائے تھے.....اُن دنوں آپ کے دادا جی بہت بیمار تھے.....شریر کے روگ اور وطن سے دوری کے علاوہ شریفے کے خط میں اپنے آبائی مکان کی ٹوٹ پھوٹ اور خستہ حالی کی خبر سنتے ہی اُن پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے.....

''پُتر وے.....! اپنے دوست شریفے کو لکھ.....ہتھ بندھ کے اُس سے بنتی کر کہ وہ میرے جسم پر لگے زخموں کا کچھ علاج کرے.....!

''اُسے لکھنے کی کیا لوڑ ہے پِتا جی.....! میں ہوں نا آپ کی سیوا کے لئے..... آپ حکم کریں.....!''

''نہیں.....پُتر ..... نہیں! میرے زخموں کا علاج تیرے بس میں نہیں' پتہ ہے.....! تیرے دادا جی نے کتنے کشٹ جھیل کر اور کتنے سُفنے سجا کر بنایا تھا وہ گھر..... اُسے گرنا نہیں چاہیے پُتر ..... اُس کے گرنے سے' ہمارے ارمان' ہمارے سُفنے سڑھ کے سوا ہو جائیں گے..... تُو نہیں دیکھ سکتا..... کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا..... میں اپنے جسم پر اُتنے ہی پھٹ محسوس کر رہا ہوں جتنے میرے گھر کی دیواروں پر پڑے ہوں گے.....بتّے اوئے.....! وہ ہمارا گھر ہی نہیں' ماتا کا پوتر استھان بھی ہے.....میں تیری دادی کو' پرلوک میں جا کر کیا منہ دکھاؤں گا.....وہ مجھ سے پوچھے گی کہ میں نے ماتا کے پوتر استھان کی رکھشا کے لئے اپنا دھرم نبھایا کہ نہیں تو میں کیا جواب دوں گا.....؟''

میرے خط کے جواب میں شریفے نے پاکستان' راولپنڈی سے آنے والے حکیم مرزا فیروز الدین کے ہاتھ' پتا جی کی صحت یابی کی دعائیں اور نیک تمناؤں کے علاوہ مولوی حبیب اللہ کے تحریر کردہ تعویذ پڑھا ہوا پانی اور سرکار بری امام کے تبرّک کے علاوہ بادام روغن و منقّا کی سوغات بھی بھیجی تھی اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی تھی کہ اُس نے ہمارے راولپنڈی' مدن پورہ والے گھر کے

مکینوں کو پتا جی پر گزرنے والی بپتا سنائی تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور دلّی کے کرول باغ میں اپنا سجا سجایا گھر چھوڑنے کی داستان ہچکیوں میں بیان کرنے لگے..... کس طرح پنڈت اوماشنکر کے ایثار اور قربانی کے باعث وہ اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے تھے..... انہوں نے جلد ہی کلیم کی منظوری کی نوید سناتے ہوئے ہمارے مکان کو اپنے نام الاٹ کرانے اور اُس کی مرمّت ورنگ وروغن کا پکّا وعدہ کیا تھا اور پتا جی کے نام تحریر کردہ رقعے میں اُنہیں راولپنڈی آکر اپنے مکان میں قیام کی دعوت بھی دی گئی تھی.....!

☆

''آپ نے اُن کے والد کے لئے اتنا کچھ کیا..... انہوں نے آپ کے ابّو کے لئے بھی کچھ کیا کہ نہیں.....؟''

''ہائے ہائے بیٹا.....! کیا سوال کر ڈالا..... میرے جگر کے ٹکڑوں.....! اُس نے تو اتنا کچھ کیا کہ میں ساری عمر بھی اُس کی غلامی کروں تو اُس کا قرض نہیں چُکا سکتا.....

اُنہیں دنوں آپا کی ممانی بانو پاکستان آئیں تو آپا نے گھنٹوں اُن سے اپنے شہر محلّہ اور عزیزوں کی بابت دریافت کیا۔ ابّا اور نجمہ کے ذکر پر آپا کی ممانی جذباتی ہو کر بولیں.....!

''بھئی کیا نام ہے.....؟ وہ تمہارے لڑکے کا ہندو دوست ہے نا.....! بڑا خیال رکھتا ہے تمہارے شوہر اور بیٹی کا..... ہولی دیوالی کے علاوہ عید بقر عید پر باقاعدگی سے لین دین کرتا ہے اور ہر دکھ سکھ میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے..... ایک مرتبہ تو وہ اُن کی خاطر پڑوسیوں سے لڑ کر تھانے بھی جا پہنچا تھا.....!''

''آپ لوگ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے تو خط وکتابت کیوں بند ہو گئی.....؟''

''آہ.....ہا..... پہل میری طرف سے ہوئی تھی.....! مرزا فیروزالدین کے ہاتھ بھیجے گئے جواب میں اپنی سرکاری نوکری کی اطلاع کے ساتھ میں نے اُسے آئندہ بذریعہ ڈاک خط نہ لکھنے کی معذرت کی تھی کیونکہ سرکاری ملازمت کے دوران پاکستان سے خط وکتابت میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتی تھی.....!''

☆

''اُس خط کے جواب میں آپ نے کیا کیا.....؟''

''کرنا کیا تھا.....! اُس کے خط سے میرے دل کا بوجھ کسی قدر کم ہو گیا تھا..... سی۔ایس۔ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے لئے ضروری تھا کہ میں خود کو سچّا پاکستانی ثابت کروں لہٰذا میں پہلے ہی وہ تمام خط نذر آتش کر چکا تھا جو اِس عرصے میں بنواری لال نے لکھے تھے..... کئی بار آئے گئے لوگوں کے ہمراہ بنواری لال نے سوغات کے طور پر نوچندی کے اچار اور پانی کے بڑے پان کی ڈھولی اور بالے میاں کے مزار کی شیرنی ارسال کی......... جواب میں میں بھی کابل کا گرما ہینگ منقّا اور بادام روغن وغیرہ کے تحفے ارسال کرتا رہا..... آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی کمزور ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا.....!''

☆

''پاپا.....! آپ ہر روز سادہ ناشتہ کرتے ہیں پھر بھی ہر روز یہ ضرور پوچھتے ہیں..... بھئی ناشتے میں کیا بنا ہے.....؟''

''ایک آدمی نماز پڑھتا تھا نہ روزے رکھتا تھا..... نذر نیاز شوق سے کھاتے ہوئے کوئی شخص اُسے ٹوکتا تو وہ کہتا.....!''

''کیا چاہتے ہو تم.....؟ نذر نیاز بھی نہ کھاؤں..... بالکل کافر ہو جاؤں.....!'' سوال کرنے والے کا منہ منطقی جواب سے بند کرتے ہوئے وہ شخص اپنے کام میں اور تیزی سے مصروف ہو جاتا..... مجھے پتا ہے ڈاکٹروں نے میری مُشکیں کسی ہوئی ہیں..... دو سلائس براؤن بریڈ آدھا گلاس موسمی یا سنگترے کا جوس اور ایک کپ شوگر کے بغیر کافی میرا روز کا ناشتہ ہے مگر بیٹا.....! انڈوں کا آملیٹ چیز بٹر آملیٹ دودھ وغیرہ کے ذکر سے ذہنی لُطف میرا مطلب ہے مزہ تو لیا جا سکتا ہے.....!''

''آل رائٹ ..... آل رائٹ..... آپ جو کہہ رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے..... اب اپنا اخبار لے کر آجایئے اور چٹ پٹی خبروں کے ساتھ سمپل بریک فاسٹ کر لیجئے.....!''

''ہاں بھئی.....! ویسٹ میں اخبار انفارمیشن کے لئے چھپتے ہیں اور تھرڈ ورلڈ میں انٹرٹینمنٹ کے لئے..... چلو دیکھتے ہیں آج کیا خبریں ہیں.....اوہ نو..... انسانیت کے دشمنوں کچھ تو خدا کا خوف کرو.....!''

''واٹ ہیپن پپا.....؟''

''بھارت کے پرتھوی میزائل کے جواب میں پاکستان نے غوری میزائل تیار کر لیا.....!''

''اِٹس ویری بیڈ.....!''

''بہار کے چیف منسٹر لالو پرشاد یادیو نے ڈس کوالیفکیشن کے بعد اپنی انگوٹھا چھاپ پتنی رابڑی دیوی کو چیف منسٹر نومی نیٹ کر دیا.....!''

''انٹرسٹنگ.....!''

''امیتابھ بچن نے ڈھائی کروڑ میں فلم سائن کر کے ریکارڈ قائم کر دیا.....!''

''ویری فنی..... آئی لائک بگ بی.....!''

''ہیں.....! یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں..... نو..... نیور..... یہ کس طرح ہو گیا؟..... شیکھر کو بلاؤ..... جلدی سے شیکھر کو بلاؤ.....!''

''پپا.....! آر یو او کے.....؟''

''نہیں..... بہت گڑ بڑ ہو گئی ہے..... مجھے فوراً میرٹھ پہنچنا ہے..... آج کل اتنا ٹریفک ہے کہ دہلی سے میرٹھ پہنچنے میں دو گھنٹے لگ جاتے ہیں..... ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے..... کوئیک..... میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں.....!''

☆

باقی صفحہ ۷۲ پر ملاحظہ کیجیے

''چشمِ حیرت''

سید سعید نقوی

(نیویارک)

کبھی بجھے تو یہ پوچھوں چراغِ الفت سے
ہے رعبِ حسن سے لرزاں یا اپنی فطرت سے

جمع کرتا رہا اندیشہ ہائے دور دراز
امیدِ وصل مجھے دیکھتی تھی حسرت سے

میرے گمان نے دیکھا یقیں کا ساحل تو
سفر سے چور قدم اٹھ رہے تھے عجلت سے

یہ لا مکان بھلا کس کے در پہ رکتا ہے
زمیں یہ دیکھنے نکلی ہے چشمِ حیرت سے

زمیں کو چھوڑ کے افلاک سے جو مانگتے ہیں
زمین گود میں لیتی ہے ان کو رغبت سے

سعید لیتی ہے فطرت یہ مال کا صدقہ
جہاں جہاں بھی محبت ملی ہے نفرت سے

○

مشتاق اعظمی

(اسنسول، بھارت)

مرے نالۂ شبانہ میں بھی کیوں اثر نہیں ہے
مجھے کچھ پتہ نہیں ہے، مجھے کچھ خبر نہیں ہے

کبھی مجھ پہ تھا تلطف، کبھی مجھ پہ تھی عنایت
مرے حال پر مگر اب تری وہ نظر نہیں ہے

جسے دیکھئے بنا ہے وہی رہنمائے منزل
کسے راہ بر میں سمجھوں، کوئی معتبر نہیں ہے

ہوا لالہ زار گلشن تو بہار خوش قدم سے
مری داستان لیکن ابھی رنگ پر نہیں ہے

نہ جو راہ پر خطر ہو، نہ ہو، دھوپ کی ہی شدت
مری چشم کم نظر میں، وہ سفر، سفر نہیں ہے

نہ ہو پیار کی ہی خوشبو، نہ خلوص کی ہو بارش
اسے میرا گھر نہ سمجھو، وہ تو میرا گھر نہیں ہے

سوئے منزل تمنّا، لو وہ اعظمی چلے ہیں
کوئی ہم قدم نہیں ہے، کوئی ہم سفر نہیں ہے

○

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن چوہان

(میرپور خاص)

دل کے بازار میں اب دوست اُتر جانا ہے
چٹکی خوشبو کے لیے اور کدھر جانا ہے

پھول اور خار کے رشتے میں جدائی کیسی
ساتھ جینا انہیں ساتھ ہی مر جانا ہے

منتظر ہے کوئی اب تک اُسی ویرانے میں
بات کو سمجھ ذرا، مجھ کو بھی گھر جانا ہے

تیری اُلفت سے لبالب ہے جو پیمانۂ دل
ساغرِ زیست بھی ایک روز تو بھر جانا ہے

لاکھ مضبوط سہی دل کی یہ سرکش کشتی،
اس کو طوفان کی موجوں میں بکھر جانا ہے

زندگی ہے اگر اوروں کی امانت تو حبیب
پھول بننا ہے، مہکنا ہے، بکھر جانا ہے

○

پروفیسرز ہیر کنجاہی (راولپنڈی)

یہ میری آرزو ہے　　بڑی ہے خوب رو ہے
کہو کچھ تُم مِرے یار　　تمہاری جُستجو ہے
تمہاری ہی نہیں یہ　　مری بھی تو نمو ہے
خُدا دیکھے کبھی تو　　مِری یہ آرزو ہے
کئی چمکتے ستارے　　مدینہ سُرخ رو ہے
چلیں ہم بھی مدینے　　اِسی میں آبرو ہے
کماؤ کچھ زہیؔر اَب　　یہ گھر میں آرزو ہے

○

نوید سروش (میرپورخاص)

سرِ بزم جو کیا تھا وہی عہد تو لکھا تھا　　مجھے کیا خبر کہ اُس نے جو سُنا غلط سنا تھا
درِ زیست پر جو میں نے ترا نام لکھ دیا تھا　　مرے دل میں دیپ بن کر وہی عمر بھر جلا تھا
وہ سنہرے دن ہمارے، تمہیں سارے یاد ہوں گے　　مجھے تم بھی چاہتی تھیں، تمہیں میں بھی چاہتا تھا
جو کھدائی کر کے دیکھی کبھی شہرِ آرزو کی　　مرے نام کا بھی کتبہ اُسی شہر میں ملا تھا
میں یہ سُن کر شادماں تھا کہ وہ آ رہا ہے ملنے　　تھی غزل مرے لبوں پر اُسے یاد کر رہا تھا
وہ میرے لیے نہیں اب، کسی اور کے لیے ہے　　جو دریچۂ محبت مرے واسطے کھُلا تھا
جو بچھڑ گیا تھا، اُس سے میں سروشؔ کیسے ملتا　　مگر حوصلہ مرا بھی بڑے ہی کمال کا تھا

○

منظور ثاقب (فیصل آباد)

یہ فسانہ ترا شہکار بھی ہو سکتا ہے　　اس میں لیکن مرا کردار بھی ہو سکتا ہے
پیٹ خالی ہو تو پھر اونچی اڑانوں والا　　ایک دانے پہ گرفتار بھی ہو سکتا ہے
نفع و نقصان کی میزان سجی ہو جس جا　　پیار کے نام پہ بیوپار بھی ہو سکتا ہے
ہر مخالف کو میں کس طرح سے دشمن کہہ دوں　　دشمنی میں مرا معیار بھی ہو سکتا ہے
طرزِ انکار بدل سکتا ہے اس کے معنی　　حرفِ انکار میں اقرار بھی ہو سکتا ہے
خود فروشی جسے لائی سرِ بازارِ وفا　　طالبِ حسنِ خریدار بھی ہو سکتا ہے
تیرے اعدا میں جو شامل رہا کل تک ثاقبؔ　　آخری وقت طرفدار بھی ہو سکتا ہے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

ہے بدستِ قرآں، رَحل تو ہو　　بندگی کا مِری بدل تو ہو
کب تلک سوئے آسماں دیکھوں　　میری مشکل کا کوئی حل تو ہو
کون آبِ زیست کو مانگے　　تیری رحمت کا مولا جل تو ہو
کس قدر بے نیاز، بے پرواہ　　میری خاطر مگر یہ پَل تو ہو
رہ کے کُٹیا میں سوچتے جانا　　آرزوؤں کا ہی محل تو ہو
خود سے کیا قصۂ سحر چھیڑیں　　شبِ تاریک کی پہل تو ہو
کہنے کی بات کہہ نہیں پائے　　کہنے کا موقعہ و محل تو ہو!

○

سلیم انصاری

(جبل پور، بھارت)

ہے اگر مجھ میں رائیگاں مٹّی　　تو مجھے کردے بے نشاں مٹّی
خاک سے خاک تک سفر میرا　　اور کیا میری داستاں مٹّی
جھیلنا ہے عذابِ در بہ دری　　ہے ابھی مجھ سے بدگماں مٹّی
اور کب تک شکستِ لفظ وخیال　　اور کب تک مرا زیاں مٹّی
کاش لوٹ آئے پھر مسافرِ دل　　منتظر ہے سرائے جاں مٹّی
اک ترے لمس کی کرامت سے　　ہو گئی مجھ میں ضو فشاں مٹّی

○

رفیق احمد

(جامشورو)

دن سے لگتا نہ مجھے رات سے ڈر لگتا ہے　　مجھ کو اپنے ہی خیالات سے ڈر لگتا ہے
جن کی دہلیز ہو اونچی مری پیشانی سے　　صاحبو! ایسے مکانات سے ڈر لگتا ہے
دل میں کچھ، اور رہے اور زباں پر کچھ اور　　ایسے لوگوں کی ملاقات سے ڈر لگتا ہے
دوستوں اور عزیزوں سے کرے دور مجھے　　دوستو! ایسی ہر اک بات سے ڈر لگتا ہے
جن سے کھل جائے معما مرے دل کا یک سر　　ایسے معصوم سوالات سے ڈر لگتا ہے
ایک ہی بار اگر، ہوتا مجھے مرنا یاں　　پھر نہ کہتا مجھے حالات سے ڈر لگاتا ہے
خوف گرچہ کہ مرے دل میں نہیں ہے پہ رفیقؔ　　عقل کے بعض اشارات سے ڈر لگتا ہے

○

نورزمان ناوک (تلہ گنگ)

یہ جو اک شے ہے اعتدال میاں
اب تو ملتی ہے خال خال میاں

کس غضب کی تھکن نے ڈالی تھی
ہر پڑاؤ پہ اک دھمال میاں

ہجر کی راگنی فسوں گر ہے
کیوں سنو نغمۂ وصال میاں

یہ غرورِ حسب نسب کا جنوں
کب بنا ہے کسی کی ڈھال میاں

حسنِ تاریخ مت کہو خود کو
ہم تو ہیں وقت کا اگال میاں

کل پذیرائی کی سیاست میں
ہم بھی تھے صاحبِ کمال میاں

مسلکِ عجز سے معطّر ہے
میرے اخلاص کا جمال میاں

دردٹھہری یہ کس نے چھیڑی ہے
رنگِ گل بھی ہے پُرملال میاں

کب نہاں ہے مری بصیرت سے
ذہنِ ناوک میں ہے جو چال میں

○

پروفیسر انتظار باقی کی ردیف سے متاثر ہو کر

قمرالدین خورشید
(اسلام آباد)

زمیں و آسماں کے درمیاں ہے
خلاء کہنے کو یوں تو بیکراں ہے

گلابی، سُرخ، پیلے اور اُودے
کِھلے پھولوں کا شاخوں پر سماں ہے

اِسے مٹّی کا ایک پُتلا نہ سمجھو
یہ انساں اپنے اندر اک جہاں ہے!

جو جادو چشمِ جاناں میں بسا ہے
وہ جادو چشمِ آہو میں کہاں ہے

وہ جھانجھ پہن کر اُس میں جو اُتری
تو جھرنا اب اُسی لے میں رواں ہے

ہوئی بارش ، دھلی ساری فضا ہے
ہُوا کچھ اور نیلا آسماں ہے

کہاں پھولوں میں خوشبو اُس کے جیسی
جو خوشبو زلفِ جاناں میں نہاں ہے

○

جہانگیر اشرف
(برمنگھم)

جگنو کو مُٹھی میں بند کرتا ہے
اندھیروں کا سوداگر روشنی سے ڈرتا ہے

جھوٹ کو سچ کا لبادہ پہنا کر
غلافِ حروفِ مقدس میں رکھتا ہے

ماضی کے مزاروں کا مجاور ہے
شوقِ کجکلاہی میں جیتا ہے مرتا ہے

ہوا چلی ہے، خوشبو تو پھیلے گی
خوشبو کا جھونکا کب کسی سے رُکتا ہے

سچ تو تمثیلِ خورشید ہے جہانگیر
کہاں خوش نوا لفظوں سے چُھپتا ہے

○

غلام شبیر اسدؔ
(جھنگ)

خود اپنے آپ سے ٹوٹا ہوا ہوں — مدارِ ذات سے باہر گرا ہوں
ابھی پہلا قدم اٹھّا کہاں تھا — کہ رستوں کی نظر میں آ گیا ہوں
نظر ایسے کریدے جا رہی ہے — کہ جیسے میں کسی کا آسرا ہوں
بھلے روٹھی ہوئی ہے نیند مجھ سے — میں اپنی اصل میں اک خواب سا ہوں
چراغوں کی لَوؤں سے منحرف ہیں — میں پروانوں کو اکثر دیکھتا ہوں
تری ناراضیاں صاحب! بجا ہیں — میں اپنے آپ سے کافی خفا ہوں
اسدؔ کب تھی ضرورت زندگی کی — کسی کردار میں الجھا ہوا ہوں

○

مظہر بخاری
(میاں چنوں)

کہیں رکنا، کہیں چلنا پڑا ہے — سفر کیسا ہمیں یہ آ پڑا ہے
مسافر کیطرح تنہا کھڑا ہوں — ادھر دریا اُدھر صحرا پڑا ہے
فراتِ دہر خود میں موجزن ہے — کنارے پر کوئی پیاسا پڑا ہے
ہمارے خال وخد ہم سے نہیں ہیں — کہیں آنکھیں، کہیں چہرہ پڑا ہے
جہاں پر سایہ بھی اپنا نہیں ہے — ہمیں اس شہر میں رہنا پڑا ہے
چلے جاتا ہوں منزل کی طلب میں — ابھی کچھ عمر کا رستہ پڑا ہے
وہ ہجرت کر چکا ہے دل سے مظہرؔ — مگر اُس شخص کا کتبہ پڑا ہے

○

احمد حجازی
(لیاقت پور)

کبھی اُسکے شہر کی گلیوں میں گھوما کرتے تھے — ہم تو ٹُوٹے نصیبوں کو جوڑا کرتے تھے
اندھیر صدیوں سے چھایا ہے ان مکانوں پر — مکین جن کے کبھی دِل جلایا کرتے تھے
اُسکے دیوانوں پہ اب شجر بھی سایہ نہ کریں — جن پہ صحرا میں بادل بھی سایا کرتے تھے
اُجڑ گیا وہ چمن اس بہار میں کیونکر — غنچے جسکے خزاں میں بھی مہکا کرتے تھے
کرتے دیکھا انہیں آج میں نے رستے میں — جن سے ہم چلنے کے آداب سیکھا کرتے تھے
وہ جب سے بچھڑا ہے دھوپ نے جلا ڈالا — کبھی اُسکی زلف کی چھاؤں میں سویا کرتے تھے
مدت ہوئی ویرانی ہے احمدؔ وہاں — جن رستوں پر وہ چل کے آیا کرتے تھے

○

گم شدہ شناخت

زیرِطبع ناول کا ایک باب

انل ٹھکرؔ (بھارت)

بہت دنوں کے بعد نور کے لبوں پر سبک مسکراہٹ کی آمدورفت ایسے جاری تھی جیسے افق پر رُک رُک کر ہلکے ہلکے بجلی چمک رہی ہو۔ آج اسے تنخواہ ملنے والی تھی۔ اس نے منصوبہ بنالیا تھا کہ یہ رقم ہاتھ لگتے ہی وہ بی خالہ کو لے کر مولوی صاحب سے ملنے جیل جائے گی۔

ربیع الآخر کا مہینہ ختم ہوتے ہی گیارھویں کی دعوتوں کے برتن مانجھنے کی آمدنی رک گئی۔ مہینہ بھر میں جو تھوڑی بہت آمدنی ہوئی تھی اس کا بیش تر حصہ مولوی صاحب سے ملاقات کرنے پر صرف ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں میں وہی فاقہ کشی کے بادل منڈلانے لگے تو بی خالہ نے اسے حاجی عبدالغنی ملاّ کی رہائش گاہ پر گھر کے کام کاج پر لگا دیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے اپنی محنت سے حاجی صاحب کی اہلیہ کا دل جیت لیا۔ صبح سے شام تک وہ اپنے کام میں مصروف رہتی۔ دوپہر کا کھانا اسے وہیں سے مل جاتا۔ بچا کُچا رات کے لیے وہ اپنے ساتھ لے آتی۔ بچی بچائی ہی سہی اچھی غذا سے اس کی صحت بھی بہتر ہونے لگی۔ زرد چہرے پر سرخی طلوع ہونے لگی۔ بدن میں پہلا سا کس کساؤ پیدا ہونے لگا۔ کام پر آتے جاتے گلی کوچے میں من چلوں کی نظریں اس کی اوڑھنی میں ہچکولے لیتے اس کے سینے پر جھنجھنانے لگیں۔ ان سب سے بے نیاز وہ صبح سویرے اپنے کام پر پہنچ جاتی اور شام ڈھلے گھر لوٹ آتی۔ عموماً اسے گھر میں چولہا جلانے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ تنخواہ کی پوری رقم اس کی بچت ہوتی۔ وہ اپنی اس بچت کو مولوی صاحب سے چند لمحوں کی ہی سہی ملاقات پر صرف کرنا چاہتی تھی۔

دن تو اس کا حاجی صاحب کے گھر کے کام کاج میں گذر جاتا مگر شام ہوتے ہی حاجی صاحب کے گھر کی دہلیز سے قدم باہر رکھتے ہی لاشعوری طور پر اس کے پاؤں بی خالہ کے گھر کی جانب مڑ جاتے۔ وہاں وہ بی خالہ کے پاس بیٹھ کر گپ شپ کرتی۔ اس کے کام میں ہاتھ بٹاتی مگر یہ صحبت کتنی دیر کی؟ اندھیرا اُترتے ہی اسے مجبوراً وہاں سے اٹھنا پڑتا۔ کسی مفلس کے قدموں کی طرح اس کے پاؤں اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگتے۔ کوچہ میں داخل ہوتے ہی گھر کا قفل بند دروازہ شیطان کے مانند اسے نگلنے کے لیے منتظر رہتا۔ وہ کپکپی محسوس کرتی۔ تھراتے ہاتھوں سے قفل کھولتی اور سناٹے میں اپنے وجود کو اُتار دیتی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مانو اس کی دنیا بدل جاتی۔ بھائیں بھائیں کرتی سیاہ ویرانے کی تنہائی، سوچوں کی گرداب، وہ کبھی گرداب کی سطح پر ہوتی تو کبھی گرداب کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطے لگاتی۔ کبھی اس کا سانس گھٹنے لگتا۔ کبھی اس کا جی چیخ مارنے کو کرتا۔ وہ آج تک سمجھ نہیں پائی کہ مولوی صاحب نے ایسا کیا گناہ کیا ہے جو انہیں جیل ملی اور اس کے حصے میں کربلائیت آئی ہے!! پہلے کبھی کبھی راتوں میں اسے اپنے بیٹے کی کلکاریاں مارنے کی آوازیں سنائی پڑتیں۔ آج کل بار بار بیٹے کے رونے کا بھرم ہوتا ہے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھتی۔ لمحہ بھر میں حقیقت سے دوچار ہوتی تو نڈھال ہو کر اشک بار فرش پر ڈھیر ہو جاتی۔

آج اسے بیٹے کی کلکاری سنائی دی نہ رونے کی آواز۔ وہ اندھیرے میں لیٹے لیٹے چھت کو تکتے ہوئے مولوی صاحب کے لیے سوچ رہی تھی۔ ان کے لیے کونسا پکوان بنانا ہے؟ پکوانوں کے لیے کونسی اشیاء بازار سے لانی ہیں؟ میٹھا کیا بناؤں؟ یہ سب سوچتے سوچتے اسے کب ڈھلتی رات نیند لگ گئی اس کا اسے علم ہی نہیں ہوا۔ نیند لگی تو خوابوں کا قافلہ شروع ہو گیا۔ خواب میں پکوان کے لیے اشیاء لانے کی گڑبڑی، چولھے سے اٹھتے دھوئیں کو پھونک کر چنگاری پیدا کرنے کی عجلت۔ ملاقات کے لیے دھوئے ہوئے شلوار قمیص سکھانے کی پریشانی۔ اس طرح وہ خوابوں کے قافلہ میں ایسے بھٹکتی رہی کہ صبح اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ پچھواڑے میں دھوپ اُتر آئی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کام پر جانے کو دیر ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ، منہ دھویا۔ بالوں کو ہلکی کنگی دی اور گھر کو قفل لگا کر حاجی صاحب کے گھر کے لیے نکل پڑی۔

نور حاجی صاحب کی رہائش پر پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حاجی صاحب اور ان کی بیگم کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی بیگم نے کہا:

اللہ کا شکر ہے تم آ گئیں۔ ہمیں میری بہن کے گھر جانا ہے۔

بیگم نور کو باورچی خانہ میں لے آئیں۔ کام کے لیے ہدایتیں دی اور بولیں:

آج میری بہن کی بیٹی کا رشتہ پکا ہونے جا رہا ہے۔ لڑکے والے آئیں گے۔ لین دین کی بات ہونی ہے۔ اس لیے حاجی صاحب کو خاص طور پر بلایا ہے۔ کھانا ہمارا وہیں ہوگا۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد ہم لوٹیں گے۔

چھوٹے صاحب کے لیے کیا پکاؤں؟ نور نے سوال کیا۔

افضل کالج گیا ہے۔ اب وہ شام کو ہی لوٹے گا۔۔۔۔ ایسا کرو اس کے لوٹنے پر کچھ ناشتہ بنا دینا۔ اپنے لیے پکا کر کھا لینا۔

بیگم کی ہدایتیں ختم ہوتی نہ دیکھ کر حاجی صاحب نے دیر ہونے کی بات یاد دلائی۔ بیگم نے اپنی بات ختم کی اور باہر آئیں اور کہا۔

چلیے چلیے دیر ہو رہی ہے۔

بیگم کا انداز گفتگو دیکھ کر حاجی صاحب زیرِلب مسکرائے اور بیگم کے ساتھ ہو لیے۔

دھوپ سر پر چڑھتے چڑھتے حکم سنگھ کے دس لاکھ روپے ٹھرّے کے

نشے کی طرح شہر کی سڑکوں پر اپنا اثر ڈھانے لگے۔ اچانک کی نعرے بازی اور پتھراؤ سے بازار میں ہڑ دنگ مچ گیا۔ دکانوں کے شٹر بلا توقف پھٹا پھٹ گرنے لگے۔ پتھراؤ سے افراتفری شروع ہوگئی۔ جان بچانے کون کس سمت بھاگ رہا ہے اس کا کسی کو ہوش وشعور نہ رہا۔ پولیس خبردار ہواس سے قبل جنگل کی آگ کی طرح دنگے شہر بھر میں پھیل گئے۔ سرکاری عمارتوں، دفتروں اور گاڑیوں کے ساتھ عوامی ملکیت اور گاڑیاں بھی سوکھے کے ساتھ گیلے کی طرح جلنے لگیں۔ دکانوں کے قفل توڑ کر دکانیں لوٹی جانے لگیں۔ اس غارت گردی کو روکنے پولیس ڈنڈے اور بندوقیں لے کر میدان میں اتری۔ یہ دیکھ کر دنگائیوں نے وارداتوں میں تیزی لا دی۔ پولیس کے صبر کا بندٹوٹا تو انہوں نے ڈنڈے برسائے۔ کام نہیں بنا تو گولیاں داغیں۔ لاشیں گرنے لگیں۔ دنگائی گلی، کوچوں میں تتر بتر ہوکر وار کرنے لگے۔

شہر کے حلات دیکھتے ہوئے تعلیمی اداروں نے چھٹی کا اعلان کر دیا۔ چھٹی کا اعلان ہوتے ہی حاجی صاحب کا بیٹا افضل موٹر بائیک پر گھر کی جانب نکل پڑا۔

پولیس نے شہر کے چند علاقوں میں کرفیو لگا دیا۔ ٹی وی چینلوں میں گھوڑوں کی دوڑ کی مانند خبروں کے لیے مقابلہ شروع ہوگیا۔ ان کے نمائندے کندھے پر کیمرا لیے بھٹکنے لگے۔

دم زدن میں رامانند سوامی عوامی ہیرو بن گئے۔

کالج سے چھٹتے ہی افضل احتیاط سے موٹر بائیک پر گھر پہنچا۔ کوچہ سنسان تھا۔ مکانوں کے در و دریچے بند مگر اندر دُبکے بیٹھے مکینوں کی دھڑکنیں اس سناٹے میں جیسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ گھر کے سامنے ایک کتا پیٹ میں منہ ڈالے سو رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا، جانی پہچانی بو اور صورت دیکھ کر وہ اطمینان سے اونگھنے لگا۔ افضل نے کھٹکے دار قفل (Night Latch) کو کھولا۔ اس قفل کو دو کنجیاں تھیں۔ ایک حاجی صاحب کے پاس رہتی، دوسری افضل کے پاس۔ جب بھی باہر سے آتے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہ گھنٹی بجانے کی۔

گھر کا دروازہ کھول کر افضل اندر آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے بڑھا۔ چند قدم پر ہی یک بیک ٹھٹھک گیا۔ اس کے پاؤں نے مانو زمین پکڑ لی۔ آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول گئیں۔ وہ سمجھ نہیں پایا یہ خواب ہے یا حقیقت!! اس نے اپنے روبرو جنسِ مخالف کا برہنہ جسم دیکھا۔ گرم پانی میں نہائے بدن سے ہلکی ہلکی بھاپ اُٹھ رہی تھی جس کی بھینی خوشبو ماحول میں تحلیل تھی۔ اس کے گیلے بدن پر جگہ جگہ پانی کے قطرے موتیوں کے مانند چمک رہے تھے۔ وہ پہچان گیا وہ نور تھی۔ غسل خانہ کے باہر پاؤں پونچھنے کے پائے انداز (Doormat) پر جُھک کر کھڑی وہ گیلے بالوں کو نچوڑ رہی تھی۔ عورت کے اس روپ کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے حرارت محسوس کی۔ جو چشمِ زدن میں اس کے مسامات میں رچ گئی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ جھکی ہوئی نور نے بالوں کو اچھالتے ہوئے بدن سیدھا کیا۔ پانی کی پھوار افضل کے چہرے پر نم کر گئی۔ اس کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اچانک نور کی نظر افضل پر پڑی۔ شرم وہیبت سے لرزتے ہوئے اس نے پیٹھ پھیری اور غسل خانہ میں جانے لگی۔ افضل نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں دبوچ لیا۔ غیر مرد کے لمس سے نور پر غش طاری ہوگیا۔ نور کے گرتے جسم کو اٹھا کر وہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ بے ہوش نور کو بستر پر لٹایا۔ تو اس کی نظریں نور کے بدن پر رینگنے لگیں۔ تبھی انسانی وسوسہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان فوراً اس کے وجود میں داخل ہوگیا۔

حاجی عبدالغنی ملاّ اپنی بیگم کے ہمراہ اپنے ہم زلف کے گھر خیر و عافیت سے پہنچ تو گئے مگر شہر کی فضا کچھ ایسی کشیدہ ہوگئی کہ ان کا صحیح سلامت واپس گھر لوٹنا مشکل ہوگیا۔ جس مقصد سے وہ یہاں آئے تھے وہ بھی پورا نہیں ہوا۔ ہڑ بونگ کی وجہ سے لڑکے والے رشتہ پکّا کرنے کے لیے وہاں پہنچ ہی نہیں سکے۔ حاجی صاحب کی بیگم کو اپنے بیٹے اور گھر کی فکر لاحق ہوگئی۔ افضل کس حال میں ہوگا؟ گھر پہنچا کے نہیں؟ گھر میں نور اکیلی ہے۔ ڈر کے مارے اس کا کیا حاصل ہوگا؟ گھر کی فکر بڑھ گئی تو انہوں نے گھر فون لگایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ انہوں نے سوچا فساد کی خبر سن کر نور اپنے گھر چلی گئی ہوگی۔ پھر خیال آیا، افضل ابھی تک گھر نہیں آیا؟ کہاں گیا ہوگا؟ انہوں نے حاجی صاحب کو گھر چلنے کے لیے کوئی انتظام کرنے کو کہا۔ بیگم کے بار بار کے اصرار سے حاجی صاحب بھی فکر مند ہوگئے۔ انہوں نے اپنے رسوخ سے گھر پہنچنے کا انتظام کرلیا۔

پولیس کی مدد سے حاجی صاحب اور ان کی بیگم اپنے گھر پہنچے۔ قفل کھولا۔ بیگم بیٹے کو آواز دیتے ہوئے آگے بڑھیں۔ جواب نہیں ملا تو نور کے نام کی صدا دیتے ہوئے دیوان خانہ میں آئیں تو قدموں کے ساتھ جیسے ان کی دھڑکنیں بھی رک گئیں۔ ان کے منہ سے حاجی صاحب کا نام پکار بن کر گونج اٹھا۔ حاجی صاحب گھبرا کر اندر داخل ہوئے۔ وہ بھی دنگ رہ گئے۔ بیگم منہ میں دوپٹا لئے چیخ کو روکے ہوئے تھیں۔ دونوں نے ایک ساتھ چھت کے پنکھ سے لٹک رہی نور کی لاش کو دیکھا۔ اس کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ ایک لحظ دونوں کے ذہن میں کئی سوال اٹھ کھڑے ہوئے۔

حاجی صاحب نے ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے پڑوسی کو آواز دی۔ پڑوسی کو اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ اس کی بیوی کے ساتھ اپنی بیگم کو ان کے وہاں بھیج دیا۔ دو چار پڑوسی جمع ہوگئے۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ پولیس آئی واقعہ سنا۔ یہ بھی معلوم کیا کہ مرنے والی کا شوہر دہشت گردی کے الزام میں جیل میں ہے۔ پولیس نے دیکھا گھر کی ہر چیز محفوظ ہے۔ کچھ بھی چوری نہیں ہوا۔ نہ مرنے والی کے جسم پر بظاہر کوئی زخم یا گھاؤ کے نشان ہیں۔ پولیس نے خودکشی کا کیس داخل کر کے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا۔ انسپکٹر جانے کو تھا تبھی اتفاقاً دروازہ پر کھٹاک کی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ افضل اپنے پاس کی کنجی سے

دروازہ کھول کر اندر آیا۔ پولیس کو دیکھ کر وہ پس وپیش میں پڑ گیا۔ اسے دیکھتے ہی انسپکٹر نے حاجی صاحب نے پوچھا۔

یہ کون ہے؟

میرا بیٹا افضل۔

کیا کرتا ہے؟

کالج میں پڑھتا ہے

انسپکٹر نے افضل کو غور سے دیکھا، کہا۔

اسکول، کالج تو صبح ہی سے بند کر دیئے گئے تھے۔ تم اتنی دیر کہاں تھے؟

اب تک افضل سنبھل چکا تھا بولا:

فساد ہو رہے تھے اس لیے میں اپنے دوست کے کمرے پر رُک گیا تھا۔

شہر میں دنگے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں بھٹکا مت کرو۔ دھر لئے گئے تو باہر آنا مشکل ہوگا۔

انسپکٹر خبردار کر کے چلا گیا۔

حاجی صاحب نے پڑوس سے اپنی بیگم کو بلا لیا۔ بیگم گھر آ کر نور کے پاس صاف کام، اچھے طور طریقے اور شائستہ مزاجی کو یاد کر کے روتی رہیں۔ حاجی صاحب سمجھاتے رہے۔

افضل اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی امّی کو ایک نوکرانی کے لیے اس طرح ماتم کرتے دیکھ دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ امّی کا رونا بند ہوتا دیکھ کر وہ غصّے سے باہر آیا، بولا:

امّی، اب بس بھی کرو۔ جو حرام موت مری ہے، اس کے لیے قصیدہ کیوں پڑھ رہی ہو!! اس حرام زادی کو یہ غیر مذہبی کام کرنا ہی تھا تو اپنے گھر میں کرتی، یہاں کیوں کیا؟

حاجی صاحب پہلے ہی بہت فکر مند تھے۔ بیٹے کے اس برتاؤ سے اور پریشان ہو گئے۔ انہوں نے بیٹے کو اس کے کمرے میں بھیج دیا، بیگم کو اپنی خواب گاہ میں لے گئے۔

دوسرے روز انسپکٹر آیا تو اس کا رویّہ بدلا بدلا سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شک پنپ رہا تھا۔ حاجی صاحب نے اس سے بیٹھنے کی گزارش کی وہ نہیں بیٹھا۔ اطراف نظریں گھماتے ہوئے ٹہلتا رہا۔ اچانک اس نے حاجی صاحب سے سوال کیا۔

وہ کوئی خط۔۔۔ چٹھی تو نہیں چھوڑ گئی؟

جی نہیں، ہم نے کہیں کچھ نہیں دیکھا۔

چہل قدمی روک کر وہ صوفے پر بیٹھا۔ حاجی صاحب اس کے روبرو بیٹھے۔ انسپکٹر نے کہا۔

حاجی صاحب، لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے۔

حاجی صاحب نے اشتیاقاً جسم کو آگے جھکایا۔ انسپکٹر نے ان کے چہرے پر نظریں جما کر سلسلہ کلام جاری رکھا۔

موت سے پہلے کسی نے اس کا زِنا کیا ہے۔۔۔ Rape ہوا ہے اس کا۔

حاجی صاحب سرتاپا لرز گئے۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

اللہ۔۔۔

کچھ لمحات بعد وہ بولے۔

یہ کیسے ممکن ہے صاحب؟! گھر میں کوئی نہیں تھا، سوائے اس کے!!

کوئی آیا تو ہے۔۔۔ انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔

ممکن ہے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہو اور اندر گھس گیا ہو۔ حاجی صاحب نے اپنی بات رکھتے ہوئے کہا۔

نہیں۔ ایسا ہوتا تو اس کے جسم پر زور زبردستی کے نشان ہوتے۔ راضی خوشی کا معاملہ ہوتا تو خودکشی کیوں کرتی؟

اندر سے دروازہ نہیں کھولا تو باہر سے بغیر چابی کے کوئی اندر کیسے آ سکتا ہے؟

دفعتاً انسپکٹر کو یاد آیا۔ کل حاجی صاحب کا بیٹا دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کے قریب گیا۔ دروازہ کے لیچ (Latch) کو دیکھا۔ حاجی صاحب سے سوال کیا۔

اس لیچ کی کتنی چابیاں ہیں؟

دو ہیں جناب۔ ایک میرے پاس ہے، دوسری میرے بیٹے کے پاس۔

انسپکٹر کو گتھی سلجھتی نظر آئی۔ اس نے پوچھا۔

آپ کا بیٹا کہاں ہے؟

اندر اپنے کمرے میں ہے۔

بلائیں اسے۔

افضل اپنے کمرے سے باہر آیا۔ انسپکٹر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کے عکس ابھرے اس کے چہرے کے تاثر کو نظر انداز کرتے ہوئے انسپکٹر نے پوچھا۔

اس دروازے کی چابی تمہارے پاس ہے؟

جی ہاں۔

کہاں ہے؟

افضل نے جیب سے چابی نکال کر دی۔ انسپکٹر نے چابی لے کر حاجی صاحب سے کہا۔

جناب، میں آپ کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔

کہاں؟

تھانے۔

کیوں جناب؟ حاجی صاحب نے پوچھا۔
تفتیش کے لیے۔
افضل نے آزردہ نظروں سے اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ حاجی صاحب کچھ کہیں اس سے قبل انسپکٹر نے افضل کی بازو تھامی اور جاتے ہوئے بولا۔
آپ فکر نہ کریں، تھوڑی دیر میں اسے میں واپس بھیج دوں گا۔
تھانے جاتے ہوئے انسپکٹر نے افضل سے اس کے دوست کا پتہ پوچھ کر ڈرائیور کو جیپ اُس طرف موڑنے کے لیے کہا۔ افضل کو ڈرائیور کے حوالے کر کے وہ اس کے دوست کے کمرے کو گیا۔ افضل پریشان تھا مگر اسے تسلی ہوئی کہ انسپکٹر جلدی لوٹ آیا۔
تھانے پہنچ کر افضل کو اپنے روبرو کرسی پر بٹھا کر کہا۔
دیکھ، میں جو کچھ بھی پوچھوں اس کا سچ سچ جواب دینا۔ سچ بولے گا تو تُو ہماری سختی سے تو بچ جائے گا، اپنے باپ کو بھی رسوائی اور ذلت سے بچالے گا۔
انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، اس پر خوف طاری ہو گیا۔ تبھی سوال اس کے کانوں پر ٹکرایا۔
تو کل کالج سے نکل کر اپنے دوست کے کمرے پر کتنے بجے گیا تھا؟
کالج چھٹتے ہی میں وہاں چلا گیا۔
میں نے پوچھا کتنے بجے تو وہاں پہنچا؟۔۔۔انسپکٹر نے سختی سے پوچھا۔
یہی کوئی دس ساڑے دس کے قریب۔
جھوٹ بولتا ہے؟
نہیں جناب، میں سچ کہہ۔۔۔
افضل کی بات مکمل ہونے سے پہلے سٹاک سے تھپڑ اس کے کان پر پڑا جو اس کے کانوں میں جھن جھناہٹ پیدا کر گیا۔
سچ بتا؟ انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے چہرے تک جھک کر سوال کیا۔
میں سچ۔۔۔سچ۔۔۔
پھر جھوٹ؟
انسپکٹر نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے گردن پکڑ کر اسے گرسی سے اوپر اٹھا کر بولا۔
سچ بتا ورنہ اُلٹا لٹکا کر گانڈ پر اتنے ڈنڈے ماروں گا کہ ٹٹی خشک ہو جائے گی۔
افضل گھگیانے لگا۔
بتاتا ہوں۔۔۔بتاتا ہوں جناب۔
بول۔۔۔؟ تیرا دوست کہتا ہے تو اُس کے پاس ایک بجے گیا۔ دس بجے سے ایک بجے تک تو کہاں تھا؟
افضل نے ہاتھ جوڑ کر جی، جی کہتے ہوئے اپنی بدفعلی کی پوری روداد کہہ سنائی۔ قصہ سن کر انسپکٹر کا ذہن مانو کمپیوٹر بن گیا۔ اس نے منصوبہ تیار کر لیا۔ افضل کو سلاخوں والی کوٹھری میں بند کر کے ڈرائیور کو حاجی صاحب کو لانے کے لیے روانہ کیا۔
انسپکٹر افضل کو لے جا کر کافی وقت گذر چکا تھا۔ حاجی صاحب تذبذب میں مبتلا ہو رہے تھے۔ وہ طے نہیں کر پا رہے تھے، وہ کیا کریں۔ کسی رسوخ والے کو فون کر کے افضل کو چھڑوانے کا انتظام کریں یا کچھ دیر اور انتظار کریں۔ ان کی اس پریشانی میں بیگم کا رونا دھونا اور اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے دل کو کسی طرح تسلی دیتے تھے مگر بیوی کو کیسے سمجھائیں!! تبھی دروازہ پر گھنٹی بجی۔ حاجی صاحب نے دروازہ کھولا۔ سامنے انسپکٹر کا ڈرائیور انہیں لے جانے کے لیے کھڑا تھا۔ اس نے حاجی صاحب کو تھانے چلنے کے لیے کہا۔ حاجی صاحب کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ کئی خیال ذہن میں آنے جانے لگے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی، انہوں نے رسیور اٹھایا۔
ہیلو؟
میں انسپکٹر بول رہا ہوں۔ میں نے جیپ بھیجی ہے، آپ پانچ منٹ کے لیے تھانے آجایئے۔
کیوں جناب، کیا بات ہے؟ حاجی صاحب نے سوال کیا۔
آپ کی نوکرانی کے ساتھ زِنا کرنے والے کا پتہ چل گیا ہے۔ آپ اسے ذرا دیکھ لیں۔
افضل کہاں ہے، جناب؟
وہ میرے پاس ہی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ فوراً آجایئے۔
حاجی صاحب نے ٹوپی پہنی اور جیپ پر سوار ہو گئے۔
تھانے پہنچتے ہی حاجی صاحب کی نظریں افضل کی تلاش میں تھیں۔ جب انہوں نے سلاخوں کے پیچھے شرمسار بیٹے کو کھڑا دیکھا تو ان کا دم رک سا گیا۔ انہوں نے حیرت سے انسپکٹر کی جانب دیکھا۔ انسپکٹر نے بڑے اطمینان سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔
آپ تشریف رکھیے۔
بیٹا سلاخوں کے پیچھے کیوں ہے یہ جاننے کے لیے انہیں اس صبر آزما فعل سے گذرنا پڑا۔ وہ بیٹھے انسپکٹر گویا ہوا۔
آپ کی نوکرانی کا زِنا آپ کے بیٹے نے کیا ہے۔
یہ کیسے ممکن ہے؟ جناب وہ گھر پر تھا ہی نہیں۔
انسپکٹر نے میز کی دراز سے چابی نکال کر سامنے رکھی اور کہا۔
یہ چابی۔ دروازے کی ایک چابی اس کے پاس بھی تھی۔
آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟
اس چابی سے دروازہ کھول کر یہ اندر آیا ہے۔ نوکرانی کو اکیلا دیکھ کر اس نے اس بدفعل کو انجام دیا ہے اور پھر ڈر کر اپنے دوست کے کمرے پر جا کر بیٹھا ہے۔
یہ آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟
یہ میں نہیں کہہ رہا۔ آپ کے بیٹے نے اقبالِ جرم کیا ہے۔

حاجی صاحب نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ حاجی صاحب کے چہرے پر فکر دیکھ کر انسپکٹر نے پانسا پھینکا۔

میرا خیال ہے، کم از کم دس سال تو یقیناً سلاخوں کے پیچھے رہنا ہوگا۔

گھر کی چابی تو کوئی ثبوت نہیں ہوا۔۔۔ حاجی صاحب نے کہا۔

صحیح فرمایا آپ نے۔ صرف چابی سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا یہ قصور وار ہے۔ مگر میرے پاس ایک ٹھوس ثبوت اور ہے۔۔۔ آپ کی نوکرانی کے کپڑوں پر لگے داغ۔ وہ کپڑے لیب میں بھیجنے سے پتا چل جائے گا کہ وہ داغ آپ کے بیٹے کے نطفے کے ہیں یا نہیں۔

یہ سن کر حاجی صاحب کو نرم پڑتے دیکھا تو انسپکٹر نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔

حاجی صاحب، کہتے ہیں نا! بند مٹھی لاکھ کی کھل گئی تو خاک کی۔ خوامخواہ کورٹ کچہری، وکیل سکیل کے لفڑوں میں پڑنے کی مت سوچئے گا۔ معاشرے میں ایک بار بات پھیل گئی تو۔۔۔ لڑکا جوان ہے۔ اس کا مستقبل۔۔۔ سوچ لیجیے۔ میں نے ابھی وہ کپڑے لیب کو نہیں بھیجے ہیں۔

آپ کیا چاہتے ہیں؟ حاجی صاحب نے مایوس ہوکر پوچھا۔

آپ میری مٹھی کا خیال رکھیں، میں آپ کی مٹھی کھلنے نہیں دوں گا۔

حاجی صاحب نے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ افسوردی میں بھی انہیں ننگا نظر آیا۔ مگر کیا کرتے آبرو، عظمت، رتبہ سب کو خطرے میں دیکھ کر وہ لاچار و بے بس ہوگئے۔ بیٹے کے مستقبل کے خیال نے انہیں کمزور کر دیا۔ تصور میں آرہے بیگم کے سوگوار چہرے نے ان کی کمر توڑ دی۔

انسپکٹر نے حاجی صاحب کے ایمان کو ڈھیر کرنے کے لیے آخری وار کرتے ہوئے کہا۔

مرنے والی کا شوہر جیل میں ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ غریبی سے تنگ آکر اس نے خودکشی کر لی ہے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے آپ کو۔ آپ حاجی ہیں، آپ کی بات کوئی رد نہیں کرے گا۔ رہی بات پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تو میں دیکھ لوں گا۔ اپنی بند مٹھی کی خاطر حاجی صاحب نے انسپکٹر کی مٹھی کو گرم کرنا قبول کر لیا۔

حاجی صاحب اپنا بیٹا تو لے آئے مگر اپنا ایمان چھوڑ آئے۔

بقیہ: شجرِ ممنوعہ کی تلاش میں

پاداش میں انھیں خلد سے نکال دیا گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن عورت ہی عورت کے زوال کا سبب بنی ہوئی ہے۔

اس واقعہ کو سننے کے بعد مجھے لگا۔ میں بھی کسی سازش کا شکار ہوئی ہوں۔

میرے شوہر اور وہ سیاہ فام چڑیل ایک دوسرے کو شاید، پہلے سے ہی جانتے تھے۔

وقت گزرتا رہا اور زندگی کسی ناگن کی طرح رات کی تنہائی میں ڈستی رہی مجھے برسوں۔ حتیٰ کہ رات کی تنہائی کے تصور سے ہی میری ہڈیوں میں کوئی سرد سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ، میری حالت غیر ہونے لگی۔ مجھے اپنے شوہر کی ایسی ذلیل حرکتوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کوسوں دور محسوس ہونے لگا تھا۔ میں اپنی نظروں کے سامنے اسے اپنے سے دور ہوتا دیکھتی رہی۔

میری اس لامتناہی اداسی اور گہری خاموشی کو دیکھتے ہوئے۔ میرے شوہر کے بڑے بھائی نے بڑی پدرانہ شفقت سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو بیٹا!

محبت آزاد پرندہ ہے۔ اسے کھلی فضا میں چھوڑ دو۔ اگر لوٹ آئے تو تمھارا ورنہ وہ تمھارا کبھی تھا ہی نہیں۔''

یہ ایسی حقیقت تھی کہ جس کے تلخ گھونٹ مجھے تنہا پینے پڑے۔

میرا پرندہ کسی اور ہی مٹی کا بنا تھا۔ اسے نہیں لوٹنا تھا، وہ نہیں لوٹا ------- میں یہ سب کس سے شیئر کرتی؟

میری متی ماری گئی تھی۔ کلب کی رنگین پر چھائیاں اس کے خر جسم کو شراب و شباب سے خوب شرابور کرتی رہیں اور میری آنکھیں دھوکا کھاتی رہیں، میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ اس سیاہ سمندر میں غوطے کھاتا رہا ہے، متواتر ڈوبتا رہا، متواتر ابھرتا رہا اور اس کے قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھیں۔

آج، میں خود کو اکیلے پن کے ایسے گہرے کنویں میں گری ہوئی محسوس کر رہی ہوں، جہاں سے میری آواز باہر کی دُنیا تک پہنچ نہیں سکتی ہے۔ میں اندر ہی اندر چیخ رہی ہوں لیکن میرے آس پاس مجھے کوئی سننے والا نہیں ہے۔

افسوس!

صد افسوس! میں نے یہ کیا کیا۔

شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں!

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم (کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط.....۲۲

فائنل امتحان کا نتیجہ

جیسا میں نے لکھا ہے میں ان دنوں ذولفقار بھائی جان کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور بہت اچھا وقت گذار رہا تھا۔ میں اس کنبے کے ساتھ کبھی فلمیں دیکھنے جاتا تو کبھی ساحل سمندر پر تفریح کرنے۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ گھر خاندان میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا اس لئے یہاں رشتہ داروں کا بھی ہجوم لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر اتوار کے دن تو ایک چھوٹی موٹی تقریب کا سماں ہوتا تھا تاش کی بازی جمتی تھی جسمیں مرد حضرات کے ساتھ انکی بیگمات بھی حصہ لیتی تھیں۔ کہیں کچھ لوگ ریڈیو گرام پر اپنی پسند کے ریکارڈ لگا کر گانے سن رہے ہوتے تھے تو کسی کمرے میں اردو کے تازہ ترین ناول پر تبصرے ہوتے تھے کسی کمرے میں صرف باتوں کی محفل جمی ہوتی تھی۔ تاشوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی بالکہ میں اپنی اماّں کے زیر اثر انکے خلاف تھا اماّں کا کہنا تھا کہ تاش منحوس ہوتے ہیں اور اس کی لت سے بچنا چاہئے۔ بعد میں میں نے اپنی زندگی میں حقیقتاً یہ دیکھا کہ ہمارے میڈیکل کالج میں جو لڑکے تاش کھیلنے کی عادت میں مبتلا ہو گئے ہاسٹل میں ان کے کمروں میں رات رات بھر تاش چلتے تھے اور وہ دوسرے دن کلاسیں چھوڑ کر دن بھر سویا کرتے تھے ان میں سے کئی وقت مقررہ پر امتحان پاس نہ کرنے کی وجہ سے میڈیکل کالج سے نکال دئے گئے اور اگر وہ کالج میں رہے بھی تو انہوں نے ایم بی بی ایس پانچ سالوں کے بجائے سات یا آٹھ سالوں میں کیا۔ خیر یہ تو ایک جملہء معترضہ تھا۔ کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ ان کے یہاں ایک میلہ سا لگا ہوتا تھا خوب رونق ہوتی تھی اور بہت اچھا وقت گزر رہا تھا۔ مجھے یہ تو لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں خاص طور پر اُن محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا جہاں ادب کے سلسلے میں کوئی دلچسپ مباحثہ ہو رہا ہوتا تھا یا جہاں صرف دلچسپ باتوں کی نشست جمی ہوتی تھی۔ اس تمام عالم مسّرت میں بھی کبھی کبھی ذہن میں سخت فکر کے ساتھ یہ خیال آتا تھا کہ ابھی تک فائنل امتحان کا نتیجہ نہیں آیا ہے اس لئے مجھ پر کچھ دیر کے لئے ایک غیر یقینی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بڑا تکلیف دہ لمحہ ہوتا تھا کیوں کہ مجھے زندگی میں ہر چیز کی جلدی تھی اور میں جلد سے جلد اپنی اگلی منزل کی جانب گامزن ہونا چاہتا تھا۔

یہ ۱۹۶۸ کا زمانہ تھا۔ کراچی ایک صاف ستھرا کشادہ اور پر امن شہر تھا۔ ناظم آباد شرفا، خاص طور سے ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے شرفا کا محلّہ تھا ڈیفنس سوسائٹی کا وجود نہیں تھا ہاں پی ای سی ایچ ایس اور کارساز روڈ متمول لوگوں کے علاقے سمجھے جاتے تھے مگر ناظم آباد کا ماحول اتنا اچھا تھا کہ اردو بولنے والے اگر اُن علاقوں میں گھر خریدنے کے متحمل بھی ہو سکتے تھے تو بھی اِن کی ترجیح ناظم آباد میں ہی گھر بنانا ہوتی تھی۔ ناظم آباد میں یوں تو پانچ بلاک تھے مگر چار نمبر رئیسوں کا علاقہ سمجھا جاتا تھا ایک زمانے میں یہاں کئی فلم اسٹار رہتے تھے اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ کراچی کا واحد مگر بڑا ہی کامیاب فلم اسٹوڈیو ایسٹرن اسٹوڈیو یہاں سے بہت قریب تھا۔ فضلی برادران کا مشہور فلمی ادارہ دبستان لمیٹڈ بھی یہیں تھا اور ڈائیرکٹر ہمایوں مرزا ،جنہوں نے فلم راز بنا کر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے تھے بھی یہیں رہتے تھے۔ ناظم آباد کلب بھی اسی چار نمبر میں تھا جہاں انگلینڈ جانے سے پہلے میرے کزن وجاہت نے بیڈمنٹن میں کئی انعامات جیتے تھے۔ ہمارے رشتہ داروں میں صفات ماموں اور اظہر بھائی جان کی شاندار کوٹھیاں بھی یہیں تھیں۔ ذوالفقار بھائی جان کا بھی خوبصورت بنگلہ یہیں تھا جسے انہوں نے نیو ہیون (NEW HAVEN) یعنی ''نئی پناہ گاہ'' کا نام دیا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دور پر حسن پھوپی کا گھر تھا جو کرائے کے ایک بہت خوبصورت مکان میں رہتی تھیں انہوں نے بھی اسکو اپنے ذوق کے مطابق بڑی نفاست سے سجایا تھا اسی اثناء میں سندھ یونیورسٹی نے اعلان کر دیا کہ ہمارے نتائج کا اعلان ستمبر کی سترہ تاریخ کو شام پانچ بجے کر دیا جائیگا اور دوسرے دن صبح کے اخباروں میں ہمارا نتیجہ شائع ہوگا۔ نتیجے کی چھپی ہوئی آفیشیل کاپی سندھ یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں بلیٹن بورڈ پر شام پانچ بجے لگنی تھی اور وہاں رہنے والے لڑکے اپنے نتیجے کو اسی وقت دیکھ سکتے تھے انہیں میری طرح دوسرے دن تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی جب وہ نتیجہ کراچی کے اخباروں میں دیکھتے۔ صرف نتیجہ دیکھنے کے لئے میرا حیدرآباد جانا تو ممکن نہیں تھا مگر میں نے سوچا تھا کہ میں حیدرآباد میں اپنے کسی ہم جماعت کو فون کر کے نتیجہ معلوم کرلونگا۔ پاس ہونے کی امید تو یقیناً تھی مگر زیادہ بیقراری اس بات کی تھی کہ اوّل پوزیشن اور گولڈ میڈل حاصل کرنے میں کامیاب ہونگا یا نہیں۔ میں لکھ ہی چکا ہوں کہ اس سلسلے میں میرا مقابلہ خیرپور سندھ کے ایک لڑکے منیر عباسی سے تھا۔ ہمارے پروفیسروں خاص طور پر صالح میمن صاحب، علی محمد انصاری صاحب، میڈم رضیہ لطیف اور عالمانی صاحب جو میڈیسن میں صالح صاحب کے نائب تھے، کو یقین تھا کہ میں اس مقابلے میں منیر پر سبقت لے جاؤنگا۔ ظاہر ہے منیر بھی بیحد ذہین، پڑھنے میں بہت محنت کرنے والا اور ایک نہایت اعلی درجہ کا طالب علم تھا۔ ہم دونوں میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ منیر صرف پڑھنے میں اپنی تمام تر توانائی مرکوز کر کے صرف ایک ہی میدان کا شہسوار تھا اور میں نصاب کے علاوہ غیر نصابی میدان میں بھی بہت فعال تھا اس لئے سماجی طور پر میں کالج میں زیادہ مشہور و مقبول تھا۔

نتیجہ کا دن

سترہ ستمبر کا بیچینی سے انتظار تھا معلوم ہوا کہ اسی دن اجلال بھائی جان

انگلینڈ میں تقریباً پانچ سال گذار کر، علم نفسیات میں اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے بذریعہ زمینی راستے کراچی پہنچ رہے ہیں اور انکا خیر مقدم کرنے ان کے کنبے کے کچھ لوگ پہلے ہی کوئٹہ جا چکے ہیں انکے گھر میں انکے اعزاز میں ایک چھوٹی سی تقریب ہے اجلال بھائی جان میری والدہ کی فرسٹ کزن یعنی ماموں زاد بہن سعیدہ خالہ کے صاحب زادے تھے انکا گھرانہ بیحد پڑھا لکھا تھا۔ انکے والد صاحب نے شاید ۱۹۲۱ میں ایم اے کیا تھا۔ وہ کسی زمانے میں میرٹھ کے کالج میں پرنسپل تھے اجلال بھائی جان نے ڈاؤ میڈیکل کالج سے ۱۹۶۲ میں ایم بی بی ایس کیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے اس قدر سینئر تھے کہ جب میں میڈیکل کالج میں داخل بھی نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ڈاکٹر بن چکے تھے اس حوالے سے تمام عمر میں نے انکا بیحد احترام اور ادب کیا۔ سنا ہے اجلال بھائی جان نے بھی ڈاکٹری کا زمانہء طالب علمی کافی دشواریوں سے گذارا تھا اور اپنے راستے میں حائل رکاوٹوں کو بڑی ہمت اور جواں مردی سے عبور کیا تھا۔ اس لئے بھی وہ میرے لئے قابل احترام اور قابل تقلید تھے۔ اجلال بھائی جان کی چھوٹی بہن سلیمہ آپا یوں تو اس زمانے میں برقعہ پہنتی تھیں مگر اس کے باوجود وہ کراچی یونیورسٹی کے بالکل ہی اولیں دور کی مائیکرو بایولوجی کی ایم ایس سی تھیں میں ان سے بھی بہت متاثر تھا ذوالفقار بھائی جان کا تمام کنبہ اس سلسلے میں انکے یہاں جا رہا تھا میں بڑے تذبذب میں مبتلا تھا کہ کیا کروں۔ اجلال بھائی جان کی فیملی اس زمانے میں ڈرگ روڈ کینٹ کے علاقے میں رہتی تھی۔ یہ علاقہ بہت دور تھا اور کوئی قابل اعتماد پبلک ٹرانسپورٹ وہاں نہیں جاتی تھی۔ ذوالفقار بھائی جان کے یہاں تو ایک بہت اچھی کار تھی جس میں سات آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے مگر اس وقت انکے اپنے گھر میں آٹھ افراد اور ایک بچہ تھا۔ یہ لوگ تو کسی نہ کسی طرح ٹھس کر بیٹھ جاتے تھے مگر میں اپنے آپ سے بے انتہا شرمندہ ہوتا تھا کہ میرے لئے اس میں جگہ نکالنا مشکل ہو جاتا تھا میں اجلال بھائی جان کے کنبے سے بہت زیادہ گھلا ملا بھی نہیں تھا میں قطعی طور پر وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ لوگ بضد تھے کہ میں ساتھ چلوں۔ میرے خیال سے گھر والوں کو اس بات کی مروت تھی کہ میں ان کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں تو یہ مجھے کیسے چھوڑ کر جائیں مگر حقیقتاً یہ محبت اور خلوص تھا کیونکہ جب میں نے اپنے تئیں اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ میں بغیر کسی کو بتائے گھر سے ایسے ہی باہر نکل گیا تا کہ میں روانگی کے وقت موجود ہی نہ ہوں تو بیچارے انصار بھائی جان اپنی کار میں مجھے تلاش کرنے نکلے اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ کسی نہ کسی طرح بٹھا کر ڈرگ روڈ لے کر گئے۔ میں اس قسم کے خلوص اور محبت کے مظاہروں کو زندگی میں کیسے فراموش کر سکتا ہوں مجھے اس کا اب تک احساس ہے کہ میری وجہ سے سب بڑی تکلیف میں کار میں ٹھنسے بیٹھے رہے اور سب کے کپڑوں کی استری خراب ہو گئی۔ بہر حال سب لوگ ڈرگ روڈ پہنچے اسوقت تک اجلال بھائی جان پہنچے نہیں تھے اندر غل غپاڑہ تھا مگر میں اپنی جھجک کی وجہ سے باہر کمپاؤنڈ میں ہی رہا اور بہت بور ہوا اس کے ساتھ لمحہ لمحہ اس بات کا خیال تھا کہ اس وقت تو نتیجے کی فہرست لگ گئی ہو گی۔ بس میں دل ہی دل میں دعائیں پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں اجلال بھائی جان کی گرے رنگ کی فوکس ویگن کار احاطہ میں داخل ہوئی سب لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انکی ماں نے انہیں پورے پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ بہر حال اجلال بھائی جان کے گلے میں ہار پھول ڈالے گئے مٹھائیاں تقسیم کی گئیں مگر مجھے کچھ ہوش نہیں تھا اور میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا اور میں بیچینی سے واپس جانے کا انتظار کرتا رہا۔

خدا خدا کر کے یہ تقریب ختم ہوئی اور ہم لوگ پھر کار میں ٹھنس کر واپس ناظم آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں مجھ سے رشیدہ بھابی جان نے پوچھا تمہارا ابھی تو آج رزلٹ نکل رہا ہے میں نے کہا جی، مگر مجھے تو اپنا نتیجہ کل ہی اخبار میں دیکھنے کو ملے گا اگر کہیں فون ہوتا تو اپنے کسی دوست کو حیدر آباد فون کر کے نتیجہ معلوم کر لیتا۔ اس زمانے میں ذوالفقار بھائی جان کے یہاں بھی فون نہیں تھا۔ مگر صفات ماموں کے یہاں فون تھا جو بھابی جان کے بڑے بھائی تھے۔ بھابی جان نے کہا کہ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ابھی سیدھے چھوٹے بھائی جان کے یہاں چل کر فون کر لو۔ ہم گاڑی گھما کر فوراً صفات ماموں کے یہاں پہنچے۔ انکے نیم دائیرے کی شکل کے بیحد خوبصورت دالان میں جہاں بڑے بڑے گملوں میں پام کے پودے لگے تھے فون کا اونچا اسٹول رکھا تھا۔ باقی سب لوگ تو انکے سرسبز لان میں سنگ مرمر کے فوارے کے پاس بیٹھ کر خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ حیدر آباد اپنے دوست داؤد کو فون کی۔ اس لمحے میرے جو جذبات تھے انکو احاطہء تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ میں بہت جذباتی، بیحد حساس اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والا انسان ہوں۔ میری نظروں میں ایک طرف میرا ماضی تھا اور دوسری طرف ان دیکھا مستقبل۔۔ وہ راستہ تھا جس پر چل کر میں یہاں پہنچا تھا اور آنے والی وہ شاہراہ تھی جو مجھے کامیابی، مالی فارغ البالی اور سماجی مرتبے کی جانب لیجا سکتی تھی مگر جو فی الحال آنے والے کل کی دھند میں چھپی تھی۔ یہ ایک بیحد اہم موڑ تھا۔ زندگی کا شاید سب سے اہم موڑ۔

داؤد خود ہمارے کالج کے اول درجے کے طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ اسکی اناٹومی کے مضمون میں اول پوزیشن آئی تھی اور اس نے اس مضمون میں گولڈ میڈل جیتا تھا۔ مگر آئندہ سالوں میں وہ کوئی پوزیشن نہیں لے سکا تھا۔ اس لئے فائنل امتحان میں اسکی کسی پوزیشن کا امکان نہیں تھا۔ میں نے اس سے نتیجہ معلوم کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں پاس ہو گیا ہوں مگر پوزیشن منیر عباسی کی ہے اور اس طرح گولڈ میڈل کا حقدار وہی ہو گا۔ مجھے دکھ تو ہوا مگر پھر یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میڈیکل کالج کے پانچ سالوں میں بڑی کامیابیوں اور اعزازت سے نوازا ہے اور اب اسی لمحہ سے میں مکمل طور پر سند یافتہ ڈاکٹر قرار دے دیا گیا ہوں میں اللہ کا شکر بجالایا۔ پھر مجھے معلوم ہی تھا کہ میڈیسن کے اہم مضمون میں گاؤٹ (GOUT) پر ایک پورا سوال چھوڑ کر میں پوزیشن کا امیدوار نہیں ہو سکتا تھا میں نے موجودہ حیثیت کو قبول کر لیا۔

میں نے جیسے ہی فون رکھا ذوالفقار بھائی جان نے دور ہی سے باآواز بلند پوچھا کیا ہوا میرے جواب دینے پر تو وہ جیسے خوشی سے ناچنے لگے اٹھ

کر کھڑے ہوگئے اور اچھل اچھل کر اور چیخ چیخ کر صفات ماموں کو اور وہاں موجود تمام لوگوں کو بتانے لگے ارے بھئی فیروز ڈاکٹر ہوگئے۔اب تو انہیں ڈاکٹر فیروز کہو۔انہوں نے ایسے جوش اور اس قدر خوشی اور خلوص سے میری کامیابی کا جشن منایا کہ وہ لمحہ انکے حوالے سے آج بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے ان جیسے لوگوں کا جنہوں نے مشکل وقت میں میری ہمت افزئی کی اور میری خوشی اپنی خوشی سمجھ کر منائی میں ہمیشہ احسان مند رہونگا۔

اسی جوش کے عالم میں انہوں نے کہا اب اسی وقت حسن پھوپی کے یہاں چلو ان کو اسی وقت بتانا ہے کہ انکا بھتیجا ڈاکٹر ہوگیا ہے،''ابن عباس بھائی جان کا بیٹا ڈاکٹر ہوگیا ہے''۔ بھابی جان نے کہا بھی کہ اب رات کے نو بج چکے ہیں پھر ہماری پھوپی کے گھرانے کے رویہ سے، کہ وہ ہمیشہ درمیان میں تکلف کی ایک دیوار حائل رکھتی تھیں خاندان والے ذرا خائف تھے اور بے تکلفی سے بلا روک ٹوک ان کے یہاں نہیں جاتے تھے مگر ذوالفقار بھائی جان تو خوشی میں سر شار تھے انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور مجھے ساتھ لیکر ان کے یہاں چل پڑے چار و ناچار بھابی جان بھی ساتھ ہولیں۔اس تمام ڈرامے کے پس منظر میں جو قدیم خاندانی سیاست پوشیدہ تھی اس سے تو میں واقف ہی تھا کہ حسن پھوپی کے کنبے کا یہ رویہ تھا اور وہ باقی خاندان کو اس بات کا احساس دلاتی تھیں کہ کامیابی اور اعلی پیمانے کی تعلیم اور عہدے صرف انکے گھرانے ہی کا حصہ ہیں تو ذوالفقار بھائی جان ان کو یہ باور کروانا چاہتے تھے کہ مجھ ناچیز نے جو میر پور خاص میں پلا بڑھا ہوں آج پاکستان کی حد تک ایک اعلی ترین ڈگری حاصل کر لی ہے۔

حسن بھوپی کا بنگلہ

میری پھوپی کا طرز زندگی اور معیار مثالی طور پر متاثر کن اور بلند تھا۔ میر پور خاص میں بھی ان کا بنگلہ نہ صرف اپنی اندرونی آرائش اور خوبصورتی کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھا بلکہ جیسا انکا پائیں باغ خوبصورتی سے تراشا اور سنوارا گیا تھا اسکی مثال ریلوے کے کسی اور بنگلے میں نہیں تھی۔سرخ اینٹوں کی ایک روش جسکے دونوں طرف سبز باڑھ تھی انکے دروازے تک جاتی تھی۔گھر میں داخلے کے لئے تین چوڑی چوڑی سیڑھیاں تھیں جنکے دونوں جانب پھولوں کے گملے رکھے ہوتے تھے۔اب کراچی میں وہ ایک کرائے کے بنگلے میں تھیں یہاں وہ بات تو نہ تھی پھر بھی ان کی رہائش سے نفاست اور ریاست ٹپکتی تھی۔ناظم آباد میں حسن پھوپی کے بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا پائیں باغ تھا جہاں رات کی رانی مہک رہی تھی چند قدم آگے بڑھ کر چند سیڑھیاں تھیں اور پھر ایک چھوٹا سا پورٹیکو جہاں خوبصورت گملوں میں پھولوں کے دلفریب پودے لگے تھے۔ایک پتلی سی راہ دری میں گھس کر داہنی ہاتھ کو انکا ڈرائینگ روم تھا۔ذوالفقار بھائی جان اپنی شاہانہ چال چلتے،انتہائی خود اعتمادی سے انکے ڈرائینگ روم میں گھس گئے میں اور بھابی جان انکے پیچھے تھے۔وہاں سب لوگ بیٹھے ٹیلیوژن دیکھ رہے تھے۔چونک اٹھے ادھر ذوالفقار بھائی جان نے نعرہ مارا۔''ارے پھپّی!! مبارک ہو تمہارا بھتیجا ڈاکٹر بن گیا۔سنو! کیا مبارک موقعہ ہے ابن عباس بھائی جان کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا''۔حسن پھوپی اپنے اُس خاص انداز سے مسکرائیں جو خاندان میں بڑا مشہور تھا اور جسکا ذکر انکی غیر موجودگی میں خاندان میں ہمیشہ رہتا تھا۔ یہ مسکراہٹ بڑی پر اسرار تھی اور اسکے کئی مطالب اخذ کئے جاسکتے تھے۔کبھی کبھی یہ مسکراہٹ وہ رنگ اختیار کر لیتی تھی جس کے لئے فارسی کا لفظ''زہر خند'' استعمال ہوتا ہے۔بہر حال انہوں نے مجھے گلے لگایا اور ساتھ ہی پوچھا کیسے معلوم ہوا کیا کسی کا فون آیا ہے؟؟ انہیں تفصیل بتائی گئی۔مجھے دعائیں دینے لگیں اور میرے ابّا اور امّاں کے لئے بھی اچھی خواہشات کا اظہار کرنے لگیں انکے یہاں باقی لوگوں نے جن میں میری دوسری دو پھوپیاں اور میری کزنس نمی آپا اور نصرت آپا شامل تھیں مجھے دعائیں اور مبارکباد دی۔نمی آپا اور نصرت آپا تو ہمیشہ مجھ سے بڑی محبت اور دوستی کا سلوک کرتی تھیں اور میرے زمانہء طالب علمی میں میری پروگریس سے کافی دلچسپی رکھتی تھیں اس لئے انکی خوشی میں مجھے حقیقی خلوص کی خوشبو محسوس ہوئی۔

کچھ دیر بعد ہم واپس ذوالفقار بھائی جان کے یہاں آئے۔ میں اپنی اماں اور ابا سے ملنے یا انکے ساتھ یہ خوشی منانے کے لئے بیقرار تھا مگر میر پور خاص سے رابطہ ممکن نہیں تھا یہی سوچ لیا کہ میر پور خاص کے لڑکے جب حیدر آباد سے رزلٹ دیکھ کر واپس آئینگے تو ہمارے گھر والوں کو بھی معلوم ہو ہی جائیگا۔ادھر وجیہہ نوشابہ اور رضوانہ نے مبارکباد دینے کے بجائے میرا خوب ریکارڈ لگایا اور مجھے خوب خوب طعنے دئے کہ اب میں پتہ نہیں کتنی بڑی چیز ہوگیا ہوں اور اب تو میں ان سے بات بھی نہیں کرونگا اس پیار بھری چھیڑ چھاڑ میں ایک ایسا خلوص اور اتنی پرانی محبت اور رفاقت چھپی تھی کہ اسے صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا ان تینوں بہنوں سے تو میری دوستی بڑی پرانی تھی، اتنی پرانی کہ یہ جب تیسری جماعت میں اُس سکول میں جاتی تھیں جہاں کشوری آپا ہیڈ مسٹریس تھیں اور میں میر پور سے آتا تھا تو یہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھیں اور میں بھی انکے ساتھ کھیل کے وقفے میں ایک کھٹا پھل شاید کٹھل کھایا کرتا تھا۔بہر حال ڈاکٹری کی سند حاصل کرنے کی پہلی رات ان لوگوں کی کمپنی میں ہنسی مزاق، خوش گپیوں اور چھیڑ چھاڑ کرتے گذری مجھ پر ایک سرور ایک ایسا نشہ طاری تھا کہ مجھے اپنا وجود ہلکا اور ہوا میں تحلیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔وہ کیفیت ایک منفرد کیفیت تھی اور اسکے بعد اگرچہ میں نے اللہ کے فضل سے اور کامیابیاں بھی حاصل کیں مگر ایسی کیفیت پھر کبھی طاری نہیں ہوئی۔شاید یہ پہلی پہلی کامیابی کا نشہ تھا۔

دوسرے دن خاندان کے کئی افراد ملنے آئے میں بھی اپنے بزرگوں جن میں اوّل میری بڑی خالہ جنہیں ہم خالہ بی کہتے تھے اور چھوٹی خالہ جو خالہ جان کہلاتی تھیں سلام کرنے اور انکی دعائیں سمیٹنے انکے گھر گیا۔انہوں نے بھی بہت پیار سے گلے لگایا۔سب لوگوں کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ اب کیا ارادہ ہے۔ میرے لئے بھی یہ سوال تو اہم تھا ہی مگر میں فی الحال جلد سے جلد میر پور خاص جا کر اپنے گھر والوں اور اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا تھا اور کچھ اپنے ذہن کو سکون دینا چاہتا تھا۔

میر پور خاص واپسی

اگلے ہی دن میں نے سہ پہر کی گاڑی مہران ایکسپریس پکڑی اور میر پورخاص کی راہ لی۔اس وقت تک چھوٹی لائن کو تبدیل کر کے کراچی سے میر پورخاص تک بڑی لائن ڈالدی گئی تھی اور مہران ایکسپریس پر ریلوے کا عملہ بھی میر پورخاص ہی کا تعینات ہوتا تھا۔ یہ گاڑی صرف تین سٹیشنوں پر رکتی تھی اور چار گھنٹے میں میر پورخاص پہنچ جاتی تھی۔ میں رات کو پونے دس بجے میر پور خاص پہنچا۔ میر پورخاص گھر میں میرے پہنچتے سے عید کا سماں ہو گیا۔ سب سے پہلے امّاں اور ابّا کے گلے لگا سلطان بھائی جان، بھابی نے دعائیں دیں۔ میری ترقی اور کامیابی میں سلطان بھائی جان کا تو بہت ہی بڑا حصہ تھا انہوں نے ایک طرح سے میرے لئے قربانی دے کر مجھے ڈاکٹر بنایا تھا۔

شاہ عبدللطیف کالج

دوسرے دن میں شہر گیا۔ سب سے پہلے اپنے پرانے کالج، شاہ عبدا لطیف گورنمنٹ کالج گیا۔ اگرچہ اس وقت مجھے یہ کالج چھوڑے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے مگر پھر بھی نہ صرف میرا اس مادرعلم سے گہرا تعلق قائم تھا بلکہ میں دلی طور پر اس عظیم درسگاہ کا شکر گذار اور احسان مند تھا کہ اسی نے مجھے وہ بنیاد فراہم کی تھی جسکی وجہ سے میں آج فارغ التحصیل ڈاکٹر تھا۔ یہاں اب وہ پرانے پروفیسران بھی نہیں تھے جنہوں نے مجھے تعلیم دی تھی مگر پھر بھی تمام عملہ مجھ سے واقف تھا اور میں بیحد خاکساری سے یہ لکھ رہا ہوں کہ وہ مجھ پر فخر کرتا تھا۔ اسی لئے ان کے لئے یہ بہت مایوسی کی بات تھی کہ ایم بی بی ایس کے فائنل میں یونیورسٹی میں میری پوزیشن نہیں تھی۔ اس کا افسوس تو مجھے اب بھی کبھی کبھی ہوتا ہے مگر میں نے اس کو قبول کر ہی لیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اسکی وجہ پوچھی۔ میں نے دیانت داری سے اس کی ذمہ داری اپنے آپ پر لیتے ہوئے انکو امتحان میں ایک پورا سوال چھوڑنے کی تفصیل بتائی۔

دراصل مجھے بعد میں ہمارے میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹ آفس کے ہیڈ کلرک سمو نے بتایا کہ میری پوزیشن نہ آنے پر عالمانی صاحب جو میڈیسن کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور پروفیسر صالح میمن کے نائب تھے اس قدر حیران ہوئے تھے کہ انہوں نے خاص طور سے امتحان کی پوری شیٹ نکلوا کر دیکھی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔

شاہ لطیف کالج میں اس وقت عبدالباطن صاحب پرنسپل تھے وہ سلطان بھائی جان سے بھی خوب واقف تھے انہوں نے اپنے کمرے میں بٹھا کر چائے پلائی۔ میر پورخاص سے صرف چار لڑکے میں، محمد حسین لغاری، فیض محمد ہالیپوٹہ اور پرشوتم اور ایک لڑکی نجمہ شیخ ڈاکٹر بنے تھے۔ رشید غوری اپنے حادثے کی وجہ سے پاس نہیں ہو سکا تھا۔ ان سب کا بھی تذکرہ رہا۔

اب جلد سے جلد سندھ یونیورسٹی سے سرٹیفیکیٹ اور مارکس شیٹ لینی تھی اور کراچی جا کر پاکستان میڈیکل کاؤنسل سے رجسٹریشن کروانا تھا۔

دو دن بعد میں نے حیدر آباد جا کر اپنی مارکس شیٹ اور فائینل امتحان پاس کرنے کا عارضی سرٹیفیکیٹ بھی حاصل کر لیا۔ مارکس شیٹ دیکھ کر ایک بار پھر اپنی پوزیشن کھونے کا افسوس ہوا کیونکہ سالانہ امتحان کے ایک ہزار نمبروں میں میرے اور منیر کے درمیان صرف گیارہ نمبروں کا فرق تھا۔ یعنی اگر میں نے میڈیسن کے پرچے میں گاؤٹ پر ایک پورا سوال جو پچیس نمبروں کا تھا نہ چھوڑا ہوتا تو مجھے اس سوال میں یقیناً گیارہ نمبروں سے زیادہ نمبر ملتے۔ بہر حال ایک انگریزی محاورہ ہے کہ IT WAS MEANT NOT TO BE اور میں نے اس موضوع کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

پاکستان میڈیکل کاؤنسل

کراچی پہنچ کر میں نے اس دفعہ فرخی خالہ جان کے یہاں ڈیرا ڈالا۔ میرے کئی ہم جماعت بھی حیدر آباد سے آئے ہوئے تھے کیونکہ سب کو پاکستان میڈیکل کاؤنسل سے رجسٹریشن کروانا تھا یہ ادارہ مرکزی حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم لوگ دوسرے دن پاکستان سیکرٹریٹ گئے یہ مسجد خضرا کے ساتھ وکٹوریا روڈ اور شاہراہ عراق پر پرانی جھگی نما بیرکوں میں قائم تھا۔ اس زمانے میں ہر چیز بہت آسان تھی اور ڈاکٹروں کی بیحد عزت تھی کیونکہ پورے پاکستان میں صرف آٹھ میڈیکل کالج یعنی پانچ مغربی پاکستان میں اور تین مشرقی پاکستان میں تھے اور ہر کالج میں اوسطاً ایک کلاس میں صرف ڈیڑھ سو طالب علم تھے۔ اسطرح پورے ملک سے صرف نو سولڑکے فارغ التحصیل ہوتے تھے۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کلرکوں نے مبارکباد کے ساتھ ہنسی مزاق کیا۔ ہمیں ہر دستاویز کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوانی تھی میرے ساتھ ضیاء الحق، ملا باری اور حسن عارف تھے ہم نے پہلے فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوائیں پھر جب تک وہ کاپیاں بنتیں اسکا انتظار کرنے کے لئے JABEES جو اس زمانے میں کراچی کی ایک بہت پوش ریسٹورنٹ تھی چائے اور پیٹیز کھائیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ شاید اس لئے کہ اس دور میں ہمارے اپنے اندر سے خوشیوں اور مسرتوں کے چشمے ابل رہے تھے کہ ایسا مزہ آیا کہ اسکے بعد، جب ہم سب اپنے اپنے طور پر مالی اور پیشہ ورانہ طور پر بیحد کامیاب تھے اس جگہ دوبارہ آئے تو پھر اس دن جیسا مزہ نہیں آیا۔

دو ہی دن کے بعد ہمیں پاکستان میڈیکل کاؤنسل کا رجسٹریشن مل گیا یہ ایک بہت ہی متاثر کن دستاویز تھی جس پر سنہری اور سرخ مہریں لگی تھیں اب ہم کسی کو بھی قانونی طور پر قبول کئے جانے والا میڈیکل سرٹیفیکیٹ دے سکتے تھے اور ایسی دوائیں جنہیں حکومت سختی سے کنٹرول کرتی ہے لکھ کر دینے کا اختیار رکھتے تھے۔ اس نئے اختیار کا بھی احساس ایک منفرد احساس تھا اور ہم تمام دوست اپنی اس اہمیت کے نشے میں چور تھے۔ اب ہر چیز اور نوکری کے لئے تمام متعلقہ ضروریات مکمل ہو چکی تھیں اور میں نوکری کی تلاش میں کراچی کی سڑکیں ناپنے اور مختلف دروازے کھٹ کھٹانے کے لئے تیار تھا۔ میرے باقی دوست جلد ہی واپس جام شورو جا رہے تھے کیونکہ اب انہیں وہاں ہاؤس جاب شروع کرنی تھی۔

''زندگی کی زکوٰۃ''

رونقِ کائنات

محمودالحسن (راولپنڈی)

روزِ روشن کہ رات ، کیا ہوگی
آنے والی حیات، کیا ہوگی
جن کے دن بھی ہیں تیرہ وتاریک
دوستو اُن کی رات کیا ہوگی
بات کرنے کی آرزو ہے مگر
آگئے وہ تو بات کیاہوگی
اب تو دل ہی نہیں ہے پہلو میں
اب یہاں واردات کیا ہوگی
ہائے شکّر فشانیاں اُن کی
اور شاخِ نبات کیا ہوگی
اُن کے رستہ میں موت سے بڑھ کر
زندگی کی زکوٰۃ کیا ہوگی
اُن سے بڑھ کر جہان میں کوئی
ذاتِ والا صفات کیا ہوگی
وہ نہ ہوں گے تو آپ ہی سوچیں
رونقِ کائنات کیا ہوگی
بے حضوری کی مشق ہے واعظ
اور تیری صلوٰۃ کیا ہوگی
ہم نہیں التفات کے قابل
نگہِ التفات کیا ہوگی
جس میں قربانیوں کا نام نہ ہو
ایسی مُردہ حیات کیا ہوگی
جو نہیں گم تری محبت میں
اُن سے تکمیلِ ذات کیا ہوگی
جس کی کھائے خُدا قسم محمودؔ
وہ قلم وہ دوات کیا ہوگی

''فصیلِ جبر''

(حبیب جالب کی نذر)

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

دل میں اتر گیا ہے جو لہجہ اس کا ہے
ہم جس پہ چل رہے ہیں وہ رستہ اسی کا ہے
اس نے فصیلِ جبر گرائی زمین پر!
اہلِ ہنر کے ہاتھ میں تیشہ اسی کا ہے
پرچم بنا کے اپنے گریباں کا خوش رہا
جوحرفِ حق زباں پہ ہے تحفہ اسی کا ہے
صحرا کی وسعتوں پہ گماں دائرے کا تھا
آوارگی کے پاؤں میں چھالا اسی کا ہے
بخشی غرورِ فن نے عجب آگہی اسے
جو سر کبھی کہیں نہ جھکا تھا اسی کا ہے
اچھا ہوا کہ خواب کی تعبیر مل گئی
خوش ہوں کہ شہرِ عشق میں فرداسی کا ہے
ہر بوالہوس نے زر کی اسیری قبول کی
زندان میں جو کھلا ہے دریچہ اسی کا ہے
جالبؔ سے جا ملے ہیں بغاوت کے سلسلے
غالبؔ سے بڑھ کے شہر میں چرچا اسی کا ہے
وہ سیر چشم جس کے تصرف میں کچھ نہ تھا
لیکن دل و نگاہ پہ قبضہ اسی کا ہے
منظر تمام قریۂ جاں کا ہے سوگوار
اس سر زمیں پہ درد کا دریا اسی کا ہے
وہ خیمہ زن ہے دشتِ عدم میں حسنؔ بجا
لیکن لبِ حیات پہ قصہ اسی کا ہے

رباعیات

ڈاکٹر کمار پانی پتی (بھارت)

کانپتی انگلیوں پر قلم بوجھ ہے
کاش اب اسکو کوئی جواں تھام لے
فکر وفن پر مرے اتنا احساں کرے
نسلِ آدمی کو میرا ہی پیغام دے

☆

میں بھی سقراط ہوں آج کے دور کا
میرے ہاتھوں میں بھی زہر کا جام ہے
سُن سکو تو سنو میری آواز بھی
میرے لفظوں میں بھی ایک پیغام ہے

☆

ڈوبتی نبض کی نرم ضربوں میں بھی
ساتھیوایک بجھتی سی آواز ہے
سُن سکو تو میری دھڑکنوں کو سنو!
میرے سینے میں بھی وقت کا راز ہے

☆

حاکمِ وقت سب چاہتے ہیں یہی
اُن کے انصاف کی میں دُہائی نہ دوں
گھٹ کے مرجاؤں میں اپنے ہی آپ میں
نہ کچھ آنکھوں سے دیکھوں نہ منہ سے کہوں

☆

ہے اگر یہ ترا آخری فیصلہ
تو لے سن لے مرے دل کی آواز بھی
یہ تو ہے اب ترے ظلم کی انتہا
اب نہیں چل سکے گی یہ دادا گری

☆

جب اٹھاتا ہوں میں ہاتھ بہرِ دعا
رُوح اپنی ہی دھتکارتی ہے مجھے
شرم آتی ہے اب اپنے ہی آپ پر
شکل اپنی ہی پھٹکارتی ہے مجھے

مسکراتا ہوا یہ چمن بیچ کر
فصل گل کا حسیں بانکپن بیچ کر
راہزن ہیں یہ سب رہبران وطن
کھا نہ جائیں کہیں ہر کفن بیچ کر

☆

تاج سے محل تھے میرے سپنوں میں بھی
جن کی تعمیر دھرتی پہ ہو نہ سکی
کیوں کہ پابند میں کچھ اصولوں کا تھا
کوڑی کوڑی مرے پاس محنت کی تھی

☆

لاش جذبات کی میرے کندھوں پہ ہے
روح پر ہے میری بوجھ انصاف کا
مجھ کو بھی اس صدی کا مسیحا کہو
میں ہوں مارا ہوا اپنے اوصاف کا

☆

یوں تو دنیا میں ہیں ان گنت راستے
اِن کا منزل سے بھی کوئی رشتہ تو ہو
جستجوؤں کو پابندِ مقصد کرو
تاکہ ان پہ ہمیں کچھ بھروسہ تو ہو

☆

تاکہ قائم رہیں زندگی کے نشاں
اک دیا اپنی چوکھٹ پہ روشن کرو
گھر کے اندر بھی سب کو ملے روشنی
اور باہر بھی چلنے میں مشکل نہ ہو

☆

آپ سے تو نہیں آشنائی میری
پھر بھی حائل کہیں کوئی پردہ نہیں
بات ہوتی ہے اکثر بہت کھل کے بھی
پھر بھی ہیں کچھ نہ کچھ الجھنیں تو کہیں

''حرف راز''

ظریفؔ احسن

(کراچی)

مظفرگڑھ کے مہندر پرتاپ چاندؔ کو
ہریانہ، بھارت میں
مظفرگڑھ کے ظریفؔ احسن کا
کراچی پاکستان سے
سلامِ شاعری
سلامِ اردو، سلامِ وطن، سلامِ انسانی
چاندؔ صاحب ''سوبھراج نارنگ'' کے ہاں
یکم اگست ۱۹۳۵ء کو ضلع ''مظفرگڑھ'' میں
پیدا ہوئے، خوشی کی شہنائی
اور میں خاکسار و عاجز، ظریفؔ احسن کی پیدائش
۲۵ر جولائی ۱۹۵۴ء مظفرگڑھ پاکستان
محمد حنیف خاں کے گھر، شکرِ سجدہ
اللہ کے حضور سجدہ ریز
چاندؔ صاحب کی والدہ، دیاوتی
ظریفؔ احسن کی والدہ، زبیدہ خاتون
دونوں عظیم ماؤں کو
مظفرگڑھ سے عقیدت کے پھول
پاک و ہند (برِعظیم)
دنیائے اردو، دنیائے سرائیکی
دنیائے ادب سے عقیدت کے پھول
کراچی پاکستان سے
ہریانہ بھارت سے، عقیدت کے پھول

مہندر پرتاپ چاندؔ کا
پہلا شعری مجموعہ ''حرف راز''
ظریفؔ احسن کا
پہلا شعری مجموعہ ''موسم موسم ملتے تھے''
ترجمہ سرائیکی میں
پروفیسر ظہور احمد فاتحؔ ''موسم موسم مل دے ہا سے''
سرائیکی ادب کا قاری بھی ظریفؔ احسن کو پڑھتا ہے
سرائیکی کتابت میں،
''سِک سمندر'' کی شاعری میں
غلام عباس صادؔر محترم ہیں
سرائیکی وسیب کے تناظر میں
دھرتی فرید کے مناظر میں، ظریفؔ احسن
ظہور احمد دھریجہ، ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز
اقبال سوکڑی، اصغر گورمانی کی الفت نگاری
جگمگاتی ہے
اپنے قاری کا دل لبھاتی ہے
اردو ادب کے حوالے سے، ظریفؔ احسن
مظفرگڑھ میں اردو شاعری ''حرف راز''
کی تین جلدیں مرتب کر چکا ہے
مزید جلدوں کے لیے کوشاں ہے
جہدِ مسلسل روز و شب
جستجو کے سنہرے سفر کو
جاری و ساری رکھا ہوا ہے
ظریفؔ احسن کے اس نادر شاہکار کا نام
''حرف راز، مظفرگڑھ''
نادر شاہکار اس لیے، کہ
حرف راز میں شعرائے مظفرگڑھ ہیں

○

''ٹرانزِٹ''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

چار دیواری گھر کی ہوتی تھی۔۔۔
اِک تحفظ کی پھیلتی سی ردا۔۔۔
اب یہ احساس اجنبی ٹھہرا۔۔۔
دَر جو حفظ واماں کا بند ہُوا۔۔۔
کون جانے کہ پھر کھُلے نہ کھُلے۔۔۔
وہ جو اپنائیت کا پھُول گرا۔۔۔
کون جانے کہ پھر کھِلے نہ کھِلے۔۔۔
اور اعتبار کا بُجھا ہے دِیا۔۔۔
کون جانے کہ پھر جلے نہ جلے۔۔۔
اِک سراسیمگی کا عالم ہے۔۔۔
لمحۂ موجود ہی تو اپنا ہے۔۔۔
آتی جاتی رُتوں کا کیا معلوم۔۔۔
کونسا جھونکا آ کے بکھرا دے۔۔۔
کونسا حادثہ جُدا کر دے۔۔۔
اجنبیت کی دُھند رہتی ہے۔۔۔
وسوسوں کی کمند رہتی ہے۔۔۔
اس سفر سے جُدا اِک اور سفر۔۔۔
جن کے مابین ایک ٹھہراؤ۔۔۔
اب تو ایسے لگے ہے گھر ہی میں۔۔۔
جیسے ٹھہرے ہوئے ٹرانزِٹ میں۔۔۔!

○

قطعات

اسد اعوان
(سرگودھا)

میرا مقصد میرا اسلوب سمجھ لیتے ہیں
میرے احباب مجھے خوب سمجھ لیتے ہیں
کیا کروں ایک نظر دیکھتا ہوں جس کی طرف
لوگ اُس کو میرا محبوب سمجھ لیتے ہیں

یہ بھی تو میری جان ضروری ہے شہر میں
اپنا بھی اِک مکان ضروری ہے شہر میں
روکی ہوئی سانس تعفن سے اِن دنوں
اک عطر کی دُکان ضروری ہے شہر میں

یاروں کی غلط گوئی پہ خاموش رہے تھے
محفل میں مگر ہم ہمہ تن گوش رہے تھے
کچھ روز تعاقب میں رہے اپنے مخالف
کچھ روز ترے واسطے روپوش رہے تھے

اُونٹ کو باندھ دیا تیغ اُتاری میں نے
شب حریفوں کے علاقے میں گزاری میں نے
جنگ جوئی میں بھی حساس مزاجی نہ گئی
اپنے گھوڑے کو کبھی ایڑی نہ ماری میں نے

عجب ذوق تھا اُس کا کتاب ہاتھ میں تھی
خُمار آنکھ میں لیکن شراب ہاتھ میں تھی
بہت لگاؤ تھا اُس خوبرو کو پھولوں سے
چمن سے نکلا تو شاخِ گلاب ہاتھ میں تھی

○

ہجرت

شاہد عزیز
(اودے پور، بھارت)

یہ زمین تو پیاسی تھی
خون پی گئی سارا
آؤ تم کو لے جاؤں
ایک ایسی دنیا میں
خواب بستے ہیں جس میں
شب میں چاند تارے اور
دن میں پھول کھلتے ہیں
جس کی سرحدوں سے یہ
آسمان ملتے ہیں
ہم وہیں پہ چلتے ہیں
یہ زمین تو پیاسی تھی
خون پی گئی سارا

○

کاش!

زاہدہ عابد حنا
(کراچی)

کاش کوئی ہم کو بھی
اس طرح سے چاہے تو۔۔۔
ہم جو روٹھ جائیں تو
یوں ہمیں منائے وہ
ہاتھ لے کے ہاتھوں میں
ہم سے وہ کہے، جاناں!
تم جو یوں خفا ہو گی
ہم سے روٹھ جائیں گے،
چاند، تارے اور کلیاں
روشنی، صبا، خوشبو
دل سے آرزوئیں بھی
زندگی سے خوشیاں بھی
بلکہ۔زندگانی بھی۔۔۔
مان جاؤ نا، جاناں!
سب گِلے بھلا دو ناں
اور مسکرا دو ناں۔۔۔
کاش کوئی ہم کو بھی
اس طرح منائے تو!
کاش کوئی ہم کو بھی
اس طرح سے چاہے تو۔۔۔!!

○

فکشن شعریات

تشکیل وتنقید اور گوپی چند نارنگ

محمد متین ندوی (سرونج، بھارت)

ہر زبان میں کچھ ایسی عظیم شخصیات ہوتی رہی ہیں، جن کی وجہ سے زبان کا وقار قائم ہوتا ہے اور جو ایک مجدد کی حیثیت سے زبان کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ زبان کو ایک نئی شان اور آن بان بخشتی رہی ہیں، اسی طریقہ سے اردو زبان وادب اور تنقید ولسانیات کے کے نبض شناس، اور زبان وتنقید کی روح سے کماحقہ واقف عظیم شخصیت کا نام پروفیسر گوپی چند نارنگ ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب اور تنقید کو اپنی بصیرت افروز تحریروں سے ایسے وقت میں مالا مال کیا، اور ایسے وقت میں اس کی نیّا پار لگائی، جب کہ افسانہ، غزل، نظم اور دیگر اصناف میں فرسودگی، لایعنیت، بے معنویت، لاسمتیت اور تجرید نے اپنے پیر جما لئے تھے اور بطو رخاص افسانہ اور غزل کی معنویت اور اس کی اہمیت وافادیت پر سوالیہ نشان لگ چکا تھا۔ قاری ادب سے دور بھاگنے پر مجبور نظر آرہا تھا، کیونکہ ادب کا رشتہ قاری سے کٹ چکا تھا، افسانوں کے نام پر ایسے ایسے افسانے لکھے جارہے تھے، جن میں کہانی کا وجود ہی نہیں تھا، صرف لفظی کھیل کھیلا جارہا تھا۔ استعاراتی اور تجریدی افسانے تحریر کئے جارہے تھے۔ ایسے وقت میں نارنگ صاحب نے اپنی تنقیدی بصیرت سے گم ہوتے جارہے قاری کو دریافت کیا، کہانی میں کہانی پن کے ہونے پر اصرار کیا، ادب کا رشتہ قاری سے استوار کیا۔ اس کام کے لئے انھوں نے سیمینار کرائے اور نقاد وتخلیق کار سب کو اظہار خیال کے مواقع فراہم کئے اور خود ایسے مضامین اور کتابیں لکھیں، جن سے گم ہوتے ہوئے قاری کی ادب میں دوبارہ واپسی ہوئی۔ کہانیوں کی ابتدا کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے وجود میں آتے ہی کہانیوں کی ابتدا ہوگئی تھی، کیونکہ جب انسان وجود میں آیا تو کہانی شروع ہوگئی یہ الگ بات ہے کہ اردو زبان کے سب سے پہلے باقاعدہ فکشن نگار منشی پریم چند تسلیم کئے جاتے ہیں۔ پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے افسانے کو ہمارے معاشرے سے جوڑا، بادشاہوں، وزیروں، شہزادوں اور شہزادیوں، جنوں اور پریوں کے ذکر سے ہٹ کر عام اور غریب ومزدور قسم کے لوگوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، معاشرے میں دبے کچلے انسانوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور کئی ایسے کرداروں کو زندہ جاوید بنا دیا، جن کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایسے ایسے شاہکار افسانے لکھے جو آج بھی نہ صرف زندہ ہیں، بلکہ اپنے اندر بے پناہ کشش بھی رکھتے ہیں، اور جب تک اردو اور ہندی زبان زندہ ہے، پریم چند کے افسانوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کفن، دو بیلوں کی کہانی، شطرنج کے کھلاڑی، دودھ کی قیمت، پوس کی رات، عیدگاہ جیسے درجنوں افسانے ہیں، جن سے ادب کا ہر قاری اچھی طرح واقف ہے، صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان میں وہ کشش موجود ہے کہ آج بھی قاری ان کے افسانوں کو پڑھنے پر مجبور ہے۔ پریم چند کے یہاں صرف حقیقت نگاری ہی نہیں بلکہ گہرا طنز بھی پایا جاتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''فکشن شعریات تشکیل وتنقید'' ہے، جو فکشن شعریات کی تفہیم وتشکیل وتنقید کی راہ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، جس طرح سے شعری تنقید میں الطاف حسین حالی کی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' کو فراموش نہیں کیا جاسکتا بالکل ایسے ہی فکشن شعریات کی تفہیم وتنقید میں گوپی چند نارنگ صاحب کی اس کتاب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ کتاب فکشن شعریات کی تفہیم وتنقید کے سلسلہ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں شافع قدوائی صاحب لکھتے ہیں:

''اب فکشن تنقید کا مرکزی حوالہ Narratology یعنی علم بیانیات ہے۔ بیانیات کے نظری اور عملی مباحث اردو میں مروجہ فکشن تنقید میں کس حد تک بار پاسکے ہیں، اس کے اطمینان بخش جواب کے لئے اردو کے سربرآوردہ نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کے فکشن سے متعلق Trail blazing اور خیال انگیز مضامین سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ افسانہ یا ادبی تخلیق میں آئیڈیالوجی کا نفوذ کس طرح ہوتا ہے، زبان کا خودمگر کردار کیا ہے، بیانیہ کس طرح خود کو قائم کرتا ہے، زبان میڈیم ہے یا حقیقت کی شرط، افسانوی متن کا تاریخی لازمیت کی Teleology سے کیا رشتہ ہے؟ ثقافتی کہانی رخلقیہ یعنی Petit or local story کس طرح حاوی ڈسکورس کے مقابلے میں خود کو قائم کرتی ہے؟ سیاسی طاقت کا ڈسکورس کس طرح فنی تشکیل میں اساسی اہمیت حاصل کرلیتا ہے، یا بیانیہ کس طرح مقبول عام مذہبی یا تہذیبی تصور یا آئیڈیالوجی کو Subvert کرتا ہے، افسانہ میں کسی ایک مرکزی موضوع کی تلاش کیوں فعل عبث ہے، کرداروں کا تفاعل اور راویوں کا نقطہ نظر کس طرح افسانوی متن کی Polyphony میں تقلیب کرتا ہے، اس نوع کے انتہائی اہم، حساس اور خیال انگیز سوالات، جن کی گونج شاید ہی اردو میں مروجہ فکشن تنقید میں سنائی دیتی ہو، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اٹھائے ہیں اور پھر استنادی شہادتوں کے توسط سے مدلل اور مثبت جوابات بھی دئے ہیں۔

صنف افسانہ ابتداء ہی سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقیدی کاوشوں کا محور رہی ہے اور انھوں نے افسانہ کے علاوہ نظم، مثنوی اور دیگر اصناف سخن میں بھی افسانہ کے Kemel point یعنی Story line کی معنویت پر دقت نظر کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے Myth اور Legend کی بازتخلیق، متن کی نوتشکیل اور اس کی معنویت پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی سے متعلق ان کے Seminal مضمون

'بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں' نے برصغیر میں بیدی فہمی کی ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔ یہ مضمون آرکی ٹائپل اور اسطوری تنقید کے نظری اور اطلاقی امکانات کو پہلی بار گہری تنقیدی بصیرت کے ساتھ روئے کار لاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وارث علوی اسے اردو فکشن تنقید کی سب سے بہتر اور خیال انگیز مثال قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ افسانوی تنقید کے بہت سے گُر انھوں نے اس مضمون سے سیکھے ہیں۔

گزشتہ چار دہائیوں سے گوپی چند نارنگ دلجمعی کے ساتھ فکشن سے متعلق نظری اور عملی پہلوؤں پر مضامین لکھ رہے ہیں اور فکشن تنقید کے نئے میلانات ور جحانات اور علم بیانیات کے نظری مباحث اور عالمی تناظر سے اردو دنیا کو مسلسل واقف کرا رہے ہیں۔ نارنگ صاحب کو اسلوبیاتی تنقید، جدید اور مابعد جدید تنقید کے بنیاد گزاروں میں بجا طور پر امتیازی مقام دیا جاتا ہے تاہم فکشن تنقید کو ان کی عطا (Contribution) کا اعتراف اردو تنقید کے ناخن پر قرض ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نارنگ صاحب کے فکشن سے متعلق مضامین اب تک یکجا طور پر شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اب یہ مضامین ایک مبسوط کتاب کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں، جس سے نہ صرف موضوع کی تلخیص سے گرانبار فکشن تنقید کی نارسائی کا احساس دو چند ہوگا بلکہ افسانہ کی شعریات کے امتیازات بھی واضح ہو جائیں گے۔ فکشن مطالعات سے متعلق نظری مباحث اور ان کی اطلاقی جہتوں کے امکانات کو محیط ان مضامین پر مشتمل کتاب Franz Stanzel کی شہرہ آفاق کتاب A theory of narraative کی طرح ایک بنیادی کتاب ثابت ہوگی اور رہنمایانہ کردار ادا کرتی رہے گی۔''

شافع قدوائی صاحب نے ان چند لائنوں میں ہی نارنگ صاحب کی تنقیدی بصیرت پر علمی انداز میں روشنی ڈالی ہے اور نارنگ صاحب کی تنقیدی روش، طرز نقد اور تخلیق کی تہہ تک پہنچ کر لکھنے کو عالمانہ اور مفکرانہ طور پر بیان کیا ہے۔ فکشن شعریات کے سلسلے میں نارنگ صاحب کی دین کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ فکشن شعریات اور اس کی تشکیل وتنقید کے سلسلے میں نارنگ صاحب کی کتاب تو بے بدل، عالمانہ ومفکرانہ اور تنقیدی بصیرت سے پُر ہے ہی ساتھ ہی شافع قدوائی صاحب کا مقدمہ بھی لاجواب ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون ہے 'افسانہ نگار پریم چند (تکنیک میں Irony کا استعمال)' اپنے اس مضمون میں نارنگ صاحب نے لکھا ہے کہ ابھی تک پریم چند کو ان کے پورے تخلیقی سرمائے کی روشنی میں صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں گیا ہے، کیونکہ اردو والے ہندی کے پریم چند سے عام طور پر واقف نہیں اور ہندی والے اردو والے پریم چند سے ناواقف ہیں، اور جب تک پریم چند کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تخلیقات کی روشنی میں نہیں پڑھا جائے گا، پریم چند شناسی کا حق نہیں ادا ہوسکتا۔ اپنے اس مضمون میں گوپی چند نارنگ صاحب نے پریم چند کے افسانوں میں طنز کی موجودگی سے روشناس کرایا ہے، اور ان کے مختلف افسانوں کا تجزیہ کر کے ان کے افسانے کی خوبیوں سے قاری کو متعارف کرایا ہے، پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید اور ان کے تجزیاتی تحریر کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے ادیب پر لکھتے ہوئے جہاں اس کی خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اس کے کمزور پہلوؤں کو بھی پیش کر دیتے ہیں، پریم چند کے افسانے کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کفن کے فنی کمال اور اس کا نقش ابھارنے کے لئے اسے تمثیلی طور پر نہیں بلکہ Irony سطح پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ Irony میں لفظوں کے وہ معنی نہیں ہوتے جو بادی النظر میں دکھائی دیتے ہیں، بلکہ ان میں صورت حال میں مضمر المیے پر یا آنکھوں سے اوجھل حقیقت کے کسی دردناک پہلو پر طنزیہ وار مقصود ہوتا ہے۔ اونچی ذات اور صاحب اقتدار طبقے نے جس طرح انسان کا استحصال کیا ہے اور اس کی روح کو نچوڑ کر اس کو عام انسانی حس تک سے محروم کر دیا ہے، یا حیوان کی سطح پر جینے کے لئے مجبور کیا ہے، یہ کہانی اس کی دردناک طنزیہ تصویر ہے۔ صورتِ حال کی دردناکی اور اس کی طنزیہ پیش کش شروع ہی سے سامنے آجاتی ہے، جب جھونپڑے کے اندر جوان بہو، بُدھیا دردِزہ سے پچھاڑیں کھا رہی ہے لیکن باپ بیٹا دونوں باہر بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہیں، جاڑے کی تاریک رات میں عورت تڑپ رہی ہے، رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی ہے کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے ہیں دونوں اس کا درد محسوس کرتے ہیں، لیکن اندر جانے کو کوئی تیار نہیں، کیونکہ اندیشہ ہے کہ الاؤ میں بھون بھون کر چوری کئے ہوئے جو آلو وہ کھا رہے ہیں، دوسرا ان کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ اگرچہ یہ کہانی کفایت لفظی کا شاہکار ہے اور ایک سنگین حقیقت کی ترجمانی نہایت کھردرے الفاظ میں کرتی ہے، تاہم گھیسو اور مادھو کی ذہنیت کے عوامل کی وضاحت کرتے ہوئے جو جملے پریم چند نے لکھے ہیں، وہ پوری کہانی کی Irony اور طنزیہ اشاریت کے خلاف ہیں، کیونکہ بات ان کے بغیر بھی مکمل ہے۔''

نارنگ صاحب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بغیر دلیل کے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ جس فنکار کے متعلق جو باتیں کہتے ہیں، جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں، اس کے لئے دلائل بھی پیش کرتے ہیں، ان کی ہر تحریر علمیت اور تنقیدی بصیرت کی حامل ہوتی ہے، وہ کسی تخلیق کا سرسری مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اس کے باطن میں اتر کر اور اس میں ڈوب کر موتی چنتے ہیں، اور جس فنکار پر لکھتے ہیں، حق ادا کر دیتے ہیں۔ پریم چند پر لکھے ہوئے اس مضمون کو جب ہم پڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے تخلیق کار کی تفہیم اور اس کے فن کی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے، مضمون کے آخیر میں پریم چند اور ان کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پریم چند نے ساری زندگی راہ کے کانٹے نکالنے میں گزاری، اردو کی بھی خدمت کی اور ہندی کی بھی۔ ہندی میں لکھا تو اردو میں بھی ساتھ ساتھ شائع کیا۔ بعد میں آنے والوں نے جن بنیادوں پر اردو ہندی افسانے اور ناول کا

ایوان تعمیر کیا ہے، وہ بنیادیں پریم چند کی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ پریم چند کا ذہنی فکری اور فنی ارتقاء برابر جاری رہا۔ وہ داستان کی فضا سے نکل کر شجاعت و مردانگی کی راجپوتی فضا میں آئے اور پھر اس سے آگے قدم بڑھا کر انھوں نے وطن کے درد کو سمجھا، تحریک آزادی کی تڑپ بھی محسوس کی، اور انسان کو بھی پہچاننا سیکھا۔ اس میں انھوں نے پہلے آدرشوں سے بھی مدد لی، گاندھی واد کو بھی آزمایا اور اشتراکیت کا بھی سہارا لیا۔ لیکن ایک سچے فنکار کی طرح وہ آگے بڑھنا، رد و قبول کرنا اور ٹھکرانا اور اپنانا جانتے تھے، اپنے حق سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ ان کے فن کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو Outgrow کیا اور اپنے تخلیقی سفر کے دوران وہ کبھی کسی ایک نقطے یا دائرے کے اسیر نہیں رہے۔''

نارنگ صاحب نے اپنے اس مضمون میں پریم چند کی فنی خوبیوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور فکری تبدیلیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور بطور خاص ان کے افسانوں میں Irony کی موجودگی کو اجاگر کیا ہے۔

دوسرا مضمون ہے 'منٹو کی نئی پڑھت: متن، ممتا اور خالی سنسان ٹرین' منٹو ایک ایسے منفرد، بے باک اور باغی ذہن کے حامل افسانہ نگار تھے، جن کی مثال نہیں ملتی۔ نارنگ صاحب منٹو کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو اول و آخر ایک باغی تھا، سماج کا باغی، ادب و آرٹ کا باغی، یعنی وہ شے جسے Doxa یا روڑھی کہا جاتا ہے یا فرسودہ اور ازکار رفتہ عقائد وتصورات یا ذہنی رویے، منٹو اس کا دشمن تھا۔ منٹو کے خون میں کچھ ایسی حرارت اور گردش تھی کہ وہ فطرتاً اور طبعاً ہر اس شے سے شدید نفرت کرتا تھا جسے بالعموم اخلاق وتہذیب کا لبادہ پہنا دیا گیا ہو۔ اس کی اکسیری نگاہ فوری طور پر ان لبادوں کو کاٹ کر اس حقیقت تک پہنچ جاتی تھی، جو ہر چند کہ تلخ اور تکلیف دہ تھی لیکن سچائی کی سطح رکھتی تھی۔ وہ اس ننگی کوری سچائی کا جویا تھا جو سامنے آتی ہے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ منٹو کو دوست احباب تو بہت ملے، لیکن اس کا سفر ایک مضطرب روح کا سفر تھا جسے اس کی زندگی میں بہت کم کسی نے سمجھا، بلکہ بالعموم منٹو کو غلط ہی سمجھا گیا اور زندگی بھر وہ ملامتوں اور رسوائیوں کی زد میں رہا۔ اس کے باطن کی آگ برابر دہکتی رہی اور کسی منزل پر بھی اس کے یہاں تھکن یا بیزاری نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔''

منٹو کو اس کی زندگی میں بہت ہی کم کسی نے سمجھا، جیسا کہ گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنے اس مضمون میں بالتفصیل وضاحت کے ساتھ لکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اسی باغیانہ ذہن کی وجہ سے اپنے افسانوں میں اشرافیہ کی تہذیبی ریاکاری کو بے نقاب کرتے اور اس کے پردوں کو چاک کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے افسانوں پر فحاشی اور عریانیت کا لیبل لگایا گیا انھیں جنس نگار، فحش نگار اور طوائفوں کا افسانہ نگار کہا گیا، بے باک اور سچے افسانوں کی وجہ سے ان پر مقدمات چلے، جن کی وجہ سے انھیں ذہنی اور دلی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

''اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''

''جو لوگ فحش ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے، خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔''

منٹو کی تحریر کے یہ دونوں اقتباسات فکشن شعریات کے صفحہ نمبر 72 سے ماخوذ ہیں، جو نارنگ صاحب نے ادب جدید سے پیش کئے ہیں۔ منٹو کے افسانوں پر فحش ادب کا الزام لگانے والوں کو وہ کہتے ہیں کہ کہ مجھ پر فحش نگاری کا الزام مت لگاؤ میں تو حقیقت کو پیش کرتا ہوں اور اگر تم حقیقت کو برداشت نہیں کر سکتے تو ان حالات اور ان مسائل کو ختم کرو جو ایسے ادب کے محرک ہیں۔ کیونکہ جب موجودہ نظام اور معاشرہ سے برائی دور ہو جائے گی تو میں خود ایسے افسانے نہیں لکھوں گا کیونکہ میں تو جو کچھ لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں، اس میں قصور میرا نہیں معاشرہ اور تہذیبی بگاڑ اس کا ذمہ دار ہے۔

نارنگ صاحب نے منٹو کے تعلق سے اپنے مضمون میں اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ منٹو کو نہ تو اس کی زندگی میں صحیح طور پر سمجھا اور نہ ہی اب سمجھا جا رہا ہے، کیونکہ اس کی زندگی میں اس پر لعن طعن کا سلسلہ جاری تھا اور اب لکھنے والوں کو ان میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ حالانکہ منٹو پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ادب کو بطور ادب کے پہچاننے اور پرکھنے پر زور دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کے ساتھ غیر ادبی سلوک کیا جاتا رہا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ گوپی چند نارنگ صاحب منٹو کی افسانہ نگاری کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو کی خلاقانہ نظر و یشیاء کی آرائش و زیبائش، یا انداز و اطوار پر نہیں بلکہ اس کی باطنی کیفیت پر مرتکز ہوتی ہے، جب وہ ظاہری لباس سے ہٹ کر فقط ایک عورت رہ جاتی ہے، گوشت پوست کی نرم دل عورت۔ ہماری تنقید نے اس لمحے پر بہت کم غور کیا ہے، جب منٹو کا فن عورت کے داخلی وجود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ درحقیقت منٹو کو جنس نگار کہنا اس کی تذلیل کرنا ہے۔ منٹو کا موضوع پیشہ ور طوائف یا آرائشی گڑیا ہرگز نہیں، بلکہ منٹو کا موضوع پیشہ کرنے والی عورت کی کراہ یا اس کی روح کا الم یا اس کے باطن کا سونا پن ہے، جس کو کوئی بانٹ نہیں سکتا۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے منٹو کے افسانے کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے مختلف افسانوں سے مثالیں بھی دی ہیں، منٹو شناسی کے سلسلے میں یہ مضمون ایک نئے باب کے در وا کرتا اور منٹو کو بحیثیت فنکار سمجھنے کے لئے یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ منٹو کو قدرت نے ایسی نظر عطا فرمائی تھی کہ وہ انسان کے ظاہر نہیں بلکہ باطن تک پہنچتے تھے، انھوں نے عورت کی ظاہری ٹیپ ٹاپ، آرائش و زیبائش اور ناز و انداز کو نہیں بلکہ حقیقتاً ان کے روحانی کرب اور باطن کی کراہ کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں گہرا طنز اور لفظوں کا برمحل اور تخلیقی انداز بھی ہوتا ہے۔ کشش تو ان کے افسانوں میں ایسی ہوتی ہے کہ قاری

کہیں بھی اکتاہٹ محسوس ہی نہیں کرسکتا۔ منٹو معاشرے اور سماج کے اندر رائج تہذیبی، ادبی اور اخلاقی پابندیوں کی بالکل بھی پرواہ نہیں کرتے بلکہ ان کی ظاہری اور بناوٹی اخلاقی قدروں پر طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بغاوت کا جذبہ ان کی فطرت میں شامل تھا۔ منٹو کا یہ کہنا ان کی فکر کے عین مطابق تھا کہ ہم پر فحش ادب تخلیق کرنے کا الزام لگانے والے ان حالات اور مسائل کا خاتمہ کیوں نہیں کرتے، جن کی وجہ سے ایسا ادب تخلیق ہورہا ہے، جب مسائل ختم ہوجائیں گے تو اپنے آپ ایسے افسانوں کی تخلیق بھی بند ہوجائے گی، کیونکہ ہم تو حقیقت کو پیش کرتے ہیں ریاکاری اور بناوٹ ہمارا شیوہ نہیں۔

راجندر سنگھ بیدی ایک ایسے اہم افسانہ نگار تھے کہ ان کے افسانوں کی جڑیں ہماری تہذیب وثقافت میں بہت گہرائی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ان کے افسانوں کو سمجھنے اور ان کی تہہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قدیم ہندوستانی تہذیب کا علم اور اس سے آگہی بھی اشد ضروری ہے۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنے مضمون 'بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں' میں بیدی کے افسانوں میں پائی جانے والی خوبیوں اور اس کے کمال فن کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ بیدی کے فنی کمال اور اور تخلیقی حسن کو بیان کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

''بیدی کے فن میں استعارہ اور اساطیری تصورات کی بنیادی اہمیت ہے۔ اکثر وبیشتر ان کی کہانی کا معنوی ڈھانچہ دیومالائی عناصر پر ٹکا ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ شعوری یا ارادی طور پر اس ڈھانچہ کو خلق کرتے ہیں اور اس پر کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دیومالائی ڈھانچہ پلاٹ کی معنوی فضا کے ساتھ ساتھ از خود تعمیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بیدی کا تخلیقی عمل کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ اپنے کردار اور اس کی نفسیات کے ذریعے زندگی کے بنیادی رازوں تک پہنچنے کی جستجو کرتے ہیں۔ جبلتوں کی خودغرضانہ عمل، جسم کے تقاضوں اور روح کی تڑپ کو وہ صرف شعور کی سطح پر نہیں بلکہ ان کی لاشعوری وابستگیوں اور صدیوں کی گونج کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ بیدی کے یہاں کوئی واحد واقعہ واقعۂ محض نہیں ہوتا۔ بلکہ ہزاروں لاکھوں دیکھے اور ان دیکھے واقعات کی نہ ٹوٹنے والی مسلسل کڑی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل میں چونکہ ان کا سفر تجسیم سے تخیل کی طرف، واقعہ سے لاواقعیت کی طرف، تخصیص سے تعمیم کی طرف اور حقیقت سے عرفان حقیقت کی طرف ہوتا ہے، وہ بار بار استعارہ، کنایہ اور دیومالا کی طرف جھکتے ہیں۔ ان کا اسلوب اس لحاظ سے منٹو اور کرشن چند دونوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ کرشن چند رواقعات کی سطح تک رہتے ہیں۔ منٹو واقعات کے پیچھے دیکھ سکنے والی نظر رکھتے ہیں لیکن بیدی کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ چلتے تو یہ بھی زمین پر ہیں لیکن ان کا سر آکاش میں پاؤں پاتال میں ہوتے ہیں۔ بیدی کا اسلوب پیچیدہ اور گمبھیر ہے۔ ان کے استعارے اکہرے یا دوہرے نہیں پہلودار ہوتے ہیں۔''

بیدی کے افسانوں کے حسن اور ان کی معنویت کو نارنگ صاحب نے اپنے اس مضمون میں بڑی تفصیل اور وضاحت سے تنقیدی اور تجزیاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ بیدی کے افسانوں میں ڈوب کر اور ان کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہی ایسا مضمون لکھا جاسکتا ہے، اور ساتھ ہی اس کے لئے تنقیدی بصیرت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے، نارنگ صاحب علم اور تنقیدی بصیرت کے حامل وہ سمندر ہیں، جس کی گہرائی کو ناپا نہیں جاسکتا۔ وہ ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی پوری نظر رکھتے ہیں، جس پر پوری ادبی دنیا شاہد ہے اور بطور خاص ان کی تحریریں خود شاہد ہیں۔

اس کتاب میں ایک مضمون ساجد رشید کی افسانہ نگاری پر بھی ہے۔ ساجد رشید ایک ایسے بے باک افسانہ نگار اور نڈر صحافی تھے کہ جو اپنی مثال آپ تھے، ان کا رسالہ 'نیا ورق' ادبی دنیا میں اتنا مقبول ومشہور تھا کہ بڑے بڑے نقاد اور ادیب اس کے منتظر رہا کرتے تھے، ان کے اداریوں کی زمانہ میں دھوم تھی، جب بھی 'نیا ورق' کا نیا شمارہ منظر عام پر آتا تھا تو ادبی دنیا میں اس کی گونج ضرور سنائی دیتی تھی۔ وہ بے باک اداریے لکھنے میں مشہور تھے۔ وہ ایک ایسے صحافی تھے کہ مشاہیر ادب بھی ان کے قلم کی طاقت اور فکر کی گہرائی کے معترف تھے۔ بے باکی تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف صحافت میں ہی نہیں بلکہ اپنے افسانوں میں بھی جرأت اظہار سے کام لیا کرتے تھے، اور معاشرے میں پھیلی بدامنی، بے راہ روی، بے سکونی، لاسمتیت اور اخلاقی کھوکھلے پن پر طنزیہ وار بھی کرتے تھے۔ ان کے اچانک اس دار فانی سے کوچ کرنے کے سبب ان کا رسالہ تو بہرحال بند نہیں ہوا بلکہ ان کے لائق فرزند شاداب رشید نے اپنے باپ کی یادگار کو سنبھال رکھا ہے، لیکن ساجد رشید والی بات کہاں؟ رسالہ تو اچھا نکل رہا ہے، اور لائق مبارکباد ہیں ان کے فرزند شاداب رشید کہ انھوں نے 'نیا ورق' کو بند ہونے نہیں دیا لیکن بہرحال ساجد رشید کے اداریوں کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ساجد رشید کے انتقال سے ادبی دنیا میں ایسا خلاء پیدا ہوا ہے، کہ جس کا پر ہونا بظاہر ممکن نہیں۔ ساجد رشید صرف قلم ہی کے دھنی نہیں تھے بلکہ خطابت کے میدان میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ میں نے صرف ایک ہی سیمینار میں ان کا خطاب سنا ہے، اور ایک ہی ملاقات بھی ہوئی ہے، جب وہ سیفی سرونجی کی دعوت پر سہ ماہی 'انتساب' کے پچیس سالہ جشن کے موقع پر سیمینار میں شرکت کرنے کی غرض سے اپنے احباب کے ساتھ سرونج تشریف لائے تھے۔ ان کی آمد سے سیمینار میں چار چاند لگ گئے تھے اور سیمینار بہت کامیاب ہوا تھا، سیمینار میں ساجد رشید کے دوستوں کے علاوہ بھوپال سے مشہور افسانہ نگار اقبال مجید، پروفیسر آفاق احمد، نعیم کوثر، رشید انجم، اقبال مسعود، نصرت مہدی، ضیا فاروقی وغیرہ کے علاوہ مشہور افسانہ نگار دیپک بدکی اور نئی غزل کے ممتاز شاعر پروین کمار اشک بھی تشریف لائے تھے۔

ساجد رشید نارنگ صاحب کے عاشقوں میں شمار ہوتے تھے، وہ نارنگ صاحب کے ایسے قدرداں، ہمدرد اور عاشق صادق تھے کہ نارنگ صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس طرز روش اور فطرت سے ساری ادبی دنیا واقف ہے۔

اپنے اس مضمون میں نارنگ صاحب نے ساجد رشید کے افسانوں کی خصوصیات اوران کی انفرادیت کومفصل بیان کیا ہے، نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

''ساجد رشید کی جڑیں یوپی کے قصبات میں ہیں، ان کی سائیکی میں قصباتی آرکی ٹائپ بھی ابھرتے ہیں لیکن ان کے شعور نے metropolis ممبئی (مہانگر) کی تیزی سے بدلتی ہوئی کمرشیل فضا میں آنکھ کھولی، جہاں برقیاتی ترقی کی تماشا سوسائٹی میں گلوبلائزیشن کی خیرہ کردینے والی ریل پیل وصارفیت نے انسان کو بے حس بنادیا ہے۔ نیز جھوپڑ پٹیوں اور کھولیوں کی عفونت زدہ جرائم کی دنیا جہاں انسان کی زندگی کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہے، بڑے میٹروپلس کی پہچان فقط آبادیوں کی ریل پیل اور تضادات سے ہی نہیں ہوتی، وہ ایک جیتا جاگتا ثقافتی وجود بھی ہوتے ہیں۔ ایسے ہر شہر کی اپنی پہچان اور اپنا کردار ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نمو کرتا ہے اور منقلب بھی ہوتا رہتا ہے۔ مہانگر کے تہذیبی اور سماجی مسائل کے بارے میں متعدد لوگوں نے لکھا ہے لیکن ساجد رشید کے افسانوں میں جس طرح آج کے میٹرو کا وجود ابھرتا ہے اور جس فن کارانہ سفاکی سے انھوں نے مہانگر کے زیرناف اور دوسرے پہلوؤں کے بارے میں بیانیہ تشکیل دیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے زیادہ تر کردار حاشئے کے لوگ ہیں جیسے کہ ہم نے اوپر دیکھا، ان کے یہاں دوسرے مسائل اور موضوعات پر کہانیاں بھی ہیں لیکن جس تخلیقی محویت اور رچاؤ سے انھوں نے آج کے مہانگری تضادات اوران کے گھناؤنے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ ان سے خاص ہے۔ اس نوع کے سماجی ڈسکورس میں نفسیاتی مسائل بھی ہیں۔ جرائم پیشہ داداگیری اور پولس کی بدکاریوں کے مرقعے بھی ہیں، مذہبی منافقت اور ریاکاری کے لاینحل تضادات بھی ہیں۔ وہ ان کی جیتی جاگتی پہچان کو پیش کرتے ہیں اور مہانگر کا وجود اور اس کا subaltem بین السطور میں سانس لیتا معلوم ہوتا ہے۔''

نارنگ صاحب کے اس مختصر سے اقتباس کو دیکھئے کہ انھوں نے چند لائنوں میں ہی کس طرح سے ساجد رشید کے افسانے کی خوبیوں اور ان کے امتیازات کو پیش کردیا ہے۔ ساجد رشید کی افسانہ نگاری پر نارنگ صاحب کا یہ بھر پور اور بے مثل مضمون ہے۔ کیونکہ نارنگ صاحب نے اس مضمون میں ساجد رشید کی کئی کہانیوں کا تجزیہ کیا ہے اور تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔

'مدرسے اور مولسری سے لگی کہانی' کے عنوان سے انجم عثمانی صاحب کی افسانہ نگاری پر بھی ایک طویل مضمون کتاب میں موجود ہے، نارنگ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی پر رواروی میں نہیں لکھتے بلکہ وہ جس پر بھی لکھتے ہیں اپنے دل کی آواز پر لکھتے ہیں، اور جس پر لکھتے ہیں لکھنے کا حق ادا کرتے ہیں، انجم عثمانی پر بھی ایک تفصیلی مضمون زینت کتاب ہے، وہ انجم عثمانی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اکثر فن کاروں کے فن میں ان کے کینوس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو وسیع پیمانے پر لیتے ہیں، زمین آسمان، انسان، زمانے، ہر شے صدیوں پر پھیلی اور وقت کے بہاؤ میں شامل ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو باریک بینی سے کام لیتے ہیں گویا چاول کے دانے پر قل ھواللہ لکھتے ہیں، یا 'منی اے چر' بناتے ہیں، ان کے یہاں ہر چیز چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے۔ انجم عثمانی اختصار نویس ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن واقعیت اور معاشرتی صداقت سے گٹھی ہوئی۔ اپنے ہم عمروں میں اختصار واجمال اور کفایت لفظی کے لئے ان کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں سرے سے داخل ہوتے ہی نہیں، جسے انھوں نے کبھی بھوگا ہی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کھرے پن اور درد کی بنا پر کہتے ہیں، جس کے پل صراط کو طے کیا ہے۔''

نارنگ صاحب نے ان چند لائنوں میں ہی انجم عثمانی کے افسانوں کی خصوصیات کو بڑے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ انجم عثمانی کے افسانوں کی خوبیاں سامنے آگئی ہیں۔ نارنگ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی دریافت کو ہمیشہ ہی پیش نظر رکھتے ہیں، کیونکہ کوئی بھی ادب اپنی تہذیب وثقافت سے بے نیاز ہوکر اچھا ادب ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ ادب کوئی فضا میں تو تحریر ہوتا نہیں اس کی جڑیں معاشرہ اور تہذیب میں پیوست ہوتی ہیں، ہر اچھا تخلیق کار اپنے عہد اور اپنی تہذیب سے متاثر اور اسے اپنی تخلیق میں پیش کرنے والا ہوتا ہے۔ دیکھئے انجم عثمانی کے افسانہ 'ورثہ' پر اظہار خیال کرتے ہوئے نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

''ورثہ- ایک اور معنی خیز کہانی ہے۔ ہر چند کہ اس میں منظر شہر کا اور موقع جشن جمہوریہ کی تیاریوں کا ہے۔ تاہم پس منظر میں وہی جڑوں کا معاشرہ اور اس کی پہچان کا مسئلہ ہے اور درد کی وہی زیریں لہر ہے۔ سیکورٹی والے ڈنڈے ہلا ہلا کر ایک بوڑھے قصباتی سے پوچھ گچھ کررہے ہیں اور وہ بغل میں پوٹلی دبائے گم صم حیراں کھڑا ہے لیکن اپنی پوٹلی حوالے کرنے کو تیار نہیں گویا اس میں خزانہ چھپا ہو۔ مجمع بڑھتا ہے۔ پوٹلی کھینچ کر کھولی جاتی ہے۔ اس میں سوائے چیتھڑوں کے کچھ نہیں۔ آخری چیتھڑے سے گوٹے کی پرانی دھرانی ٹوپی میں لپٹے کچھ ورق گر جاتے ہیں۔ ایک پرانے بغدادی قاعدے کے۔ کہانی کے ختم ہوتے ہی درد کی ایک لکیر کھنچ جاتی ہے، قاعدہ علم کا رمز بھی ہے اور بنیادی ثقافتی یا مذہبی قدر کا بھی کیونکہ قاعدہ ہے تو کتاب ہے، قاعدہ کتاب کا زینہ ہے۔ دوسرے یہ کہ کہانی میں کسی بچہ کا کوئی ذکر نہیں لیکن گوٹے کی پرانی ٹوپی اور بوسیدہ اوراق کا امیج فوری طور پر زندگی اور پیار سے لبریز ایک معصوم بچے کا تصور ذہن میں پیدا کرتا ہے، جو شاید اس دنیا میں نہیں۔ یہ واقعاتی بھی ہوسکتا ہے اور مظہری بھی کہ وہ متاع عزیز یا پیاری قدر اب معدوم ہوچکی ہے اور فقط اس کی نشانی باقی ہے جسے بغل میں چھپا رکھا ہے۔ یہ عمل علمی روایت یا وراثت کے تحفظ کا رمز بھی ہوسکتا ہے کیونکہ خطرات کیسے بھی ہوں، زندگی اپنی پرورش کی امید پر قائم ہے۔ دو تین صفحات کی یہ چھوٹی سی کہانی گہرائی رکھتی ہے اور الگ الگ معنی میں الگ الگ طور پر پڑھی جاسکتی ہے۔''

دیکھئے نارنگ صاحب نے انجم عثمانی کی کہانی 'ورثہ' کا کتنی باریک بینی سے جائزہ لے کر اس کی معنویت اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ایسے ہی انھوں نے

انجم عثمانی کے کئی افسانوں کی معنویت اور ثقافت سے انکی وابستگی کو واضح کیا ہے۔

کتاب میں شامل تمام مضامین پر اظہار خیال کرنے سے تو مضمون بہت ہی طویل ہوسکتا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مضمون پر اظہار خیال نہ کرتے ہوئے تمام مضامین کی فہرست پیش کر دی جائے، تا کہ عناوین کو دیکھ کر ہی نارنگ صاحب کی اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔ افسانہ نگار پریم چند (تکنیک میں Irony کا استعمال)، منٹو کی نئی پڑھت: متین ممتا اور خالی سنسان ٹرین، بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں، چند لمحے بیدی کی ایک کہانی کے ساتھ، بلونت سنگھ کا فن: سائیکی ثقافت اور شکستِ رومان، انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر، اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ: بلراج مین را اور سریندر پرکاش، نیا افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ، نیا افسانہ علامت تمثیل اور کہانی کا جوہر، فکشن کی شعریات اور ساختیات، جدید نظم کی شعریات اور کہانی کا تفاعل، پرانوں کی اہمیت، مثنوی گلزار نسیم کی معنویت، کرشن چندر اور ان کے افسانے، گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب، جابر حسین کی آلوم لاجاوا اور ٹال کی مرنی، ساجد رشید مہانگری زیر ناف اور سماجی ڈسکورس، مدر سے اور مولسری سے لگی کہانی۔ کتاب کا آخری مضمون قرۃ العین حیدر پر ہے اور انگریزی میں ہے، جس کا عنوان ہے Qurratulain Hyder: An Author par Excellence۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ موجودہ دور کے ایک ایسے مایہ ناز دانشور، نقاد اور ماہر لسانیات ہیں، جن پر اردو والے جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نارنگ صاحب پر بہت سے ادبی رسالوں نے خصوصی نمبر نکالے ہیں اور بہت سے نقادوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ عالمی اردو ادب-ایڈیٹر نند کشور وکرم، انشاء-مدیر ف۔س۔اعجاز، انتساب-مدیر سیفی سرونجی، رنگ-مدیر شان بھارتی، کاروان ادب-مدیر کوثر صدیقی، اسباق-مدیر نذیر فتح پوری وغیرہ نے اپنے اپنے رسالوں کے ضخیم گوپی چند نارنگ نمبر شائع کئے ہیں اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، سیفی سرونجی، مولا بخش، عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر حامد علی خاں، شہزاد انجم، اور نذیر فتح پوری وغیرہ نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہ سب نارنگ صاحب کی ہر دلعزیز شخصیت اور علمی وادبی کارناموں کے سبب ممکن ہوا ہے۔ مضامین لکھنے والوں کی فہرست تو اتنی طویل ہے کہ ایک مضمون میں سب کے نام بھی نہیں لکھے جاسکتے۔ مختصراً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ادبی دنیا کا کوئی بھی قابل ذکر نام ایسا نہیں ہے جس نے نارنگ صاحب کے ادبی کارناموں کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اس موقع پر چند مشاہیر کی آراء پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جدیدیت کے بانی اور میر کارواں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''گوپی چند نارنگ صاحب آپ میں ایک اور خوبی ہے جو شاید مجھ میں اور آپ میں مشترک ہے، وہ یہ کہ آپ مطالعہ غیر مشروط ذہن سے کرتے ہیں اور ادب سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ وہ آپ ہی کے معتقدات اور تصورات کی ترجمانی کرے۔ آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادب اپنی جگہ خود ایک سچائی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ یہ سچائی اس فلسفیانہ یا اخلاقی نظام سے ہر جگہ اور ہر طرح ہم آہنگ ہو جسے نقاد خود مانتا اور قبول کرتا ہے، ادب کے ساتھ آپ کا تعلق انتہائی سچا، گہرا، بے لوث لگاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال ہو یا غالب، میر انیس ہوں یا آج کا کوئی نوجوان شاعر آپ ان سب کا مطالعہ یکساں خلوص ویقین کے ساتھ اور ذہن کی یکساں آزادی کے ساتھ کرتے ہیں، وہ نقاد ہی کیا جس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی نہ ہوں اور جس کی شخصیت کے تمام گوشوں میں ادب کی محبت خالصتاً ادب کی خاطر نہ ہو۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی)

''گوپی چند نارنگ حسن وعشق، جمال وشباب کے ہر عمل کو تہذیب کے مظاہر مانتے ہوئے اس میں ارضیت، مقامیت، ثقافت اور زندگی کی معنویت تلاش کر لیتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب تصور واضح ہو، نقطہ نظر صاف اور نظر گہری اور زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت ہو فکر کا ارتباط، تسلسل بیان اور معیاتی نظام پر حرف نہ آنے پائے۔ نارنگ ایک نہایت کڑھے اور سجے ہوئے انداز میں اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں کہ فکر ومعنی خوشبو کی طرح رچتے بستے چلے جاتے ہیں۔''

(پروفیسر علی احمد فاطمی)

''پروفیسر گوپی چند نارنگ دنیائے ادب کے ایک ایسے بے تاج بادشاہ ہیں کہ شہرت عزت ان کے پیچھے بھاگتی ہیں، ان کا ہر قدم، ہر ایک پل اردو زبان وادب کے لئے وقف ہے، ان کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلتا ہے، وہ اردو سے متعلق ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو زبان وادب کو جو کچھ دیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک دفتر درکار ہے، ان کی انہیں خدمات کو دیکھتے ہوئے درجنوں ایوارڈس سے انہیں نوازا جاچکا ہے، اس کی فہرست بھی طویل ہے۔ جہاں جہاں اردو پڑھی اور بولی جاتی ہے وہاں وہاں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے، ان کی تحریر اور تقریر کا جادو یکساں اثر کرتا ہے۔ صحیح معنوں میں وہ اردو والوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔''

(سیفی سرونجی)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنا کسی ایک مضمون میں تو کیا کسی ایک کتاب میں بھی ان کے ادبی کارناموں کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر رسالوں کے خصوصی نمبروں کے لئے علاوہ کئی کتابیں بھی لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ادبی کارناموں کے شایان شان ان پر لکھے جانے کا حق ادا نہیں ہوسکا۔ نارنگ صاحب کے خون ہی نہیں بلکہ ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں اردو کی محبت سمائی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے ایسے ایسے ادبی کارنامے انجام دئے ہیں کہ جس کی مثال پیش کرنے سے ادبی دنیا قاصر ہے۔

اردو کے دس افسانچے

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
(میرٹھ، بھارت)

ڈاکٹر عظیم راہی کی کتاب ''اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ'' کے اشاعت کے بعد افسانچہ نگاری کے فروغ کے بہت سے در، وا ہوئے۔ افسانچے کی تنقید کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی۔ افسانچے کے فروغ کے لیے تنظیموں کا قیام بھی عمل میں آیا۔

اسی سلسلے کو دراز کرتے ہوئے میں نے کوشش کی ہے کہ سعادت حسن منٹو سے موجودہ عہد کے دس افسانچوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کروں۔ افسانچوں کا انتخاب کسی خاص وجہ سے نہیں ہے بلکہ سہولت، دستیابی اور میری اپنی ذاتی پسند ہے۔

رعایت

''میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔''

''چلو اسی کی مان لو.....کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔''

تقریباً دو سطر (سیاہ حاشیے میں چار سطروں میں ہے) کا یہ افسانچہ قاری کو اندر تک دہلا دیتا ہے۔ ایک جوان بیٹی کے باپ کو رعایت دی جارہی ہے۔ یہاں ظالم موجود نہیں، ظلم موجود ہے۔ ظلم کا نیا طریقہ کار موجود ہے۔ منٹو نے فساد کے کسی ہولناک، منظر کا بیان نہیں کیا ہے۔ لیکن ظلم کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی لہریں خود بخود الفاظ سے قاری کے ذہن و دل تک کا سفر طے کر لیتی ہیں۔ یہاں منٹو کی رعایتِ لفظی، فنی چابکدستی، موضوع پر گرفت، عنوان کی برجستگی وغیرہ نے مل کر ایک ایسا فن پارہ گھڑا ہے کہ منٹو کے قلم کے جادو کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لفظوں میں سادگی ہے، سلاست ہے، کوئی سنسنی خیزی نہیں، کوئی فحاشی نہیں، ظلم و زیادتی کے ڈھول نہیں اور نہ ہی قاری کو دہشت زدہ کرنا مقصود ہے۔

ایک اور افسانچے پر نظر ڈالیں:

سوری

''چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔

آزار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتہً کلمۂ تاسف نکلا:

''چ.....چ.....چ.....چ.....مشٹیک ہو گیا۔''

اس افسانچے میں منٹو کا فن عروج پر ہے۔ فساد کے ماحول میں اپنے فرقوں کا تحفظ اور غیر فرقے پر منصوبہ بند حملہ عام بات ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی شناخت مذہب کے اعتبار سے کی جانے لگتی ہے۔ اس افسانچے میں منٹو نے سفاک حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ قتل کے بعد کا افسوس، افسانچے کا ڈرامائی موڑ ہے۔ منٹو نے اس افسانچے میں بہت ہی کم الفاظ میں پوری شدومد کے ساتھ اپنی بات کی ترسیل کی ہے۔ پورے افسانچے میں بس ایک واقعہ ہی درج ہے۔ لیکن یہ واقعہ اپنے اختتام پر قاری کے اندر سرایت کر جاتا ہے اور اپنے ساتھ ان کہے اور نا تحریر کردہ (Unsaid and unwritten) سینکڑوں واقعات جمع کر لیتا ہے۔ قاری مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے بہت دیر تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا؟ افسوس کس کو ہو رہا ہے؟ کس بات کا افسوس؟ کون سی غلطی ہو گئی۔ مشٹیک لفظ قاری کو لمحاتی طور پر خالی الذہن کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب قاری خود کو سنبھالتا ہے تو سوچتا ہے کہ منٹو نے لوہے کی گرم سلاخ اس کے ذہن کے پار کر دی ہے۔ قاتل کا چ چ چ چ.....کرنا منظر کو ایسا زندہ کرتا ہے کہ گویا قاری کے سامنے یہ قتل ہوا ہو۔ قاری افسانچے کے سحر میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کے بعد اس صنف کو استحکام و استناد عطا کرنے والے جوگندر پال ہیں بلکہ نام افسانچہ بھی جوگندر پال کا ہی دیا ہوا ہے۔ جوگندر پال اردو کے کہنہ مشق ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے افسانچے کو اپنی کاوشوں سے مضبوط بنیادیں عطا کیں۔ جوگندر پال جب ادب میں داخل ہوئے تو نئی روشنی سے معمور تھے۔ انگریزی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے غیر ممالک خصوصاً جنوبی افریقہ میں خاصا وقت گذارا۔ ان کے افسانے، ناول اور افسانچے ان کی بالیدہ نظر، نئی فکر اور فن پر مضبوط دسترس کے غماز ہیں۔ جوگندر پال نے افسانچے کو نہ صرف نام دیا بلکہ متعدد تجربات کرتے ہوئے افسانچے کو استحکام بھی بخشا۔ انہوں نے ''نہیں رحمٰن بابو'' کے عنوان سے سینکڑوں افسانچے قلم بند کیے۔ انہیں اردو افسانچے کا سعادت حسن منٹو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے دو افسانچے ملاحظہ کریں:

کچا پن

''بابا، تم بڑے بیٹھے ہو''

''یہی تو میری مشکل ہے بیٹا۔ ابھی ذرا کچا اور کھٹا ہوتا تو جھاڑ سے جڑا رہتا''

یہ دو سطر کا افسانچہ اپنے اندر مکمل کہانی لیے ہوئے ہے۔ یہ علامتی افسانچہ ہے۔ بیٹھا ہونا، کئی طرف اشارے کر رہا ہے۔ یعنی پھل بہت بیٹھا ہے اور جب کوئی پھل زیادہ بیٹھا ہوتا ہے تو وہ یا تو خود بخود ٹوٹ کر شاخ سے الگ ہو جاتا ہے یا پھر زمانے کے ذریعہ توڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچے اور کھٹے پھل مضبوطی سے پیڑ سے جڑے ہوتے ہیں۔ اسے نہ صرف پیڑ کے اندرون سے غذا حاصل ہوتی رہتی ہے بلکہ پیڑ کے مالک اور محافظ اس کی خاطر مدارت بھی کرتے رہے ہیں۔ اس کا ہر طرح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی معاملہ بزرگوں کا بھی ہے۔ آج کل اولادیں اپنے والدین کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔ پورا افسانچہ سماج پر ایک گہرا طنز ہے۔

بے درد

''آخر اس کا درد تھم گیا،

اور درد تھمتے ہی اسے چین آ گیا،
لیکن نہ تھمتا تو بے چارہ مرنے سے بچ جاتا۔''

'بے درد' نام کا یہ افسانچہ جوگندر پال کے عمیق ذہن کی فکری غوطہ زنی ہے۔ افسانچے میں کون بے درد ہے۔ بے درد یعنی ظالم، وہ جس نے اس کے درد کا علاج کر دیا۔ یعنی اسے مار ڈالا، لیکن بظاہر تو وہ اس کا ہمدرد ہے کہ اس سے اس کا درد، دیکھا نہ گیا اور اس نے اسے مار کر ہمیشہ کے لیے درد سے نجات دلا دی۔ قاری یہ طے نہیں کر پاتا ہے کہ اسے درد سے نجات دینے والا اس کا ہمدرد ہے یا بے درد۔ اس میں ایک پہلو اور ہے۔ بے درد، یعنی ایسا شخص جس کے پاس درد نہ ہو۔ یعنی وہ صاحب درد، اب بے درد ہو گیا۔ اسے ہمیشگی کا سکون عطا ہو گیا ہے۔ آپ کسی ایسے مریض کا تصور کریں جو بری طرح زخمی ہو، جس کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں۔ دوا کا اثر نہ ہو رہا ہو اور اس کی یہ حالت، طوالت اختیار کر گئی ہو۔ پھر کیا ہوتا ہے۔ پھر ہر کوئی اس کے دکھ درد کو دیکھ کر اس کی موت کی تمنا کرتا ہے۔ بے درد ایسے ہی کسی مریض کی حالت کا بہترین ترجمان ہے۔

افسانچے کے فروغ میں جوگندر پال کے ہم عصر افسانہ نگار رتن سنگھ کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ انہوں نے افسانچے کو ایک نیا انداز دیا۔ انہوں نے افسانچوں کے عنوانات قائم نہیں کیے۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ مانک موتی، کے نام سے منظر عام پر آیا اور مجموعے میں عنوان کے بجائے نمبر شمار سے افسانچے درج ہیں۔ ابھی حال ہی میں پنجابی میں ان کے افسانچوں کے مجموعے ''کن من کلیاں'' نے شائع ہو کر خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن رتن سنگھ اپنے اس نظریے پر آج بھی قائم ہیں کہ طوالت یا اختصار کے سبب کہانیوں کو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ ان کا ایک مانک موتی ملاحظہ کریں۔

مانک موتی (۳۶)

''ہنستے ناچتے خوشیاں مناتے ایک ہجوم کو قریب آتا دیکھ کر ایک بھکارن نے اپنے تین چار سال کے بچے کو جلدی سے گود میں اٹھا لیا اور ایسی آڑ میں لے گئی جہاں سے بچہ ان رنگ رلیاں منانے والوں کو نہ دیکھ سکے۔ نا بابا نا، وہ بڑبڑاتے جا رہی تھی۔
''میرے ننگے بھوکے بچے نے اگر ہنسنا سیکھ لیا تو کل کو اسے بھیک کون دے گا۔''

رتن سنگھ کا یہ افسانچہ نفسیاتی افسانچہ ہے۔ نفسیات کے ساتھ ساتھ معاشیات کا بھی دخل افسانچے کو نیا رخ عطا کرتا ہے۔ ایک غریب بھکارن کا سہارا اس کا گود کا بچہ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر لوگ عورت کو جلدی بھیک دے دیتے ہیں اور اگر بچہ روتا دھوتا ہو، بیمار ہو، ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہوں تو زیادہ بھیک ملتی ہے۔ عورت کی اس نفسیات کا افسانچہ عمدگی سے ترجمانی کرتا ہے۔ افسانچہ قاری کو متحیر کر دیتا ہے۔ قاری کبھی عورت پر رحم کھاتا ہے تو کبھی اسے، اس بچے کی زندگی پر رحم آتا ہے اور اسی طرح قاری بہت دیر تک دونوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔

بشیر مالیر کوٹلوی نے افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے کی بھی خدمت کی ہے اور اپنی منفرد پہچان قائم کی ہے۔ وہ افسانچے میں نپے تلے جملے مرکزی کردار سے وابستہ، قصہ پن، مقصدیت کو اپنے مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی یہ صفت ان کے افسانچوں کو تیز دھاری تلوار جیسا بنا دیتی ہے۔ ان کا ایک افسانچہ ''صلیب سے بڑھ کر'' ملاحظہ کریں:

صلیب سے بڑھ کر

''وہ مسیحا تو نہ تھا مگر دین دکھیوں کا سچا خدمت گار تھا۔ اس کو خدمت خلق کے جرم کی سزا، ابن مریم سے کہیں زیادہ ملی تھی۔
اس غیر ملکی فرشتہ خصلت انسان پر پٹرول ڈال کر جب آگ لگائی گئی تو جیپ کے اندر اس نے اپنے دونوں بچوں کو جلتے ہوئے دیکھنے کا کرب بھی جھیلا تھا۔''

بشیر مالیر کوٹلوی نے فنی مہارت سے افسانچے میں پوری داستان کو سمو دیا ہے۔ ایک ایسی درد بھری داستان جس میں سب کچھ موجود ہے۔ ایک خاندان، خاندان کا کھیا، اس کے دو بچے، اس کی پوری زندگی، ایمانداری اور دوسروں کی خدمت کی گواہ۔ نیک، شریف، ہر وقت دوسرے کے کام آنے والا شخص.... غیر ملکی سرزمین پر خدمتِ خلق کرنے والا ایک شریف النفس شخص، لیکن اسے اس کی شرافت کا انعام یہ ملا کہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے دو معصوم بچوں کو بھی زندہ جلایا گیا اور یہ حرکت کس نے کی، محافظ دستے (افسانچے میں لفظ 'جیپ' استعمال ہوا ہے) نے، جس پر حفاظت کا ذمہ ہوتا ہے وہی درندہ بن گیا۔ بشیر مالیر کوٹلوی نے مناسب ترین لفظوں میں ایک دردناک کہانی کو افسانچے کے قالب میں ڈھالنے کا لائق تحسین کام کیا ہے۔

اردو میں ڈاکٹر ایم اے حق واحد ایسے تخلیق کار ہیں جو افسانچہ نگاری کی بنیاد پر ہی مشہور ہیں۔ ایم اے حق صرف اور صرف افسانچہ نگار ہیں۔ شاید وہ اس طرح کے واحد افسانچہ نگار ہیں۔ ورنہ زیادہ تر افسانہ نگار ہی افسانچہ نگار ہیں۔ ایم اے حق نے افسانچہ نگاری میں واقعی اپنی مہارت کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ ان کا افسانچوں کا پہلا مجموعہ ''نئی صبح'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب انہوں نے ''موج ادب'' سہ ماہی کے ذریعہ بھی افسانچوں کی اشاعت میں خاصی محنت کی ہے اور رسالے میں افسانچے مسلسل شائع کر رہے ہیں۔ ان کا ایک افسانچہ ملاحظہ کریں:

مجرم

''میری بیٹی ٹرین کے باتھ روم سے واپس آتے ہی بولی
''پاپا آپ ابھی تک غلط ہندی لکھتے ہیں۔'' اور میں دوہری شرم سے گڑ گیا

دو سطروں میں ایک پوری کہانی از شروع تا آخر انگڑائی لے رہی ہے۔ چھوٹی سی کہانی اپنے اندر کتنے Dimension رکھتی ہے۔ افسانچہ نگار نے ٹرین کے باتھ روم کی دیواروں پر فحش جملے لکھنے اور تصاویر بنانے والوں کو بے

نقاب کیا ہے۔ہم سب کا آئے دن ایسے جملوں اور تصاویر سے واسطہ پڑتا ہے لیکن ہم اس کے تدارک کے لیے کچھ نہیں کر پاتے سوائے اس کے کہ لکھنے والوں کو کبھی زبان سے کبھی دل کے اندر دو چار صلواتیں سنا کر خود کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔مگر ''مجرم'' افسانچہ ایسے حضرات کو ایسی شرم دلاتا ہے کہ اگر واقعی ان کے اندر کچھ رواداری، اقدار اور شرم باقی ہو تو انہیں ڈوب مرنا چاہیے۔لفظ ''دوہری'' افسانچے کے اثر کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

افسانچے کی روایت کو استحکام بخشنے والوں میں اورنگ آباد کے عارف خورشید کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔عارف خورشید کے افسانچوں کا مجموعہ ''یادوں کے سائے'' ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ان کی باریک بیں نگاہ افسانچے میں نئے تیور پیدا کرتی ہے۔وہ عورت مرد کے مابین رشتوں کو بڑی فن کاری سے افسانچے میں پیش کرتے ہیں:

سوالیہ نشان

''جنت میں غلطی کی سزا.....دنیا
''دنیا میں غلطی کی سزا.....؟
شوہر دبئی میں خود ہندوستان میں،
دونوں اپنی اپنی آگ میں''

سوالیہ نشان قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتے ہوئے بے شمار سوال داغ دیتا ہے۔قاری کا ذہن سوالات کے گھیرے میں آجاتا ہے۔افسانچہ اپنے آپ میں پورے ناول کی کہانی سموئے ہوئے ہے۔جنت سے آدم کے نکالے جانے کے واقعے سے موجودہ عہد کے سلگتے ہوئے روزگار اور جنسی مسائل کو فنی کاوش سے قصے میں پرو دیتا ہے۔افسانچے میں مرد کی دنیا بھی آباد ہے اور عورت کا جہاں بھی۔دونوں ایک دوسرے کی فرقت کا شکار بھی ہیں اور اپنی اپنی دنیاؤں میں خوش بھی۔ہر دو طرف اپنی اپنی آگ سلامت ہے۔یہ آج کے دور کے نفسانفسی کے ماحول کی خوبصورت عکاسی ہے۔

عظیم راہی نے افسانچہ نگاری کے دو طرفہ فروغ میں تعاون دیا ہے۔انہوں نے نہ صرف عمدہ افسانچہ نگاری کی ہے بلکہ انہوں نے افسانچہ نگاری کی تنقیدی روایت کو بھی بنیاد فراہم کرنے کا اہم کام کیا ہے۔انہوں نے اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ کتاب لکھ کر افسانچہ نگاری کی تنقید میں میل کا پتھر ثبت کیا ہے۔ان کی یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد افسانچہ نگاری کی مقبولیت میں روز افزوں فروغ حاصل ہوا ہے۔افسانچہ لکھنے، افسانچے پر تنقید اور افسانچے کے فروغ کے لیے عملی کاوشوں کو ایک نئی سمت ملی ہے۔عظیم راہی کا ایک افسانچہ ملاحظہ ہو:

چلن

''وہ شخص، جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی
معجزاتی طور پر.....میرے بچ جانے پر.....
مبارک باد دینے والوں میں وہی سب سے آگے تھا۔''

عظیم راہی نے ''چلن'' میں سماج کے منافقانہ رویے کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔یہ افسانچہ سفید کالر اور سیاہ دل لوگوں، ڈھونگی مذہبی رہنماؤں، دوغلی شخصیت کے مالک افراد کی زندگی پر کاری ضرب ہے۔آج زمانہ اس طرح کا ہو گیا ہے۔سیاسی لوگ پہلے کسی کیس میں پھنساتے ہیں اور بعد میں ہمدردی جتانے پہنچ جاتے ہیں۔

نذیر فتح پوری اردو کے زود نویس ادیب و شاعر ہیں۔انہوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔افسانچہ نگاری میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''ریزہ ریزہ دل'' بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ان کا ایک افسانچہ ملاحظہ کریں:

ترقی

''آدمی نے کمپیوٹر بنایا اور کمپیوٹر بننے کے بعد آدمی خود بگڑ گیا۔
کمپیوٹر کی خرابی آدمی دور کر سکتا ہے۔
لیکن آدمی کے بگاڑ کا علاج؟؟؟

افسانچہ 'ترقی' موجودہ عہد کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے۔آج کا عہد IT کا عہد ہے۔اس IT کے عہد میں ہر طرف کمپیوٹر ہی کمپیوٹر ہے۔ہر کام کمپیوٹر کر رہا ہے۔Internet نے آج انسان کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرادی ہیں۔آج انسان کے پاس رشتوں ناطوں کے لیے وقت نہیں ہے۔وہ کمپیوٹر کی طرح اسکرین اور ماؤس ہو گیا ہے۔انسان میں آنے والے اس بگاڑ کا کیا علاج ہے۔ Porn sites, social sites نے واقعی آج کے انسان کو کردار کی سطح پر خاصا بگاڑ دیا ہے۔انسان کے اندر ایسی خرابی پیدا ہو چکی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔یہ انسانی ترقی ہے یا؟ افسانچہ ایک سوالیہ نشان چھوڑ کر قاری کو بے چین کر جاتا ہے۔

میں نے یہاں چند افسانچوں کے تجزیے اپنے طور پر کیے ہیں۔آج افسانچہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن یہاں مقصد فہرست سازی نہیں ہے۔سینکڑوں افسانچہ نگار آج مستعدی سے افسانچے لکھ رہے ہیں۔پچاس سے زائد افسانچوں کے مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔یہاں میں نے اپنی پسند سے چند افسانچے پیش کیے ہیں۔ان افسانچوں کے انتخاب میں، میں نے ایک خاص خیال رکھا ہے۔کہ یہ سب کے سب دو تین یا چار سطروں کے افسانچے ہیں اور سب کے سب اپنے اندر طویل کہانی کا لاوا لیے ہوئے قطرے میں سمندر کی مثال ہیں۔افسانچہ اسی طرح اپنے قارئین کو موضوع کے تیکھے پن، اختصار، زبان کی چابکدستی اور غیر متوقع اختتام سے سحر زدہ کر دیتا ہے۔لیکن اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ ان سے کچھ طویل یا دو تین صفحات کے افسانچے یہ کام بخوبی نہیں کر پاتے ہیں۔وقت کی کمی کے باعث میں نے قدرے مختصر افسانچے اپنے مطالعے میں شامل کیے ہیں بعد میں ہر طرح کی افسانچے کا مطالعہ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

''نئے آسماں کی تلاش میں''

پروفیسر قیصر نجفی
(کراچی)

گزشتہ دنوں مراق مرزا صاحب نے ممبئی سے اپنے پہلے مجموعہ غزلیات ''نئے آسماں کی تلاش'' کا مسودہ بھیجا اور اس پر اظہار رائے کرنے کا کہا۔ انہوں نے مراسلے میں جس نوع کے برادرانہ اخلاص و محبت سے سرشار کلمات تحریر کیے وہ پڑھنے کے بعد (گوناگوں مصروفیات کے باوصف) ہمارے پاس سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ قبل ازیں مراق مرزا ہم سے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف تھے، ان کے فلمی رائٹر ہونے کی بھنک بھی کانوں میں پڑ چکی تھی، لیکن مجموعہ غزلیات نے شاعری کا ہفت خواں طے کرنے کی نوید دی ہے۔ ہم ''نئے آسماں کی تلاش'' کو ادبی آفاق پر مراق مرزا کے بحیثیت غزل گو طلوع کا اعلامیہ تصوّر کرتے ہیں۔

ہم غزل کو ایک دستار فضیلت گردانتے ہیں۔ کسی شاعر کے سر بندھ جائے تو Hats off کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ایک کافر صنف سخن ہے اور پختگی ایمان فن سے مسخر ہوتی ہے، اس آسوئے رم خوردہ کو رام کرنے والے یقیناً سحر کرتے ہیں، اعجاز کرتے ہیں:

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

ہم مراق مرزا کو ان غزل گو شعراء میں شمار کرتے ہیں، جنہوں نے غزل کے طاقچوں میں اس سلیقے سے تجدد کی شمعیں جلائی ہیں کہ نہ تو وہ منحرفین روایت قرار پائے ہیں اور نہ ہی تجرید و ابہام کے مرتکب گردانے گئے ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ وہ روایت سے متصادم نہیں ہوئے۔ ان کا مطمع نظر ہمیشہ عصری شعری تقاضوں کے مطابق غزل کو نوک پلک سے درست رکھتا رہا ہے۔ انہوں نے اس صنف لطیف کے فروغ حسن میں جس قبیل کے غازۂ فن سے کام لیا ہے، وہ شعر و ادب کے جدید جمالیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اردو غزل کو فکر و نظر کے نئے نئے سانچوں میں ڈھالنے کا باقاعدہ آغاز مرزا غالبؔ نے کیا۔ ہر چند غالبؔ نے زرخیزیٔ ذہن، تنوع افکار، وسعت تجربہ، اعماق مشاہدہ اور حدت طرازی کے تناظر میں ظرف تنگنائے غزل کو بقدر شوق نہ پایا:

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

تاہم جذبہ و خیال سے لے کر زبان و بیان تک جدّت کے جو چراغ غالبؔ نے غزل کی منڈیروں پر جلائے ان کی روشنی ہر دور کی غزلیہ شاعری کے نہاں خانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میر تقی میرؔ کے بعد غزل کو اگر غالبؔ ایسے یگانۂ روزگار کے شجر فن کا سایہ نصیب نہ ہوتا اور ان کی جدّت آفرینوں کی پناہ گاہیں میسر نہ آتیں تو غزل ایک قصّہ پارینہ بن کر رہ جاتی۔ غالبؔ نے غزل کو نہ صرف فنی طور پر زندہ رکھا بلکہ اسے سماجی و معاشرتی شعور، انسانی نفسیات اور فلسفہ کے مضامین کی قوت لایموت بھی فراہم کی۔

تسلیم کہ ''غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور'' لیکن غالبؔ کے بعد بھی سخنوروں کی ایک کھیپ نظر آتی ہے، جو اپنے اپنے زمانے میں غزل کے نو بہ نو رنگ و آہنگ سے متعارف کراتے رہے۔ فی زمانہ بھی شیفتگانِ غزل گیسوئے غزل سنوارنے اور اسے نیا روپ بخشنے میں مصروف ہیں۔ ان شیفتگانِ غزل میں مراق مرزا بھی شامل ہیں۔ جن کا مجموعہ غزلیات ''نئے آسماں کی تلاش میں'' آج ہمارے پیش نظر ہے۔ مراق مرزا کا یہ اوّلین شعری مجموعہ ہے جو ہمارے نزدیک ان کے شعری مستقبل کا ایک وعدہ بھی ہے، جسے وفا کرنے کے تیور مجموعے کے نام ہی سے ہویدا ہیں۔

''نئے آسماں کی تلاش میں'' بالاعلان یہ شہادت دیتا ہے کہ غزل کے نئے نئے آفاق کی تلاش و جستجو مراق مرزا کا شعری نصب العین ہے۔ ہم مجموعے کے نام کو مراق مرزا کے طائرِ غزل کے سفر کا استعارہ قرار دیتے ہیں، جس میں وہ شعر و شعور کی نئی نئی بلندیوں کی کھوج میں محوِ پرواز ہے اور دنیائے شعر کو اپنے پروں میں سمیٹ لینے کا متمنی ہے۔ کیا یہ طائر کبھی یہ کہہ سکے گا؟

صحرا است کہ دریا است
تہ بال و پر ما است

آیئے! اس اوج فکر و فن کی امکانی صورت کا مجموعہ کے تجزیاتی مطالعے سے اندازہ لگاتے ہیں۔ مراق مرزا عصری آگہی کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے عہد میں اور ان کا عہد ان میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے ارد گرد کی زندگی کا مکمل شعور حاصل ہے۔ بلکہ وہ اپنی باطنی بینائی سے ہر پیش منظر کا پس منظر بھی دیکھ لیتے ہیں اور جب خارج کا کوئی داخلی رخ شعر میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتا ہے تو پردۂ احساس پر کلبلاتی زندگی کی کسی نہ کسی تلخ حقیقت میں مشکل نظر آتا ہے۔ غزل میں احساس و شعور کی یکجائی کا مظاہرہ جو مراق مرزا نے کیا ہے، وہ خال خال دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمارے نزدیک عصری زندگی جس عبرت آموز کسمپرسی کی کیفیت سے دوچار ہے اس کی عکاسی مراق مرزا کا شعری خصوص ہے۔

کس طرح اس عہد میں ہم امن کی کوشش کریں
جس طرف دیکھیں لہو ہے، آگ ہے، بارود ہے
کس سے جا کر پوچھئے کیوں کر ہمارے واسطے
زندگی کا آج بھی ہر راستہ مسدود ہے

یہ نہیں کہ لوگ سرخ آندھی میں بے گھر ہو گئے
خون آلودہ سبھی بستی کے منظر ہو گئے

ان اجلے اجلے لوگوں سے بھی رہیئے ہوشیار
شامل گروہ رہزناں بھی رہبروں میں ہے

آئے دن انسانی زندگی کے کینوس پر انتشار و بدامنی اور قتل و غارت گری کا جو خوں ناب منظر مصوّر رہوتا ہے اسے دیکھنے کا کسے یارا ہے۔ اس سے آنکھیں زخمی اور دل لخت لخت ہیں۔ نتیجتاً عالمی سطح پر جس نوع کی یاس انگیز فضا قائم ہو چکی ہے اس نے بڑے بڑوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ البتہ یاس و نومیدی کی اس فضا کو بعض جدید غزل گو شعراء نے ذہن پر سوار نہیں کیا۔ مراق مرزا ایسے ہی شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کی غزل گوئی کا نمایاں وصف رجائیت پسندی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں نہ صرف عزم و حوصلہ کے جذبات کو انگیخت کیا ہے بلکہ تلخ سے تلخ حقائق زندگی کے حوالے سے بھی مثبت طرز فکر اپنانے کی تحریک دی ہے:

سفر ہے دھوپ کا پھر بھی مراقؔ چلتے رہو
کہ ہے سکوں ہی سکوں مشکلات سے آگے

میں ہوں عقاب بلندی سے میرا رشتہ ہے
مری اُڑان ہے اس کائنات سے آگے

رہ حیات میں آئیں گے پل صراط بہت
جو مرد ہیں وہ ہر اک امتحاں سے گزریں گے

ختم ہونے کو یہ ظلمت کا سفر ہے شاید
چند گام اور کہ پھر چاند نگر ہے شاید

جنہیں اے دوستو! جانا ہو پار سورج کے
وہ لوگ دم کہاں لیتے ہیں سائبانوں میں

اردو غزل اور تصوّف لازم و ملزوم تو نہیں ہیں لیکن غزل روایتی ہو یا جدید متصوفانہ فکر اس میں کہیں نہ کہیں جھانکتی ہوئی ضرور نظر آتی ہے۔ میر تقی میرؔ صوفی شاعر نہیں تھے، مگر ان کے ہاں بھی بعض اشعار تصوّف کے رنگ میں رنگے ہوئے ملتے ہیں:

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
ورنہ میں وہی خلوتی راز نہاں ہوں

خواجہ میر دردؔ کی اساس غزل تو ساری کی ساری تصوف پر رکھی ہے:

پھولے گا اس زبان میں گلزار معرفت
یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

دردؔ کی پیش بینی قابل داد ہے۔ ان کا گلزار معرفت اس شان سے پھولا پھلا کہ مرزا غالبؔ جیسے روایت شکن کی غزل بھی کہیں کہیں صوفیانہ فکر سے ہم آغوش نظر آتی ہے۔ بلکہ تصوف پر مبنی اپنے اشعار کے حوالے سے وہ تعلّی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لہٰذا ہمارے لیے قطعاً یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ اکیسویں صدی کے غزل گو شاعر مراق مرزا کے یہاں بھی صوفیانہ فکر بکل مارے بیٹھی ہے۔ ان کے بعض اشعار متصوفانہ افکار کی روشنیاں کنج قلب اور گوشۂ جاں میں بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اشعار مراق مرزا کی روحانی ریاضت کی چغلی کھاتے ہیں۔ ہمیں ان کے یہاں حقیقت ازلی و ابدی کی تلاش و جستجو کی ایک لاشعوری کاوش کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے جس سلیقۂ فن سے اثبات ذات خدا کے حوالے سے دلیل و استدلال سے کام لیا ہے وہ سراہے جانے کے لائق ہے:

جو ظاہر ہے وہی پردے کے پیچھے
نہاں ہے جو وہی ہر سو عیاں ہے

وہ بے نشاں ہے مگر دل کی آنکھ سے دیکھو
اسی کا جلوہ ہر اک شے میں ہر نشاں میں ہے

کہیں قلب و ذہن کے دشت میں جو اک آگہی کا چراغ ہے
وہ نجانے کب سے ہے کائنات کے پاسباں کی تلاش میں

اس عیاں نہاں سے پرے کہیں کسی بے نشاں کا وجود ہے
ہیں مکین سارے مکان کے کسی لامکاں کی تلاش میں

آخر میں یہ اعتراف از بس ضروری ہے کہ ہمیں مراق مرزا کے طائر غزل کے اس اوج فکر و فن کی امکانی صورت کی واضح علامات نظر آئی ہیں جن کا اندازہ ہم ''نئے آسماں کی تلاش میں'' کے تجزیاتی مطالعہ کے ذریعے لگانا چاہتے تھے۔ لاریب! مراق مرزا کی غزل اگر ریاضت فن کی بھٹی کے شعلوں سے اسی طرح بغل گیر رہی تو یقیناً ایک دن کندن بن جائے گی اور اس اوج تک رسا ہو گی جہاں پر ان کا طائر غزل کسی تردّد کے بغیر کہہ سکے گا:

صحرا است کہ دریا است
تہ بال و پر ما است

☆

''خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے''

یعقوب نظامی

(بریڈفورڈ۔برطانیہ)

محمد اقبال بھٹی برمنگھم میں رہتے ہیں اور فرصت کے لمحات میں شاعری کرتے ہیں۔کسرتی جسم،کلین شیو،کرتا شلوار میں ملبوس بھٹی صاحب ایک رعب دار شخصیت ہیں۔یہ تاثر اُس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک آپ قدرے قریب ہوکر اِن کے ساتھ کچھ وقت نہیں گزارتے۔جوں جوں وقت گزرتا ہے بھٹی صاحب کی شخصیت پرت در پرت کھلنے لگتی ہے۔اِن کا رعب آہستہ آہستہ کم ہوکر دوستی کی شکل میں اِس طرح گھل مل جاتا ہے جس طرح شکر دودھ میں مل کر ایک ایسی مٹھاس پیدا کرتی ہے جس کے پینے سے سرور محسوس ہوتا ہے۔بھٹی صاحب مہمان نواز ہیں۔خوش قسمتی سے انہیں شریک حیات ایسی ملیں جو مہمان نوازی میں ان سے دو قدم آگے ہیں۔اگر کسی کو عملی لحاظ سے مہمانوں پر جان نثار کرتے دیکھنا ہو تو بھٹی صاحب کے ہاں جایئے۔وہاں آپ کو پیار و محبت اور مشرقی مہمان نوازی کے مظاہرے اپنی پوری آن بان سے نظر آئیں گے۔

میں بھٹی صاحب سے پہلی بار محترمی محمود ہاشمی کے گھر ملا تو مجھے یہ ایک ایسے سیدھے سادے دیہاتی گھبرو جوان نظر آئے جن کا سارا اثاثہ خلوص، محبت اور پیار ہوتا ہے۔لکھنے پڑھنے سے مجھے ان میں دور دور تک کوئی نشان نظر نہ آیا۔لیکن میری سوچ اُس وقت خوشگوار حیرت میں بدلی جب مجھے بتایا گیا کہ موصوف اردو اور پنجابی کے خوبصورت شاعر ہیں۔اب میں نے بھٹی صاحب کا بغور جائزہ لیا تو مجھے اِن کے ماتھے پر وہ نشان نظر آیا جو انتہائی پرہیزگار متقی اور نمازی لوگوں کے ماتھے پر ہوتا ہے۔میں سوچنے لگا موصوف بغیر داڑھی کے خفیہ مولوی تو ہو سکتے ہیں شاعر ہرگز نہیں۔لیکن جب بھٹی صاحب نے اپنی تازہ غزل سنانی شروع کی تو میں حیرت میں ڈوب کر اُن کا منہ دیکھنے لگا۔غزل تھی:

نزاکت غضب کی ، ادائیں نرالی
جوانی کا عالم سماں توبہ توبہ
نگاہوں سے مستی کا ساغر چھلکتا
نظر ہے کہ آتش فشاں توبہ توبہ
گلابی یہ رنگت یہ ہونٹوں پہ لالی
ذقن پر یہ تل کا نشاں توبہ توبہ
اچانک جو واعظ نے اِن پر نظر کی
گیا بھول سارا بیاں توبہ توبہ

غزل سنی تو میں بھی توبہ توبہ کرنے لگا۔مجھے اس کھردرے انسان کے اندر ایک نرم و نازک دل دھڑکتا دکھائی دیا۔میں سوچنے لگا کہ یہ ضروری تو نہیں کہ نمازی اور درویشوں کے دل حسیناؤں کی اداؤں پر نہیں دھڑکتے۔اِن کے دل بعض اوقات مجھ جیسوں سے زیادہ تیز رفتاری سے دھڑکتے بلکہ پھڑکتے ہیں۔

پہلی اور دوسری ملاقات کے درمیان میں اقبال بھٹی کو رومانی شاعر قرار دیتا رہا۔پھر کچھ عرصہ بعد ان کی شاعری کا مجموعہ ''اک بھول ہوئی نادانی میں'' منظر عام پر آیا جس کا ایک نسخہ کمال مہربانی سے اُنہوں نے مجھے بھی عنایت کیا۔میں نے اس کا مطالعہ کیا تو مجھے اقبال بھٹی رومانی شاعر کی بجائے وطن سے محبت کرنے والے شاعر معلوم ہوئے۔میری نظریں انکی نظم ''پاکستان کی فریاد'' پر جا کر رک گئیں۔جس میں بھٹی صاحب پاکستان کی فریاد شاعری کے قالب میں یوں ڈھالتے ہیں:

آج دنیا میں اتنا میں بے حال ہوں
اپنے بیٹوں کے ہاتھوں ہی پامال ہوں
میرے لخت جگر میرے قاتل بنے
کیسے انصاف ہو کون عادل بنے
مجھ کو لوٹا گیا مجھ کو نوچا گیا
ذات اپنی سے آگے نہ سوچا گیا
ایسے بیٹے خدایا کسی کو نہ دے
ایسے دشمن خدایا کسی کو نہ دے

میں نظم پڑھتا گیا اور پاکستان کی مظلومی کی تصویر نظروں کے سامنے ایک فلم کی طرح چلتی گئی۔تب مجھے محسوس ہوا کہ بھٹی صاحب نماز روزہ اور خوبصورت چہروں سے پیار و محبت کی پینگیں بڑھانے کے ساتھ ساتھ پاکستان سے بھی ''رج کر'' پیار کرتے ہیں۔اگر پیار نہ کرتے تو وطن کی مٹی کو یہ ایسی زبان کیوں عطا کرتے جو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا اس طرح کھل کر اظہار کرتی۔

بھٹی صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ ''خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے'' چھپا تو میں سوچنے لگا کہ نام کی مناسبت سے یہ ہماری ہجرت کی مکمل کہانی ہوگی لیکن جب کتاب پڑھنی شروع کی تو میں یہاں بھی مات کھا گیا۔مجھے یہ بات یاد ہی نہ رہی کہ ضروری نہیں کہ کتاب کا نام کتاب کے مضمون سے مناسبت رکھے۔اگر کوئی تعلق ہوتا تو ان کے پہلے شعری مجموعہ ''اک بھول ہوئی نادانی میں'' کے نام سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔دوسرے شعری مجموعہ کے مطالعہ سے بھٹی صاحب کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔کتاب میں ہجرت کے تعلق سے شعر ہیں لیکن اس میں دعائیہ کلام شامل ہے۔جس میں بھٹی صاحب ماں اور بچوں کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے انکے روشن مستقبل کے

خواب دیکھتے نظر آتے ہیں۔

دنیا کو تم سنوارو، عمر دراز پاؤ
قسمت کے آسماں پر تم خوب جگمگاؤ
کھل کر چمن میں مہکو، بزم جہاں سجاؤ
حامی خدا تمھارا ، جی بھر کے مسکراؤ

اور پھر بیٹی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اتنا عروج پاؤ ، اتنا عروج پاؤ
تم آفتاب بن کر ہر سو کرو اُجالا
ابو کی یہ دُعا ہے ہر دو جہاں میں بیٹی
سایا رہے خدا کا بن کر تمھارا ہالا

اور پھر ماں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

مری ماں کو دے دے مری زندگی
سدا اس کو حاصل ہو خورسندگی
کرے مولا منظور یہ بندگی
نہ ہو مجھ کو دنیا میں شرمندگی
نہیں وہ ، تو جینا ہی بے کار ہے
سنا ہے کہ ماں میری بیمار ہے

ہجرت کے حوالے سے بھٹی صاحب کا ایک قطعہ کتاب کی پشت پر تصویر کے ساتھ نمایاں چھپا ہے:

پرندہ واپسی کی سوچتا ہے
ارادے باندھتا ہے توڑتا ہے
عمل ہجرت کا ہے جاں سے گذرنا
خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے

محمد اقبال بھٹی صاحب کے منظر عام پر آنے والے تازہ ترین مجموعہ کا نام ہے ''ستارے جب نہیں ملتے'' کتاب کی پشت پر محمود ہاشمی صاحب کی رائے شامل ہے۔ ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:

''کتابوں کے نام رکھنا بھٹی صاحب کی خصوصیت ہے ان کی پہلی کتاب کا نام تھا ''اک بھول ہوئی نادانی میں''۔ دوسری کتاب آئی تو ''خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے'' کا المیہ گنگناتی ہوئی آئی اور اب تیسری کتاب ''ستارے جب نہیں ملتے'' کا عنوان لئے ہوئے ہے۔ ہر کتاب کا نام کتاب میں شامل غزلوں اور نظموں میں سے کسی ایک کا مصرعہ ہے جو اپنی نغمگی اور غنائیت کے بل بوتے پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ نظم یا غزل ضرور پڑھی جائے جس کا یہ ایک جزو ہے۔''

بھٹی صاحب کو جدید لہجہ کا بڑا شاعر کہلوانے کا کوئی خبط نہیں۔ یہ حقیقت پسند شاعر ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں خود کہتے ہیں کہ:

اک دوست کا مجھ سے کہنا ہے
میں شعر جو ان کو سناتا ہوں
بس لفظوں کی ہیرا پھیری ہے
میں باتیں خوب بناتا ہوں
میں شاعری کے گُر کیا جانوں
بس رانجھا ہیر بتاتا ہوں

بھٹی صاحب رومانی ، وطن پرست ، اور معاشرتی شاعر ہیں۔ خوبصورت کلام کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ خود کہتے ہیں۔ زر و دولت کے سہارے شاعری نہیں کرتے۔ ممکن ہے ان کی شاعری میں کچھ فنی غلطیاں ہوں لیکن ایک بات واضح ہے کہ جو کچھ ان کے دامن میں ہے یہ سب ان کی اپنی کمائی کا ثمر ہے۔

''بزمِ رنداں''

عذاب ان مغربی تہذیب کے روشن خیالوں پر
عذاب ان مجرمانہ ذہنیت کے ٹھیکے داروں پر
جو استحصالِ زن کی ناروا سازش کا حصّہ ہیں
جو عورت کو بشکلِ مالِ مرئی پیش کرتے ہیں
جو اس کو ایک مردہ چیز کی صورت برتتے ہیں
تو اس طرزِ عمل، طرزِ تفکّر کے نتیجے میں
کہیں پر اشتہاری سیم و زر کا جال ڈالے ہیں
کہیں قربان ہوتی ہے وہ زرداروں کی منڈی میں
سرِ بازار سڑکوں کے کنارے حسن بکتا ہے
تعیّش کا کھلونا ہے وہ عیّاروں کی جھولی میں
برائے مردمانِ ہوش وہ مالِ تجارت ہے
کھڑی ہے آج بھی عورت اسی اُجڑے بیاباں میں
وہ اب بھی ایک کٹھ پتلی ہے عشرت گاہِ مرداں میں
وہ عورت جو مقیّد تھی کبھی چکلوں کے زنداں میں
نکل آئی ہے وہ آزاد ہو کر بزمِ رنداں میں

فضا اعظمی کی تازہ مثنوی ''عذاب و ثواب'' سے منتخبہ

''مصنف کس کو کہتے ہیں''

(جناب فخر زمان کے تازہ شعری مجموعے ''شہر گرہن'' سے وقت کی مزاج آشنا غزلیں)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

پھیلی ہو جب دشمنی لوگوں کی سالوں پر محیط
ہو کے رہتی ہے وہ آخر کار صدیوں پر محیط

جس کو لاحاصل کہیں اس کا بھی حاصل ہے کوئی
چھوٹے چھوٹے جزو ہو جاتے ہیں صدیوں پر محیط

گھڑیوں کی رفتار تو رہتی سفر میں سارا دن
اور تعین وقت کا ہوتا ہے صدیوں پر محیط

عمر میں اپنی جو نیکی تھی رہی ہے مختصر
لوگوں کی جو دشمنی ہے وہ ہے بدیوں پر محیط

وہ دھنک تھی جلترنگ تھی پُروا تھی یا زندگی
ہو گئی ساری اُداسی میری خوشیوں پر محیط

..... ○ .....

○

جبلیں بھی ہم نے کاٹی ہیں کوڑے بھی کھائے ہیں
بیٹھے ہیں تخت پر جو صفِ دشمناں میں تھے

ایسی لگی ہے آگ کہ سب گھر بھسم ہوا
ہم راکھ ہونے سے بچے کیونکہ اماں میں تھے

بچھڑے تو یوں لگا کہ سمندر کے پار ہوں
میرے قریب تھے گو لگے میری جاں میں تھے

ہم زندگی کی دوڑ میں پیچھے تو رہ گئے
جن سے مقابلہ تھا وہی درمیاں میں تھے

☆

○

جلسوں سے جائے گا نہ جلوسوں سے جائے گا
بس دیکھتے ہی دیکھتے لمحوں میں جائے گا

میری کتابِ زیست کا تم استخارہ ہو
جو بھی پڑھے گا غور سے خوشیوں میں جائے گا

ہوتا ہے نامیاتی کا رشتہ زمین سے
شاعر بڑا وہ ہوگا جو فصلوں میں جائے گا

تشبیہیں استعارے یہ امیج نئے نئے
اُن تک یہ حال کون سے لفظوں میں جائے گا

☆

(غیر روایتی غزل)

میں نے کہا کہاں پہ ہوا کا فکائی ٹرائل　　اُس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے
میں نے کہا تیار ہوں سناؤ فردِ جرم　　اُس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے
میں نے کہا کہ جج نہ وکیلِ استغاثہ　　اُس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے
میں نے کہا سنا دو جو ہے حکمِ حکمراں　　اُس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے
میں نے کہا کہ دوستوں سے مل لوں ایک بار　　اُس نے کہا مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے

..... ○ .....

○

جس کی رہی تلاش ملی بے شمار میں
تیرے شمار میں ہے نہ میرے شمار میں

میری پہنچ سے دور ہے جو چیز آج کل
آئے گی ایک دن وہ مرے اختیار میں

جتنے بھی زخم مجھ کو لگے مندمل ہوئے
وہ گھاؤ تازہ ہے جو لگا اعتبار میں

اب تم پہ منحصر ہے جو مطلب نکال لو
دل میں جو بات تھی وہ کہی اختصار میں

تم آؤ گے نہ آؤ گے یہ کیفیت ہے خوب
بیٹھے ہیں کتنی دیر سے ہم انتظار میں

☆

○

مانگا تھا ہم نے نام پہ مذہب کے یہ وطن
اب اسلحے کے سائے میں پڑھتے ہیں ہم نماز

اک دائرے کی شکل میں تھا زیست کا سفر
یہ حال ہو وطن کا تو کیا جینے کا جواز

تسلیم کون کرتا ہے کوتاہیاں یہاں
آؤ پھر اس شکست کا ڈھونڈیں کوئی جواز

جو بھی دُعا کرے وہ ہے تیری صوابدید
تجھ پر سلامتی ہو تری عمر ہو دراز

چھوڑا ہے کس کے واسطے اک دوسرے کا ساتھ
دونوں کے پاس تھا بھلا اس کا کوئی جواز

☆

واپسی لازماں کی طرف......!

پروین شیر
(کینیڈا)

۷/جنوری، ۲۰۱۴ء، ونی پیگ (کنیڈا) کی کپکپاتی ہوئی رات کے ۹ بجے پریشان حال یخ ہوائیں باہر چیخ رہی ہیں۔اتنی زور زور سے کھڑکیوں کے شیشوں پر سر پٹک رہی ہیں جیسے وہ انہیں توڑ کر اندر آجائینگی۔یکا یک میرا فون بھی چیخ پڑا۔۔۔تقریباً ایک سال بعد ہندوستان، کشمیر سے شاہ فیصل کی آواز سنائی دی۔میری ان سے پہلی بار اُس وقت واقفیت ہوئی تھی جب انہوں نے مجھے شاید ڈیڑھ برس قبل برقی خط بھیجا تھا۔جس میں درج تھا کے وہ اُردو میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہے ہیں اور معروف نقاد، پروفیسر وارث علوی کی شخصیت پر ایک کتاب مرتب کررہے ہیں۔انہیں پروفیسر وارث علوی نے مشورہ دیا ہے کہ پروین شیر کا بھی ایک مضمون اس کتاب میں ضرور شامل کریں۔شاہ فیصل کا یہ خط پڑھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور کچھ گھبراہٹ بھی کہ اس قدآور شخصیت کے متعلق لکھنے کی طاقت میرے قلم میں کہاں سے آئیگی۔اور پھر کچھ عرصے بعد اُن کی غیر معمولی شخصیت پر میرے سچے تاثرات ملنے پر شاہ فیصل نے مجھے اطلاع دی کہ میرا مضمون پروفیسر وارث علوی کو بہت پسند آیا۔جسے سن کر مجھے ازحد مسرت ہوئی۔

آج شاہ فیصل کی آواز ایک عرصے بعد سُن کر خوشی ہوئی جو جلد ہی گہرے دکھ میں تبدیل ہوگئی جب انہوں نے یہ جاں کاہ خبر سنائی کہ پروفیسر وارث علوی ایک گھنٹہ قبل زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔ایک دھما کہ سا ہوا۔ذہن ودل بے بسی کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔تقریباً دو ہفتے قبل اُن سے میری بات ہوئی تھی۔اُس دن وہ خوش باش تھے،طبیعت کچھ بہتر تھی۔پھر ایک ہفتے بعد ان کی صاحب زادی، فرزانہ (جو اپنے والد کی طرح بہت ہی خوش خلق اور محبت آمیز ہیں) نے بتایا کہ پروفیسر وارث علوی زیادہ علیل ہیں اور ہاسپٹل میں ہیں۔یہ علم تو تھا کہ ایک عرصے سے اُن کی صحت ساتھ نہیں دے رہی تھی، پھر بھی دل بہت پُر اُمید تھا۔نہ جانے کیوں یقین تھا کہ دعائیں اُنھیں اس بھنور سے نکال کر کنارے پر ضرور لے آئینگی۔۔۔مگر۔۔۔افسوس۔۔۔! قوی اُمید ایک چھنا کے سے چکنا چور ہوگئی۔

شاہ فیصل سے یہ درد بھری خبر سُننے کے بعد فون رکھ کر بے ساختہ میری انگلیوں نے وہ نمبر ڈائیل کر دیے جہاں سسکیاں تھیں۔فرزانہ کی سسکیاں۔۔۔نہوں نے کہا "ابّا کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی، وہ بہت تکلیف میں تھے، انہیں سب تکلیفوں سے نجات مل گئی ہے۔تم فون کرتی رہنا کہ تمہاری آواز ابّا کی یاد دلاتی ہے"۔

اب میری نم آنکھیں کھڑکی کے باہر فضاؤں میں بھٹک رہی ہیں۔میلوں تک پھیلی ہوئی سپاٹ زمین اور درختوں کے پنجر برف کی دبیز، سفید چادر اوڑھے سوگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ہوائیں مستقل پاگلوں کی طرح چیخ رہی ہیں، پریشان ہو ہو کر شیشے پر سر ٹکرا رہی ہیں، بین کررہی ہیں۔سوگوار کھڑی ہوئی میں سوچ رہی ہوں۔۔۔زندگی کے متعلق۔۔۔موت کے متعلق!

سانس کے ریشم کا ایک سرا زندگی کے ہاتھ میں ہوتا ہے دوسرا موت کے ہاتھ میں۔کھینچا تانی چلتی رہتی ہے۔اس کشاکش میں جیت ہمیشہ موت کی ہوتی ہے۔جسم کی پیچک سے لپٹے ہوئے سانس کے ریشم کو موت کا ہاتھ اپنی طرف اُس وقت تک کھینچتا رہتا ہے جب تک دونوں سروں پر قابض نہ ہو جائے۔آج ایک غیر معمولی ذہن،فکر و بصیرت اور قوت ادراک کا آب دار موتی دوریوں کے سمندر پر بہہ کر گُم ہو گیا ہے۔بہت اونچی اُڑان والا پرندہ اپنے تابناک پروں کو پھیلائے ہوئے گھنے بادلوں میں روپوش ہو گیا ہے۔واپسی کا راستہ بھول کر۔

میں سوچ رہی ہوں زندگی کے سفر کے متعلق۔۔۔کائنات سے ٹوٹ کر ایک ذرّہ ہوا کے رتھ پر اُڑتا ہوا زمین پر آجاتا ہے۔جسم کی قبا میں سما کر ،اس دھرتی کو تھام کر رقصاں ہوتا ہے۔پھر اس قبا سے نکل کر، ہوا کا بازو تھام کر واپس اُڑ کر کائنات سے دوبارہ جُڑ جاتا ہے۔یوں یہ مختصر سفر تمام ہوتا ہے۔جانے والا ایک الگ راستے پر چلا جاتا ہے۔ہم اُسے دور ہوتے ہوئے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ناسمجھ دل بے چین ہو کر یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح جانے والا مُڑ کر ایک بار دیکھ تو لے۔۔۔شاید اُس کا ارادہ بدل جائے اور وہ لوٹ آئے۔لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے، بس یہ دل ٹوٹ جاتا ہے۔وہ چلا جاتا ہے۔۔۔ذرّے ذرّے میں اپنی یادیں چھوڑ کر۔۔۔

اک عقیدت سے ضیا افروز ہے چشمِ سحر
ہیں غزل خواں یاد میں تیری یہ اشجار و قمر
(پروین شیر)

میں سوچ رہی ہوں کہ پروفیسر وارث علوی تو زماں سے لازماں کی بے کراں وسعتوں میں گھل مل گئے ہیں۔یہ موت ہے یا زندگی؟ رفتگی ہے یا جاویدانی؟

جب ان کی زندگی کے سفر پر نظر ڈالتی ہوں تو ایک مشہور جرمن فنکار Andrew Sachs کی یہ بات یاد آجاتی ہے:

Death is more universal than life, everyone dies but not everyone lives". "میرے خیال میں پروفیسر وارث علوی نے زندگی کو صحیح معنوں میں جی لیا تھا۔ان کا اس جہاں کا سفر بھرپور رہا۔وہ ہمیشہ اپنوں میں، اُن کی محبتوں کی بانہوں کے حصار میں بندھے رہے۔وہ ایک ایسے شجر کی مانند تھے جس کی شاخوں پر پرندے ہمیشہ چہچہاتے رہے۔خزاں ہو یا بہار۔

میری بدقسمتی یہ ہے کہ کبھی ان سے رو برو ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔لیکن جب بھی فون پر گفتگو ہوئی ان کے لہجے کی شفقت، خلوص اور اپنائیت نے بے حد متاثر کیا۔

میری خوش قسمتی یہ ہے کہ میری تصنیفات پر انہوں نے اپنے گراں قدر تاثرات سے مجھے نوازا۔یہ میرے لیے باعث فخر ہے۔ان کی آواز کی روشنی اُردو کی آنکھوں کو لَو دیتی رہی۔اس کی رگوں کو تازہ خون کی جگ مگاہٹ مہیا کرتی رہی اور اس کے دل کو اُجالا بخشتی رہی۔ان کا قلم ہر لحہ کرن بکھیرتا رہا۔پروفیسر وارث علوی ایک ایسے ناقابل فراموش، عظیم نقاد تھے جن کی غیر متعصّبانہ تنقید ان کی شناخت بن گئی۔ان کی اہم تصنیفات اُردو ادب کا خزانہ ہیں۔مثلاً.....راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ، ناخُن کا قرض، کچھ بچالایا ہوں، اے پیارے لوگو، اور پیشہ تو سپہ گری کا بھلا، وغیرہ وغیرہ۔کوئی مصنف، خواہ وہ کتنا ہی قد آور کیوں نہ ہو، پروفیسر وارث علوی کی تحریر اُس کے متعلق رعایت سے ماوراء رہی۔ان کی Bitter-sweet، طنز و مزاح سے پُر، بے لاگ تنقید نے قارئین ادب کو حقیقی آگہی عطا کی۔ان کی تحریر کی ندرت، ظرافت، تخلیقیت، دیانت، بے خوف آواز اور منفرد انداز بیان نے تنقید جیسے خشک مضامین کو از حد دل چسپ بنا دیا۔تخلیقیت سے بھرپور تحریریں سحر انگیز ہیں۔ہوس شہرت کی پراگندگی سے پرے رہ کر بھی انہیں وہ شہرت حاصل ہوئی جو انہیں عظمت کی بلندیوں تک لے گئی۔خودستائی بھی نہیں اور خودنمائی بھی نہیں۔ان کی شخصیت میں بے باک صداقت تھی جو مصلحت سے مبرّا تھی۔بصیرت کا سرچشمہ تھی۔

باہر ہواؤں کی چیخ تھم تھم کر اُبھر رہی ہے۔دل و دماغ زندگی اور موت کے اُلجھے ہوئے دھاگوں میں اُلجھ گیا ہے۔زندگی کا مختصر سفر گونا گوں تجربات کی فراوانی میں تمام ہوتا ہے۔یہ کبھی توڑتا ہے تو کبھی جوڑتا ہے۔کبھی آس تو کبھی یاس۔خوشی اور غم کے حباب اُبھرتے ہیں پھر ٹوٹتے ہیں۔تجربات کے انبوہ میں دھکّے کھاتے ہوئے یہ سفر پورا ہوتا ہے۔مجھے پروفیسر وارث علوی کے یہ الفاظ یاد آرہے ہیں۔۔۔''تجربہ کیا ہے؟.....ذات کا غیر ذات سے ملاپ، ذہن کی خارجی دنیا سے مڈبھیڑ، سلگتے احساس سے دہکا ہوا فانوس خیال، جذبہ کی طلاطم بدوش موجوں کا سنگیت۔تجربہ جس احساس کو جنم دیتا ہے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیل کی مانند جتنا نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ پھیلا ہوا، کہیں زیادہ گہرا اور پُر اسرار ہوتا ہے۔جھیل کے پانی کا رنگ کہیں نیلا، کہیں سبز، کہیں زرد اور کہیں خاکستری ہوتا ہے۔دیکھتے دیکھتے ایک رنگ دوسرے میں تحلیل ہو جاتا ہے اور گھلتے ملتے رنگوں کے دائرے بنتے ،بگڑتے، ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں''۔(پیشہ تو سپہ گری کا بھلا)۔

اور آج۔۔۔یہ کیسا تجربہ ہے؟ دیکھتے دیکھتے بصیرت سے پُر ایک آواز کا رنگ خاموشی کے رنگ میں تحلیل ہو گیا ہے۔آگہی کی روشنی دلوں میں ضو فشاں کر کے۔باہر برف کی چادر کچھ اور زیادہ دبیز ہوتی جا رہی ہے۔جیسے فضائیں سفید لباس زیب تن کیے ہوئے ماتم پُرسی میں مبتلا ہیں۔مجھے فرزانہ کی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں اور میری ایک پسندیدہ امریکی شاعرہ Helen Lowrie Marshall کی نظم "After Glow" یاد آرہی ہے۔ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آج.....یہ پروفیسر وارث علوی کی آواز ہو۔اس آواز کو میں فرزانہ کو سنانا چاہتی ہوں۔اُن کی بہنوں شہناز، شاہدہ، اُن کے بچوں اور اُن تمام لوگوں کو سنانا چاہتی ہوں جو پروفیسر وارث علوی سے بہت محبت کرتے ہیں۔۔۔

I,d like the memory of me to be a happy one.

I,d like to leave an after glow of smiles when life is done.

I,d like to leave an echo whispering softly down the ways,

Of happy times and laughing times and bright sunny days.

I,d like the tears of those who grieve to dry before the sun.

Of happy memories that I leave when life is done.

یہ آواز میں بھی سُن رہی ہوں۔پھر بھی دِل سوگوار ہے۔اُداس ہے۔باہر خشک، ننگی اور نوکیلی شاخیں برف کے سینے میں چُبھی ہوئی ہیں۔رات کے اندھیرے میں سفیدی اوڑھے ہوئے مناظر ایک انوکھی، نرم، مخملی سی روشنی بکھیر رہے ہیں جس میں سفید برّاق برف کے غبار میں پروفیسر وارث علوی کے فکر و آگہی کے لاکھوں ستارے دمک رہے ہیں۔نور بکھیر رہے ہیں۔علم و فہم کی دنیا کو ہمیشہ منوّر رکھنے کی خاطر یہ ضیا پاش ہیں،۔۔۔سدا رہینگے۔۔۔!

..... فنون .....

(سہ ماہی)

جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم و مغفور کا یادگار مجلّہ ''فنون'' اُن کی صاحبزادی ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نواسے جناب نیّر حیات قاسمی کے توسط سے اپنی اشاعت اُسی روایت اور آن، بان، شان سے جاری رکھے ہوئے ہے۔۴۴۷ صفحات کی زیرِ نظر اشاعت اپنے مواد، مزاج، معیار اور پیشکش کے لحاظ سے ایک یادگار ادبی دستاویز ہے جس میں اردو ادب کے قاری کی افتادِ طبع مطابق وہ سب کچھ دستیاب ہے جو وہ پڑھنا چاہتا ہے۔آپ بھی اگر معیاری ادب کے خُوگر ہیں تو اولین فرصت میں ۲۵۱، بلاک ایف ٹو، واپڈا ٹاؤن لاہور پر رابطہ کیجیے۔جہاں یہ نادر و نایاب دستاویز فقط ۴۰۰ روپے کے عوض دستیاب ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو ''زندہ''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی
(کراچی)

شعرا حضرات اپنے فن پر بڑا ناز کرتے ہیں اور نثر نگاری کو ایک بے کار مشغلہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے عہد کے ایک معتبر شاعر نے کہا تھا۔

کیا نثر میں رکھا ہے، جز مدح و ثنا محسنؔ
اب کام کی باتیں بھی اشعار سے ملتی ہیں
(محسنؔ بھوپالی)

ایک اور نامور شاعر (قتیلؔ شفائی) کا دعویٰ تھا ع

میں نے دیکھا ہے کہ جب میری زباں ڈولتی ہے، شاعری سچ بولتی ہے

شاعری کے مقابلے میں نثر کی تعریف یا دفاع اس وقت ہمارا موضوع نہیں البتہ اگر سچ سے مراد حیران کُن، انہونی اور نا قابلِ یقین باتوں کا ابلاغ ہے تو بے شک شاعری ''سچ کا مرقع'' ہے ورنہ ہمارے جیسے سیدھے سادے، بھولے بھالے قاری کے نقطۂ نظر سے درحقیقت یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اول تو ''صنعتِ مبالغہ'' کی آڑ میں شعرا رائی کا پہاڑ بنانے کا لائسنس حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ اُن کی غلط بیانیاں گُمان و گیان کی سب حدوں کو پار کر جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ موت جیسی اٹل اور آفاقی حقیقت کو بھی اپنے زورِ بیان سے تماشا بنا دیتے ہیں۔ موت کے آتے ہی انسان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کاروبارِ حیات کو قفل لگ جاتا ہے لیکن شاعر کوئی معمولی مخلوق نہیں۔ وہ مرنے کے بعد بھی نہ صرف پَٹ پَٹ بولتا رہتا ہے بلکہ زندہ لوگوں سے زیادہ ''فنکشنل'' ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے ظاہر بیں شخص کی سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ غالبؔ نے محبوب کے ہاتھوں اپنے خونِ ناحق کے بعد اُس بے وفا کے ردِعمل کا مشاہدہ کس طرح کر لیا تھا جو یہ شعر کہا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

مومنؔ نے بھی اپنے قاتل کی پشیمانی بچشمِ خود ملاحظہ کر لی اور پھر اظہارِ افسوس کیا۔

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ایک صاحب کو زندگی میں تو اپنے محبوب سے بڑے گلے شکوے رہے لیکن اپنی وفاتِ حسرت آیات پر اُس کی گریہ وزاری برداشت نہ کر سکے چنانچہ اُس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی
(آغا شاعر قزلباش)

مصحفیؔ نے اپنے قتل پر محبوب کے خلاف کوئی ایف۔آئی۔آر کٹوانے کے بجائے خود اس کے حضور، یہ ہلکا سا احتجاج ریکارڈ کرایا۔

کیوں مصحفیؔ خستہ کے تئیں تو نے کیا قتل
کیا سیکڑوں عاشق میں گنہ گار یہی تھا

ایک مقتول نے اپنے بے حس اور سفاک محبوب کے تجاہلِ عارفانہ پر چوٹ کی۔

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی
(محمد اسحاق امیر خان انجامؔ)

حضرتِ داغؔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ وہ کھری بات کہنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنے قاتل محبوب کی مکّاری اور شعبدہ بازی کا بھانڈا یوں پھوڑا۔

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے، یہ کام کس کا تھا؟

بہر حال ''موت سے کس کو رُستگاری ہے'' شاعر طبعی موت دنیا سے سدھارا یا شہادت کا درجہ حاصل کیا یہ سوال اپنی جگہ، دیکھنا یہ ہے کہ ''فوتگی'' کے باوجود اپنے محبوب سے اس کی بے جا اور بچکانہ فرمائشیں جاری رہتی ہیں۔ وہ کفن بھی اپنی پسند کا طلب کرتا ہے۔

دے دیجیو تُو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا
(ناسخؔ)

(اب کوئی ''پہلوان شاعر'' سے پوچھے کہ کیا بعد از مرگ بھی کسی کے جسم میں توانائی باقی رہتی ہے؟)

آخر کار جنازہ تیار ہو گیا لیکن صورت حال اُس وقت بڑی گمبھیر ہو گئی جب محبوب آخری دیدار کے لیے پہنچا اور مرحوم اس کی تعظیم کے لیے اٹینشن کھڑے ہو گئے۔ یہ غیر روایتی حرکت داغؔ دہلوی سے سرزد ہوئی۔ اس پر محبوب کا کیا حال ہوا یہ بھی ان ہی کی زبانی سنیے۔ کہتے ہیں۔

میّت پہ میری آ کے دل اُن کا دہل گیا
تعظیم کو جو لاش مری اُٹھ کھڑی ہوئی

ایک شاعر کو اُن کے انتقال پر غسل کے بعد کفنایا جا رہا تھا تو انہیں ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ انہوں نے تکفین کرنے والوں کو مخاطب کیا۔

میرے کفن کے بند نہ باندھو ابھی مجھے
ملنا ہے ایک شخص سے بانہیں نکال کر
(شبیر ناز شؔ)

انتقال کے بعد شاعر اپنی آخری رسوم کا تحریری ریکارڈ بھی محفوظ کر لیتا ہے۔ فانؔی نے دو اشعار میں اپنے سفرِ آخرت کا حال رقم کرتے ہوئے ظالم محبوب کے ضمیر کو کچوکے لگائے ؎

سنے جاتے نہ تھے تم سے، مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اٹھا شورِ ماتم ، آخری دیدارِ میّت کا
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانؔی دیکھتے جاؤ

یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ''شاعری سچ بولتی ہے'' قبیلہء شعرا کے ایک اور معزز رُکن (سیمابؔ اکبر آبادی) کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔ جب اُن کی میّت تیار ہوگئی لیکن تدفین میں تاخیر ہونے لگی (جو خلافِ شرع ہے) تو مرحوم خود کفن میں سے پکار اٹھے ؎

فَھا خموش، اعزّا نڈھال، تم محتاط
کوئی ہمارا جنازہ اٹھائے گا کہ نہیں؟

ایک دوسرے شاعر (شعیبؔ بن عزیز) نے اپنی تدفین میں غیر معمولی تاخیر پر اظہارِ تشویش کرتے ہوئے کہا۔

یہ ترے دوست تجھے دفن کیوں نہیں کرتے
شعیبؔ فوت ہوئے تجھ کو اک زمانہ ہوا

ایک خوددار شاعر نے اس سلسلے میں کسی کا احسان اپنے سر نہیں لیا۔ بلکہ اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کیا جیسا کہ اس شعر سے پتا چلتا ہے۔

تمہیں خبر بھی ہے یارو کہ دشتِ غربت میں
ہم اپنا آپ جنازہ اُٹھائے پھرتے ہیں
(قابلؔ اجمیری)

مومنؔ اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ تجہیز و تکفین کے انتظامات احباب نے کر دیے تھے لیکن انہیں ایک اور ناگوار صورت حال کا سامنا پڑا۔ کہتے ہیں۔

خاک میں مل جائے یارب بے کسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

اس کے برعکس ناسخؔ کی میت کو اُن کے محبوب نے کندھا کیا دے دیا کہ فرطِ مسّرت سے پُکار اُٹھے۔

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اُس پری رُو نے
گماں ہے تختہء تابوت پر تختِ سُلیماں کا

لیکن اُس کم ظرف نے ایک زیادتی یہ کی کہ ناسخؔ کے رقیب روسیاہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ شاعر مر کر بھی رقیب کا ناپاک وجود برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ موصوف نے کفن میں سے صدائے احتجاج بلند کی۔

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازے پر
شعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا

جب میّت کو مرقد کی طرف لے جانے لگتے ہیں تو مجمع بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ اب جیسا کہ قاعدہ ہے، بوقت تدفین سب لوگ تربت کا گھیراؤ کر لیتے ہیں۔ شاعر، لوگوں کے اس خلوص پر بھی طنز کرتا ہے۔

عمر بھر اہلِ وطن نے بات تک مجھ سے نہ کی
لوگ میری قبر پر پھر جمگھٹا کرتے رہے
(خلیل الرحمٰن راز ؔ)

استاد قمرؔ جلالوی نے البتہ اس ضمن میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا اور جنازے کے ساتھ آنے والوں کے بے لوث تعاون کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا ؎

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اِس منزل سے ہم

ایک عام دستور ہے کہ لوگ مرنے والے کے لیے خیر کے کلمات کہتے ہیں اور اُس کے حق میں بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ داغؔ نے یہ سب کچھ اپنے محبوب کی زبان سے کہلوا کر سُرخ روئی حاصل کی اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی تہمت سے بچ گئے۔

خبر سُن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اُستاد ذوقؔ کو اپنی عزتِ نفس کا اتنا پاس تھا کہ اس بارے میں بھی وہ کسی کے شرمندہء احسان نہ ہوئے اور اپنے لیے دعائے مغفرت خود ہی کر ڈالی ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا ، خُدا مغفرت کرے

ایک بھولے بادشاہ کا خیال تھا کہ انہیں نہلا دھلا کر باجماعت کسی تفریحی مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے گا لیکن جب انہیں قبر میں اتارا جانے لگا تو انہوں نے ایک ''فنی مسئلہ'' کھڑا کر دیا۔ کہتے ہیں۔

سپردِ خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

شکر ہے دفنانے والوں نے اس ''نکتہء اعتراض'' کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور انہیں قبر میں لٹا دیا۔ ایک شاعر نے جو غالباً دنیا چھوڑتے وقت بہت کبیدہ خاطر تھے تربت میں لیٹ جانے کے بعد اپنی میت کے ساتھ آنے والوں کو یہ غیر دانشمندانہ وارننگ دی۔

دباؤ خاک میں ہم کو مگر خیال رہے
کہ ہم سے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے
(انورؔ گورداسپوری)

ہمارے جیسے غیر دانش ورٹائپ کے لوگوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے

یہ سوچ کر کہ دنیا سے جانے کے بعد شاعر اپنے اعزّا واحباب کو کیسی کیسی آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ایک صاحب کو دفنانے کے بعد قبر تیار ہوگئی اور غم گساروں نے اس پر اظہارِ عقیدت کے لیے مٹی ڈالنی شروع کی تو انہیں اس نیک عمل میں بھی بدنیتی کی بُو آنے لگی۔اندر ہی سے ان مخلص لوگوں پر طعن کا تیر چھوڑ دیا۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

(ثاقب لکھنوی)

خیر صاحب، خدا خدا کر کے تدفین ہوگئی۔ماتم کنندگان روتے ہوئے رخصت ہوئے لیکن شاعر اس المیے میں بھی اپنی دل بستگی کا سامان تلاش کر لیتا ہے۔ کراچی والے استاد جو عمر بھر محبوب کے دیدار کو ترستے رہے، بعد از مرگ شربتِ دیدار سے سیر ہوئے۔پھر اس خوشی کے موقع پر ''سچ'' کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

آئے مرے مزار پہ گھونگھٹ اتار کے
مجھ سے نصیب اچھے ہیں میرے مزار کے

استاد نے بڑی استادی سے اپنی قبر پر پھول بھی ڈلوا لیے ؎

بات کر میری لحد پر، غیر ہی سے بات کر
یہ سنا ہے پھول جھڑتے ہیں تری تقریر میں

(قمر جلالوی)

چلیے، تدفین، دعا، درود، گل پوشی کے مرحلے بخیر وخوبی انجام پا گئے۔لیکن شاعر کو پھر بھی چین نہیں۔وہ اپنی قبر میں پڑے پڑے سوچتا ہے ؎

کس طرح قتل ہوگیا میرا
میں تو اپنوں کے درمیان میں تھا

(معراج جامی)

مقتول اپنے قاتل کو دیکھنا چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ قاتل کیفرِ کردار تک پہنچے۔چنانچہ وہ قبر سے باہر آ کر متعلقہ حکام سے مطالبہ کرتا ہے ع میرے قاتل کو مرے سامنے لایا جائے (پیرزادہ قاسم)۔جواب حوصلہ افزا نہیں ملتا تو مجبوراً وہ خود ہی اپنے کیس کی تفتیش شروع کر دیتا ہے اور اس مقصد سے گواہوں کی تلاش کے لیے نکل پڑتا ہے ؎

زمینِ شور میں برگ و گیاہ ڈھونڈتا ہوں
میں اپنے قتل کے سچے گواہ ڈھونڈتا ہوں

(سجاد زیدی)

مصطفیٰ زیدی بھی ایسے ہی خود تفتیشی مشن پر اپنی تربت سے باہر تشریف لائے تھے لیکن پھر تھک ہار کر یہ کہتے ہوئے واپس وہیں چلے گئے کہ ؎

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

ایک اور صاحب کو کوئی گواہ نہ ملا۔تاہم وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

اپنے ہی قتل کی میں آپ گواہی دوں گا
تجھ کو تصویر کے باہر بھی دکھائی دوں گا

(شفیق عباس)

ایک شاعر نے تو حد ہی کر دی۔موصوف خودکشی کا ارتکاب کر کے پہلے تو جائے واردات سے فرار ہوگئے۔پھر اپنا کیس تیار کرنے کے لیے دوسروں سے مدد طلب کرنے لگے کہ مجھ کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ تا کہ میں خود اپنے آپ سے اپنے قتل کا حساب لے سکوں۔دیکھئے شاعری کتنا سچ بولتی ہے ؎

میں اپنا قتلِ عمد کر کے ہوگیا روپوش
کہیں ملوں تو مرے پاس کھینچ لاؤ مجھے

(ثاقب انجان)

ایک معروف مزاح گو (پروفیسر عنایت علی خان) اپنی برسی بلکہ برسی کی سلور جوبلی میں بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔وہ اپنی محبوبہ کی وہاں حاضری اور خوش خوراکی پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کھا رہی ہے میری پچیسویں برسی کا پلاؤ
روز دھمکی جو دیا کرتی تھی مرجانے کی

تو یہ ہے صورت حال اس دعوے کی کہ شاعری سچ بولتی ہے۔اگر یہ سچ ہے تو جھوٹ کیا ہے؟ صرف سیاست؟ میں نہیں مانتا۔سیاست داں کبھی کبھار حادثاتی طور پر سچ بھی بول دیتا ہے۔(اگر لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتا ہے۔)شاعر کو یہ توفیق شاید ہی کبھی نصیب ہوتی ہو۔ایک معروف امریکی شاعر نے اعتراف کیا تھا ''جب میں بچہ تھا تو لوگ مجھے جھوٹا کہتے تھے۔ اب جبکہ میں بڑا ہوگیا ہوں تو سب مجھے شاعر کہنے لگے ہیں۔''

..... الحمرا (سالنامہ).....

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں ماہنامہ الحمرا نامور ادیب شاہد علی خاں کی ادارت میں نہایت باقاعدگی سے اپنی اشاعت جاری رکھے ہوئے ہے۔اردو جرائد کی قحط سالی میں الحمرا کا وجود ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی مانند ہے۔سال ۲۰۱۴ کی پہلی اشاعت الحمرا نے سالنامے کی صورت میں پیش کی ہے جو ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے۔حمد، نعت، سلام، غزلیں، نظمیں، افسانے، ناول، ڈرامہ، سفرنامہ، رپورتاژ، گوشہ مزاح اور گوشۂ اعزاز احمد آذر کی شکل میں نہایت عمدہ مواد، نفیس طباعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس خاص شمارے کی قیمت پانچ سو روپے مقرر کی گئی ہے جو ۲۴، جے بلاک، ماڈل ٹاؤن، لاہور پر دستیاب ہے۔

ایک صدی کا قصہ

ایس مکھرجی

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ایس مکھرجی کا پورا نام ششادھر مکھرجی تھا مگر وہ ایس مکھرجی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ایس مکھرجی اشوک کمار، کشور کمار اور انوپ کمار کا جیجا تھا۔اُنکی اکلوتی بہن ستی دیوی کی شادی ایس مکھرجی سے ہوئی تھی۔ششادھر مکھرجی بمبئی ٹاکیز میں ایک منیجر کی حثیت سے کام کررہا تھا۔بمبئی ٹاکیز اُس دور کی سب سے بہترین، منتظم اور جدید آلات سے آراستہ فلم کمپنی تھی جہاں فلم سازی کی ساری سہولیتیں ایک ہی چھت کے نیچے میسر تھیں۔بمبئی ٹاکیز کی اپنی ایک لیبارٹری تھی جہاں ملک کے بہترین ٹیکنیشن کام کرتے تھے۔کچھ غیر ملکی ٹیکنیشنز کی خدمات بھی اس کمپنی کو حاصل تھیں۔اس کمپنی کے کئی شوٹنگ فلور تھے جو ساؤنڈ پروف اور ایکو پروف تھے۔یہاں پر ماحول کا شور ریکارڈ ہونے کا احتمال نہیں رہتا تھا۔اس کمپنی کے اپنے ایڈیٹنگ روم اور منی تھیٹر بھی تھے جہاں پر ریلیز سے پہلے وہ اپنی فلموں کو جب چاہے دیکھ سکتے تھے۔ یہ سب ہمانشو رائے کی کاوشوں کی دین تھی۔بمبئی ٹاکیز پہلی پبلک لمٹیڈ کمپنی تھی جس کے شیر باقاعدہ جاری ہوتے تھے۔کمپنی نے اپنی ساکھ اور دھاک اس حد تک بنا کے رکھی تھی کہ اس کے شیر ہاتھوں ہاتھ بک جایا کرتے تھے۔ہمانشو رائے کی قیادت میں کمپنی خوب منافع میں چل رہی تھی۔ ہر سال شیر ہولڈروں میں بونس تقسیم کیا جاتا تھا۔

ششادھر مکرجی کا کمپنی میں خاصا دبدبہ تھا۔وہ اپنے لوگوں کو بمبئی ٹاکیز میں بھرتی کرنا چاہتا تھا۔سب سے پہلے اُسنے اپنے سالے اشوک کمار کو کھنڈوہ مدھیہ پردیش سے بمبئی بلالیا۔اشوک کمار نے گریجویشن پاس کی تھی اور اُسے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہ تھا پر جیجا کا حکم پاتے ہی وہ بمبئی کی اور چل پڑا۔ششادھر مکھرجی نے اُسے بمبئی ٹاکیز کے روح رواں ہمانشو رائے کے ساتھ لیبارٹی اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے کے لئے آمادہ کرلیا۔ہمانشو رائے ہرفن مولا تھے۔وہ بہت ہی قابل ایڈمنسٹر اور ذہین ڈائرکٹر تھے۔اُن کی قیادت میں بمبئی ٹاکیز کامیابی کی معراج پر تھی۔ہمانشو رائے نے کئی کامیاب اور یادگار فلمیں ہی نہیں بنائیں بلکہ اُس نے بمبئی فلم انڈسٹری کو کئی نایاب موتی دریافت کرکے دئے۔جیسے اشوک کمار، دلیپ کمار، لیلا چٹنس، دیوآنند، راج کپور اور محمود۔جس زمانے میں اشوک کمار نے بمبئی ٹاکیز سے اپنے کیریر کی شروعات کی تھی اُن دنوں ہمانشو رائے اپنی بیوی دیویکا بوس اور اُس زمانے کے مشہور ہیرو نجم الحسن کو لے کر ایک فلم بنا رہے تھے جس کا نام ''اچھوت کنیا'' تھا۔ یہ سن 1936 کی بات ہے۔دیویکا بوس بڑی کھلی ڈھلی اور عیاش عورت تھی۔ وہ اُس زمانے میں سگریٹ اور شراب بے خوفی سے پی لیا کرتی تھی۔فلم کی شوٹنگ معمول کی طرح چل رہی تھی کہ ایک دن اسٹوڈیو میں یہ خبر پھیل گئی کہ دیویکا رانی اچانک غائب ہوگئی۔سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ہمانشو رائے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔اُنہوں نے اپنے ملازموں کو ادھر اُدھر دوڑایا۔دیویکا رانی کیا اُسکی گرد تک نہ ملی۔اگلے روز ایک اور دل خراش خبر ملی۔دیویکا رانی اکیلے نہیں بھاگی تھی۔وہ فلم کے ہیرو نجم الحسن کے ساتھ بھاگی تھی۔اس خبر سے سبھی حصہ دار اس قدر برہم ہوئے کہ اُنہوں نے اُسی وقت ایک سنگین فیصلہ لیا۔نجم الحسن کو فلم سے الگ کردیا گیا۔دیویکا رانی چونکہ ہمانشو رائے کی بیگم تھی اسلئے اُس پر کوئی تادیبی کاروائی نہ کی گئی۔کچھ دن بعد وہ اپنے آپ لوٹ آئی۔ہمانشو رائے کا خون کھول رہا تھا پر مصلحتاً وہ زہر کا گھونٹ پی کر بیٹھ گئے۔پارٹنروں کے اصرار پر ''اچھوت کنیا'' پر پھر سے غور ہونے لگا۔اب ہیرو کا مسلہ تھا۔ششادھر مکرجی نے اپنے سالے اشوک کمار کو آگے کیا ہمانشو رائے جوہر شناس تھے۔اُنہیں اشوک کمار میں کوئی خاص بات نظر آئی اسلئے اُنہوں نے اشوک کمار کو ہیرو کے رول کے لئے پکا کردیا۔جیسا کہ پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ اشوک کمار کو فلم اداکاری میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔وہ اداکاری کے نام سے ہی کافی گھبراتا تھا اور وہ بھی ایسی چنڈ اور آوارہ عورت کے ساتھ جسے دیکھ کر اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔اپنے بہنوئی کے اصرار پر اُسنے اداکاری تو کی مگر وہ مطمئن نہ تھا۔وہ رات کو لیبارٹری میں جاکر رشز دیکھتا تھا اور سطرح وہ اپنی ہمت آپ ہی بڑھاتا تھا۔فلم ''اچھوت کنیا'' تو بہت کامیاب رہی اور اسطرح فلم انڈسٹری کو ایک باصلاحیت ہیرو مل گیا۔

1939 میں جب دوسری جنگ اعظیم کا اعلان ہوا تو بمبئی ٹاکیز کے روح رواں ہمانشو رائے کافی تناؤ میں آگئے۔وہ پہلے سے ہی کافی دکھی اور پریشان تھے اوپر سے مالی مشکلات سے بھی وہ دوچار تھے۔راج نارائن دوبے جو کہ بمبئی ٹاکیز کے ایک اہم ستون مانے جاتے تھے وہ آگے آیا اور اُس نے ہمانشو رائے کو 410000 کی مالی اعانت پیش کرکے اُسے اس مالی بحران سے باہر نکال دیا۔بمبئی ٹاکیز کی حالت تو بہتر ہوگئی مگر ہمانشو رائے کی صحت جواب دینے لگی۔وہ نروس بریک ڈاون کا شکار ہوگیا۔جنگ کا اعلان ہمانشو رائے کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔سن 1943 میں ہمانشو رائے کا انتقال ہوگیا۔مرنے سے قبل اُسنے اپنے اسٹوڈیو کے سارے حقوق اپنی بیوی دیویکا رانی کو منتقل کردئے۔ہمانشو رائے کے حصہ دار اس بات کے حق میں نہیں تھے تاہم اُنہیں حالات کے ساتھ صاد کرنا پڑا۔دیوکا رانی نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد بمبئی ٹاکیز کا پرچم لہرائے رکھا۔اُسنے کئی فلمیں بنائیں ''کنگن'' اور ''بندھن'' دو ایسی فلمیں تھیں جنہوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے اور دیوکا رانی نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ایک اچھی اور کامیاب اداکارہ کے ساتھ ایک کامیاب پرڈیوسر بھی ہیں۔دیویکا رانی نے ہی دلیپ کمار اور مدھوبالا کو لے کر فلم ''جوار بھاٹا'' بنائی جو بدقسمتی سے چلی نہیں۔ادھر ششادھر مکرجی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا۔وہ بمبئی ٹاکیز پر اپنا غلبہ چاہتا تھا جب کہ دیویکا رانی کمپنی پر اپنی گرفت

مظبوط کر رہی تھی۔ششا دھر مکھر جی کب سے بمبئی ٹاکیز پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔اُسنے پارٹنرس کو دیویکا بوس کے خلاف اُکسانا شروع کر دیا۔اُسنے اپنے سالے اشوک کمار اور گیان مکھر جی کو لے کر اپنا گروپ بنالیا۔اشوک کمار بمبئی ٹاکیز کے لئے ایک جزولاینفیک کی طرح تھا۔ششا دھر مکر جی دیویکا رانی کو الگ تھلگ کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ مجبور ہو کر بمبئی ٹاکیز سے دستبردار ہو جائے۔بات اس حد تک بڑھ گئی کہ ران نارائن دوبے کو مداخلت کرنی پڑی۔اُس نے دونوں دھڑوں کو آمنے سامنے بٹھایا اور یہ طے ہوا کہ بمبئی ٹاکیز کو لے کر جو ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے۔دونوں دھڑوں کی باہمی رضامندی سے بمبئی ٹاکیز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔بمبئی ٹاکیز کا سورج صدا کے لئے غروب ہوا۔

1943 میں ہی ایس مکھر جی نے رائے بہادر چونی لال، اشوک کمار اور گیان مکھر جی کو اپنے ساتھ ملا کر گورے گاؤں ممبئی میں ''فلمستان اسٹوڈیو'' کی نیو ڈال دی۔یہ چاروں اس اسٹوڈیو کے برابر کے حصہ دار تھے۔بمبئی ٹاکیز کے بند ہونے سے وہ سارے رائٹرز اور ٹیکنیشن ششا دھر مکھر جی کے ساتھ ہو لئے جن میں آغا جانی کشمیری بھی تھا جس نے بمبئی ٹاکیز کے لئے پچاس کے قریب فلمیں لکھیں تھیں۔ششا دھر مکھر جی کے ساتھ اشوک کمار جیسا نگینہ تھا جس نے کامیابی کی معراج کو چھو لیا تھا اور جس کے نام پر فلمیں ہٹ ہو جایا کرتی تھیں۔اُسنے فلمستان کے بینر تلے کئی کامیاب فلمیں بنائیں جیسے 1946 میں ''آٹھ دن'' اور ''شکاری'' 1947 میں ''دو بھائی'' 1949 میں ''شبنم'' یہ وہی فلم ہے جس کے لئے غلام حیدر نے پلے بیک سنگر کے طور پر لتا منگیشکر کے نام کی سفارش کی تھی۔ششا دھر مکھر جی نے جب لتا کی آواز سنی تو اُس نے اس آواز کو سنتے ہی یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ یہ آواز بہت پتلی ہے نہیں چلے گی۔ماسٹر غلام حیدر نے اُسے کافی سمجھایا کہ یہ کل کی اسٹار ہوگی، اسے مت ٹھکرائے مگر ایس۔مکھر جی تو کسی بھی طور رضامند نہ ہوئے۔اُنہوں نے تو غلام حیدر کو ہی فلم سے باہر کرنے کی دھمکی دی۔ماسٹر غلام حیدر نے ایس۔مکھر جی سے کہا کہ میری ایک بات یاد رکھنا۔ایک زمانہ آئے گا جب پرڈیوسر اس لڑکی کے گھر کے باہر لائن لگا کر کھڑا ہو جایا کریں گے۔ششا دھر مکھر جی کامیابی کے نشے میں اسقدر چور تھا کہ اُسنے ماسٹر غلام حیدر کی بات پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔

1950 میں ششا دھر مکھر جی نے فلم ''سرگم'' بنائی۔1951 میں ''شبستان'' اور 1952 میں ''آنند مٹھ''۔اس فلم کی کامیابی کے بعد اُنہوں نے ایک تاریخی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔فلم تھی ''انارکلی''۔اصل میں کے آصف نے بھی فلم ''مغل اعظم'' بنانے کی تیاری شروع کی تھی۔ششا دھر مکھر جی ایک تیز اور شاطر دماغ رکھتا تھا۔اُسنے اس فلم کی موسیقی کے لئے سی۔رام۔چندر کا انتخاب کیا۔سی۔رام۔چندر نے سب سے پہلے لتا کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کیا جس کے بول تھے۔محبت میں ایسے قدم لڑکھڑائے زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔جب ایس مکھر جی نے یہ گانا سنا تو وہ اسقدر برہم ہوئے اور اُسنے سی۔رام۔چندر کو بلا کر کہا کہ یہ گانا سن کر ایسے لگتا ہے جیسے یہ گانا کسی کوٹھے کی رنڈی نے گایا ہو۔یہ گانا ضائع کر دو۔سی۔رام۔چندر اڑ گیا۔اُس نے دوٹوک لہجے میں کہا یہ گانا فلم میں رہے گا تو وہ فلم کریں گے نہیں تو وہ یہ فلم چھوڑ دیں گے۔یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ایس۔مکھر جی کئی روز تک اس تگ و دو میں رہے کہ کیا کیا جائے۔اُس نے کئی موسیقاروں سے بات کی مگر کوئی بھی اس فلم کی موسیقی دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔آخر تھک ہار کر اُس نے پھر سے سی۔رامچند ر کو بلا کر باقی کے گانے ریکارڈ کرنے کے لئے کہا۔1953 میں جب فلم ''انارکلی'' ریلیز ہوئی تو اس فلم کی اُور ناظرین کو جس گانے نے زیادہ تر کھینچا وہ لتا کا گایا ہوا وہی مست و مدہوش کرنے والا گانا تھا جسے ایس۔مکھر جی نے کوٹھے والی کا گایا ہوا گانا کہا تھا۔اس فلم نے کامیابی کے سبھی ریکارڈ توڑ دیئے۔

فلمستان کامیابی کی اُور رواں دواں تھا۔ایک کے بعد ایک ہٹ۔1954 میں فلمستان نے ایک نہیں چار چار فلمیں ریلیز کیں۔جیسے ''شرط'' ناستک'' ''جاگرتی'' اور فلم ''ناگن''۔''ناگن'' وہ فلم تھی جسے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔اسکی دلفریب موسیقی کے لئے۔یہ وہ فلم تھی جسے لتا منگیشکر کی آواز نے جاوداں کر دیا تھا۔ماسٹر غلام حیدر کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔ایس۔مکھر جی کو جا کر لتا منگیشکر سے معافی مانگنی پڑی تب جا کر اُس نے اُن کی فلموں میں پلے بیک دیا۔ 1955 میں فلمستان نے تین فلمیں ریلیز کیں۔یہ تھیں۔''منیم جی'' ''بھگوتی مہما'' اور ''آب حیات''۔مشہور پرڈیوسر ڈائرکٹر اور رائٹر ناصر حسین فلمستان کی ہی دین ہے۔یہ ششا دھر مکھر جی ہی تھے جس نے ناصر حسین کو کئی ساری کامیاب فلمیں لکھنے کا موقع دیا۔جیسے فلم ''انارکلی'' ''منیم جی'' ''پینگ گیسٹ'' وغیرہ۔اُنہیں ڈائرکٹر بنانے میں بھی ایس مکھر جی کا ہی ہاتھ تھا۔

1956 میں ایس مکھر جی نے فلمستان کے بینر تلے پھر سے تین فلمیں پیش کیں۔''درگیش نندنی'' ''ہم سب چور ہیں'' اور ''ہیر''۔1957 میں ''پینگ گیسٹ'' ''چمپا کلی'' اور ''تم سا نہیں دیکھا''۔اس فلم کی ہدایت کاری ناصر حسین کو سونپی گئی تھی۔وہ اس فلم میں ہیرو کے طور پر دیوآنند کو لینا چاہتا تھا۔دیوآنند کو یہ فلم کرنے میں کوئی دقت نہ تھی مگر ڈیٹس کی پرابلم تھی۔ناصر حسین کافی مایوس اور دل برداشتہ ہوتا جا رہا تھا۔تبھی ایک دن ایس مکھر جی نے اُسے ایک سجھاؤ دیا۔''تم شمی کپور کو ٹرائی کیوں نہیں کرتے۔''شمی کپور کی امیج اُس زمانے میں ایک سی گریڈ ہیرو کی تھی جو کسی بھی زاویے سے رومانٹک ہیرو نہیں لگ رہا تھا۔جب ناصر حسین نے اپنے خدشات ظاہر کئے تو ایس مکھر جی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔''تم جا کر شمی سے ملو۔اُسے تمام زاویے سے دیکھو پرکھو۔ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے اس سبجکٹ میں فٹ بیٹھے۔''ناصر حسین نے اپنے محسن کی صلاح مان کر شمی کپور سے کئی ملاقاتیں کیں۔اُن دنوں شمی کپور مونچھ رکھ لیا کرتا تھا۔ناصر حسین نے اُسے مونچھ صاف کرنے کے لئے کہا۔جب وہ مونچھ منڈھوا کے آ گیا تو وہ ایکدم مختلف لگ رہا تھا۔فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' نے شمی کپور کو ایک نئی امیج اور نئی زندگی دی۔وہ اس فلم کے بعد اسٹار بن گیا۔

1957 میں فلمستان کی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔ایک دیوآنند اور نوتن کی مشہور فلم ''پینگ گیسٹ'' تھی اور دوسری تھی فلم ''چمپا کلی''۔ششا دھر مکھر جی نے

سن 1950 میں اندھیری میں امبولی کے پاس ایک جگہ خرید لی تھی جہاں اُس نے اپنی فلم کمپنی ''فلمالیہ پکچرس'' کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ یہاں اُس زمانے میں پہلا ایکٹنگ اسکول کھولا گیا تھا جہاں پر اداکاروں کو ایکٹنگ کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ ''فلمالیہ کے بینر تلے'' ایس مکھر جی نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں جن میں ''لوان شملہ'' ''دل دے کے دیکھو'' ''ایک مسافر ایک حسینہ'' اور ''لیڈر'' قابل ذکر ہیں۔ ''لیڈر'' ایس مکھر جی کی آخری فلم تھی۔ اُس نے کئی اداکار فلم انڈسٹری کو دیئے، جیسے آشا پاریکھ، سادھنا، جائے مکھر جی اور سائرہ بانو۔ آشا پاریکھ ناصر حسین کی ہدایت میں بننے والی فلمالیہ کی رومانٹک فلم ''دل دے کے دیکھو'' سے ایسی چھا گئی کہ کئی دہائیوں تک وہ فلمی جگت پر راج کرتی رہی۔ اسی طرح سادھنا اور سائرہ بانو بھی کامیاب ایکٹرسز بن گئیں۔

ایس مکھر جی نے اپنے پورے خاندان کو اس بزنس میں ڈال دیا۔ رونو مکھر جی، جائے مکھر جی، شومو مکھر جی اور دیب مکھر جی اُنکے بیٹے ہیں۔ جائے مکھر جی اپنے دور کا کامیاب ترین ہیرو رہا ہے۔ شومو مکھر جی نے ہدایت کاری میں قسمت آزمائی مگر وہ کامیاب نہ رہا۔ اُس نے اُس زمانے کی مشہور ہیروئن تنوجہ سے شادی کی جس سے دو بیٹیاں ہوئیں۔ ایک اس دور کی سب سے کامیاب اور غضب کی اداکارہ کاجول ہے۔ ایس مکھر جی کے دو بھائی تھے۔ سبودھ مکھر جی اور پربودھ مکھر جی۔ سبودھ مکھر جی نے کئی کامیاب فلموں کی ہدایت کاری کی۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی ایس مکھر جی کے ساتھ مل کر کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔ وہ ایک ذہین ہدایت کار تھا اور اُسے کہانی بیان کرنے کا خاصا ہنر تھا۔ اُسنے 1955 میں فلم ''نیم جی'' کی ہدایت دی جو کہ باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔ 1959 میں اُس نے فلم ''پینگ گیسٹ'' بنائی جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ 1959 میں ''لو میرج'' اور 1961 میں ''جنگلی'' پیش کر کے اُسنے اپنا نام کامیاب ہدایت کاروں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایس مکھر جی کے نسیم بانو سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اُنہی کے کہنے پر ایس مکھر جی نے اُنکی بیٹی سائرہ بانو کو پہلی بار شمی کپور کے ساتھ پردہ سیمیں پر پیش کیا۔ اس فلم میں پہلی بار کشمیر کے قدرتی مناظر کو کلر میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم کے بعد کشمیر ہر فلمساز کی محبوب لوکیشن بن کر رہ گئی۔

ایس مکھر جی ایک بھرپور زندگی جیا۔ اُسنے وہ سب کچھ پالیا جسکی ہر انسان تمنا کرتا ہے۔ اُس نے اپنی زندگی میں ہی فلمالیہ کا سودا کر دیا۔ اب وہاں نام کا اسٹوڈیو رہ گیا ہے۔ وہاں پر ایک بہت بڑا شاپنگ مال معرض وجود میں آچکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُنکے آخری ایام بڑے دکھدائی رہے ہیں۔ وہ مرنے سے قبل الگ تھلگ رہنے لگے تھے۔ اُن کے پاس اتنا پیسہ آچکا تھا کہ گھر کا کوئی بھی فرد اُنکے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو وہ چیخنے چلانے لگتے تھے۔ اُنہیں لگتا تھا کہ وہ اُن کو مارنے آئے ہیں۔ اب اُنکی تیسری پیڑھی بھی اس بزنس میں اُتر چکی ہے۔ دیب مکھر جی کا بیٹا آین مکھر جی اور رونو مکھر جی کا بیٹا سدھارتھ بھی فلمی ہدایت کاری کے پیشے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اُنکی ایک دو فلمیں اب تک ریلیز ہو چکی ہیں۔ مشہور اداکارہ رانی مکھر جی بھی ایس مکھر جی کے ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

☆

کلیاں بہار کی

کرشن گوتم کی گلشنِ سیر کے دوران جب سبد قرطاس پر ''کلیاں بہار کی'' پیش کی گئیں تو ہر کلی نے یوں نغمگی کے ساتھ صبح کا سلام بھیجا کہ نسیمِ صبح نظم کا ترنم ہوگئی۔ کرشن گوتم کی خوبصورت نظم ''صبح کا سلام'' ایک عمدہ تخلیق ہے جس سے قاری اور سامع کی توجہ ایک پل کے لیے بھی ہٹنے نہیں پاتی کیونکہ اس کا داخلی عمل تسلسل کے ساتھ احساسات کے رنگوں سے ذہن کے اسکرین پر نئے نئے رنگیں پیکر اُبھارتا اور مٹاتا جاتا ہے اور اس تاثیر کے تاثر سے جذبات میں ہلچل کبھی تیز تو کبھی سُست پیدا ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ تمام وادارتِ قلبی جو کبھی جمالی کبھی جلالی اور کبھی سماجی کیفیات کے حامل ہیں جب اخلاقی اقدار سے ہمکنار ہوتے ہیں تو زندگی کے نیلگوں آسمان پر قوسِ قزح بن کر نمودار ہوتے ہیں اور اسی کو بڑی شاعری کہتے ہیں۔۔۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی

(دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، قیمت: دوسو روپے)

روحِ عرفاں

میرے لیے یہ انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ جناب کرشن گوتم نے اپنے روحانی مرشد کے لیے والہانہ محبت وعقیدت میں نظمیں کہی ہیں اور اس بات کی مزید خوشی ہے کہ یہ ایک کتابی شکل میں منظر عام پر آرہی ہیں۔ میں نے مسودے کو اس کی آخری شکل میں دیکھا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ یہ نگارشات انسانی فلسفہ اور گہرے غور وفکر سے لبریز ہیں۔ یہ دلوں کو نئی حرارت دینے والی اور حیران کن حد تک روح کو تازگی بخشنے اور اخلاقی بلندیوں پر لیجانے والی نظمیں ہیں۔

مجھے یقین ہے جناب گوتم کی روحانی شاعری کثرت سے لوگوں کی روحوں کو شادکام کرے گی اور پہلے زمانے کی عظیم شخصیتوں کی نغمگی میں دھڑکنے کے لیے گرماتی رہے گی۔

جمیل محمد قریشی

(دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، قیمت: ایک سو پچاس روپے)

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید، تسلیمات۔

چہارسو کا پارسل موصول ہوا۔شکریہ اس عنایت کا ۔ گوشہ بہت دھانسو ہے، آپ کے اعلیٰ ذوق اور ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ گوشے ہمارے ہاں بھی نکلتے ہیں مگر اس قدر بھرپور اور مدیر کے شوق کا آئینہ دار نہیں ہوتے شاید آئندہ ہونے لگیں۔ اپنا ہی انٹرویو پڑھ کر مجھے بہت لطف آیا۔ آپ نے بڑی محنت اور محبت سے مجھے پاکستان میں مشہور کر دیا۔ جس کے لیے ایک بار پھر شکریہ قبول کیجیے۔ مجھے فخر زمان صاحب نے لاہور انٹرنیشنل بیس کانفرنس میں مدعو کیا تھا۔ میں نے پاسپورٹ کی سکین کاپی ان کو بھیجی تھی کہ ویزا کی کاروائی کریں لیکن پھر ان کا کوئی میل موصول نہیں ہوا۔ اس طرح میں کانفرنس میں شریک نہیں ہوسکا ورنہ آپ اور دیگر ادبی دوستوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا۔

شموئل احمد (بہار، بھارت)

گلزار جاوید، اسلام علیکم! خوش رہو، سلامت رہو۔

''چہارسُو'' بڑی باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے۔ یہ دیکھ کر زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ جس رفتار سے ہمارے ہاں شاعری ہو رہی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری فل ٹائم جاب ہے۔ کیونکہ آمد کسی بھی وقت ہوسکتی ہے۔ البتہ افسانہ لکھنے کیلئے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی سے لے کر اظہر جاوید تک بہت سے نام ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے شعر و سخن کی محفل بھی بڑی آب و تاب سے سجائے رکھی اور افسانے کے فنی رموز پر بھی انہیں مکمل دسترس حاصل تھی۔

''چہارسُو'' کے علاوہ ادب کے دیگر ممتاز جرائد اور رسائل مجھے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ میرے کرم فرما یہ تمام رسائل کیونکہ مجھے اعزازی طور پر بھیجتے ہیں اس لیے بھی میں نے ان کے زرِ سالانہ پر توجہ دینے کی کبھی زحمت ہی نہیں کی۔ مگر اس بار جب ''چہارسُو'' کے پہلے صفحے پر درج زرِ سالانہ پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ اب تک میں نے کوئی ایسا ادبی جریدہ نہیں دیکھا جس پر زرِ سالانہ ایسے منفرد ادبی اور شاعرانہ انداز میں درج کیا گیا ہو۔

پرنٹنگ اور کاغذ کے اخراجات تو دور کی بات ہے اکثر رسائل کا یہ شکوہ بالکل بجا ہوتا ہے کہ ڈاک خرچ خوفناک حد تک بڑھا دیا گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہوش ربا مہنگائی کے اس دور میں ادبی رسائل شائع کرنا اور پھر ان کی ترسیل کے مراحل سے گزرنا، ادب کے ساتھ دلی وابستگی اور خلوص کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ زرِ سالانہ کے حساب میں بھی ''چہارسُو'' اخلاص کے جس مقام و مرتبے پر ہے وہ شاید کسی اور کو حاصل نہیں۔

آپ اور آپ کے تمام احباب کو میری جانب سے نیا سال مبارک ہو۔

آپ کے مزید افسانے پڑھنے کی منتظر رہوں گی

اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف بخشے (آمین)

بانو آپا (لاہور)

میرے بھائی گل و گلزار، جیتے رہو۔

ہر بار چہارسو پا کر جس قدر خوشی ہوتی ہے اُسی قدر حیرانی سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ آپ کہاں کہاں سے ادبی گوہر ڈھونڈ کر چہارسو کی زینت بناتے ہیں۔ جناب شموئل احمد بڑے فکشن نگاروں کی صف کے نمایاں قلم کار ہیں جس کا ثبوت براہ راست میں آپ کے سوالات کے بلیغ جوابات دے کر شموئل صاحب نے فراہم کیا ہے۔ اُن کا افسانہ ''سنگھاردان'' شاہکار افسانوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح منٹو اور بیدی کا تجزیہ بھی ایک بڑے قلمکار کی بلند نگاہی کا آئینہ دار ہے۔ شموئل صاحب پر لکھے گئے تمام مضامین بہت خوب ہیں بطور خاص ''علمِ نجوم کی معنویت'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ شموئل صاحب کے شانے سے شانہ ملائے اس بار محترمہ عذرا اصغر، جناب ناصر بغدادی، جناب یسٰین احمد، جناب تشنہ بریلوی، سید سعید نقوی کے ساتھ آپ بھی نمایاں تر نظر آئے۔ یوں تو اوپر مذکور سبھی اہلِ قلم نے اپنی تخلیقات سے خوب خوب انصاف برتا ہے مگر آپ نے تو دل میں اُتر کر ایسا درد دیا ہے جو نا معلوم کب اور کس طرح رفع ہوگا۔

ڈاکٹر فیروز عالم ماہر قلمکار کی طرح کبھی ہنساتے ہیں، کبھی رُلاتے ہیں اور کبھی گدگداتے ہیں۔ ''رشید مر گیا'' کی تفصیل پڑھ کر کافی دیر دل کی دھڑکن کا زیر و بم بحال نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر صاحب کی یادداشت کی داد دینا پڑتی ہے کہ کس طرح ایک ایک واقعہ ذہن کے پردے سے اتار کر چہارسو کے اوراق کی زینت بنا رہے ہیں۔ مسعود مفتی صاحب کی شہرت بطور افسانہ نگار تو تھی ہی مگر اس بار آپ کے ادبی پیر و مرشد سید ضمیر جعفری کے یادگاری ٹکٹ کے حوالے سے اُن کی تحریر نے دل کو خوب گرمایا۔ یعقوب نظامی صاحب کا مضمون بھی دلچسپ ہونے کے ساتھ معلوماتی بھی ہے۔ دیپک کنول نے ایک صدی کے قصہ میں محمد رفیع کا یادگار قصہ رقم کر کے اس صدا بہار گلوکار کو ایک بار پھر سے اُمر کر دیا ہے۔

محمود شام جیسے بلند قامت شاعر اور ادیب نے ''تیری جنت کا نظارہ'' جس محبت اور اپنائیت سے تحریر کیا ہے اُس سے اُن کی انسان دوستی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں دونوں طرف کے امن پسند لوگوں کو شام صاحب کی پیروی میں آگے بڑھ کر امن کا پرچم بلند کرنا چاہیے۔

شعری حصہ بھی بہت خوب ہے۔ پروفیسر زہیر کنجاہی صاحب کے قلم کی بے کرانی:

میری آنکھوں میں پانی دیکھ مائے　　پسر کی خوں گرانی دیکھ مائے
میرے لفظوں میں میرا حال پڑھ لے　　مری یہ نوحہ خوانی دیکھ مائے

اور سیفی سرونجی نے بھی کمال کیا ہے:

کہاں سے لاؤں میں دلچسپیاں کہانی میں
سکون کس کو ملا ہے حیاتِ فانی میں

مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دیگر احبابِ قلم نے کمال نہ دکھایا ہو۔ خیال آفاقی صاحب کیا ستم ڈھا گئے ہیں:

سمٹ کے بیٹھیں کسی اور کو بھی آنے دیں
یہ رسم بھی نہ رہی آج ہم نشینوں میں

اور آخر میں پروفیسر صدیق شاہد کا ذکر لازم ہے:

گرہ دلوں میں پڑے تو بڑی مسافت ہے
جو دل ملے تو قدم بھر کا فاصلہ بھی نہیں

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسُو' بلاناغہ پنڈی سے نیویارک کا مہنگا سفر کر رہا ہے۔ شموئل صاحب کے افسانے بے قاعدگی سے پڑھتے تھے ان کا کوئی مجموعہ میرے پاس نہیں تھا۔ آپ کے حوالے سے ان کی ذات اور فن سے ذرا بہتر واقفیت ہوگئی۔ کہانی اور بنت اور استعاروں کے استعمال میں ایک بہترین مصور ہیں، ان کی کہانیوں کا کرافٹ بہت عمدہ ہے۔ دیکھئے ''مصری کی ڈلی'' کا یہ فقرہ کہ ''عثمان نے چاول کا نوالہ بنایا اور کانٹا اس کے ساتھ ہی نگل گیا' اس کانٹا نگلنے میں جو معنویت ہے وہی شموئل کی خوبی ہے۔ مزید یہ کہ عموماً افسانے کا پہلا فقرہ ہی جکڑ لیتا ہے۔ ''فسادات میں رنڈیاں بھی لوٹی گئی تھیں''، جنسی تحریک بیان کرنے کے لیے یہ جملہ دیکھئے ''ایک دن جب رینگتی چیونٹیاں اس کے گرد جال بن رہی تھیں''، جنسی رویوں کے پس منظر میں لکھنا کار دشوار ہے کہ بہت سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، ذرا سامنے آئے اور بے بھاؤ کی سننی پڑیں۔

براہِ راست ایک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے سوال پوچھنے والے کی ذہانت اور چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دفعہ لکھنے والے کی فکر، ذاتی احوال اور ادبی رویوں کو کھوج کر نکالے۔ وہاب اشرفی صاحب کا مضمون بہت اچھا تھا۔ منٹو کے افسانوں کی عورت ایک پرانا مضمون ہے جس پر اور بھی لوگ لکھ چکے ہیں۔ اس وقت شہلا نقوی کا مضمون یاد آ رہا ہے جو غالباً دنیا زاد میں شائع ہوا تھا۔ ارتقا کے عنوان سے غالب عرفان کا قطعہ بہت پسند آیا۔ دیدۂ تر ایک اچھی کہانی ہے جس میں ایک سے زیادہ عصری تضادات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ انسانی طمع و حرص اور پھر ایک بہت اہم پہلو نسلوں کے عمودی تسلسل اور دیکھ بھال کا ذکر۔ اس میں جو جذبے، وفاداریاں اور روایات کارفرما ہیں۔ انہیں سمجھنے کا یہاں آنے کے بعد بہتر ادارک ہوا۔ مغرب میں بوڑھوں کی بڑی اکثریت یا تنہا رہتی ہے یا کسی قسم کی اجتماعی رہائش گاہوں میں۔ اس افسانے میں آپ نے جس مسئلے پر قلم اٹھایا ہے اسے یہاں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ الفاظ بہنوئی کے تھے مگر خواہش ساجدہ باجی کی تھی۔ اس قسم کے بظاہر بے ضرر اور رواں جملوں میں خاندانی سیاستیں اور مصلحتیں خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔

''ہوا کے دوش پر'' ہمیشہ مجھے حیدرآباد اور لیاقت میڈیکل کالج کی راہداریوں میں پہنچا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے عرصہ ہوا فون پر رابطہ نہیں ہوا، ان کو مبارک ہو کہ قاری کی دلچسپی کم نہیں ہونے دیتے، اور یہی لکھنے والے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ عبداللہ جاوید ایک حساس قلمکار ہیں۔ کینیڈا میں رہ کر بھی ان کا ذہن سانحہ راولپنڈی پر ماتم کیے بنا نہ رہ سکا۔ جس خوبی سے انہوں نے اس نظم میں اپنے محسوسات کو رقم کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ بلاشبہ وہ عصر حاضر کے ایک بلند پایہ شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مترجم اور مفکر ہیں۔ اسی اذیت میں مبتلا نوید سروش نے نظم خوشبو کے اس پار کہی ہے۔ ادب اگر اپنے زمانے سے پیوست نہیں تو کس کام کا؟ لیکن ہمارے حال کا نوحہ ہونے کے باوجود نوید نے یہ نظم اس خوبصورتی سے کہی ہے کہ یہ صرف ہمارا خبرنامہ نہیں بلکہ ہر زمانے میں پڑھی جا سکتی ہے۔ محمود شام کے سفرنامے نے مزا دیا۔ اشعار کا انتخاب ان کے ذوق کا آئینہ ہے۔ خوشبیر سنگھ کا کیا خوبصورت شعر داخل مضمون کیا ہے:

آج اپنی شاخوں کو پھر شجر نے سمجھایا
معتبر نہیں ہوتی دوستی پرندوں کی

سید سعید نقوی (نیویارک)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

جنوری۔فروری 2014ء کے ''چہارسُو'' کی وصولیابی کی اطلاع تو میں نے آپ کو ایس ایم ایس کے ذریعے بروقت دے دی تھی لیکن میں بوجوہ اسے دیکھ نہ پایا تھا تا آں کہ محمود شام صاحب نے (جو میرے گھر پر منعقد ہونے والی سالانہ ادبی تقریب کے شعری حصے کے ''پیٹرنٹ'' صدر ہیں) مجھے بتایا کہ ''چہارسُو'' کے گزشتہ شمارے میں شایع شدہ میرے مضمون کے بارے میں تین خطوط حالیہ اشاعت میں شامل ہیں۔ یہ اطلاع اپنی جگہ، وہاں ادب کے حوالے سے جو معتبر ہستیاں شریک محفل تھیں ان سب نے اردو ادب کے فروغ میں آپ کی بے لوث کوششوں کو سراہا۔

تقریب کے اگلے دن میں نے مذکورہ بالا شمارے کو پڑھنا شروع کیا۔ اس بار ''قرطاس اعزاز'' کا سہرا ہندوستانی ادیب شموئل احمد کے سر بندھا۔ ''آئینۂ تمثال'' میں جناب محمد انعام الحق نے نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ قارئین سے صاحب اعزاز کا تعارف کرایا ہے۔ شموئل احمد پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ اس مناسبت سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ''بھارتی انور سدید''

ہیں۔(سدید صاحب بھی انجینئر ہیں۔) ''سنگھار دان'' واقعی ایسا شاندار اور جاندار افسانہ ہے کہ شموئل احمد صاحب کی شناخت کہلائے جانے کا مستحق ہے۔اس کے پلاٹ اور کردار نگاری میں غضب کی برجستگی ہے۔''براہِ راست'' کے تحت آپ نے (حسب معمول) انہیں خوب کریدا اور ان کے اپنے فن کے علاوہ بحیثیت مجموعی اردو کے افسانوی ادب کے ہر گوشے پر ان کے خیالات اور نظریات حاصل کیے۔یقیناً آپ نے ان کی تخلیقات کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا۔دیگر افسانوں میں ''وقت تتلی تھا'' (عذرا اصغر)، ''دشمن کا سلام'' (تشنہ بریلوی) اور ''پیچاک'' (شاہد جمیل) بہت پسند آئے۔آپ کا ''دیدہ تر'' بھی بہت خوب ہے...لیکن جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ کرداروں کی بہتات نے اس کے مجموعی تاثر کو زَک پہنچائی ہے۔

''ہوا کے دوش پر'' (ڈاکٹر فیروز عالم) حسب سابق دلچسپ اور متاثر کن ہے۔مصنف کے قلم کی تازگی قابل رشک ہے۔ایک ڈاکٹر اپنی سوانح اتنے سلیقے سے لکھ سکتا ہے، بظاہر ایک انہونی سی بات لگتی ہے۔دوسری طرف محمود شام صاحب نے ''تیری جنت کا نظارہ'' میں چندی گڑھ ادبی میلے کی بذریعہ قلم جو عکس کشی کی ہے اس کا جواب نہیں۔اس رپورتاژ میں ہندوستان کے ایک اردو ایڈیٹر کا کہا گیا یہ جملہ بہت فکر انگیز ہے کہ ''ہمارے پڑھنے والے بھی 70 سے اوپر ہیں، کام کرنے والے بھی۔ایک پڑھنے والا گزرتا ہے تو ہماری ایک کاپی گھٹ جاتی ہے۔'' اس سے وہاں کی اردو صحافت کی زبوں حالی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول نے محمد رفیع کے فن اور شخصیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ رفیع (مرحوم) کے گیتوں کی طرح مسحور کن ہے۔میں ''چہارسُو'' میں دیپک کنول کے مضامین بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ضمیر جعفری یادگاری ٹکٹ کے حوالے سے مسعود مفتی صاحب کا مضمون معلومات افزا ہے لیکن اس میں جعفری صاحب کے جو اشعار دیے گئے ہیں ان کا تعلق مصنف بہت کوشش کے باوجود بھی یادگاری ٹکٹ کے اجرا سے نہ جوڑ سکے۔پھر ان کا یہ موقف بھی محل نظر ہے کہ ''جو نصف صدی پر محیط ریاستی استبداد کو چیلنج کرنے والے اصل ہیروز ہیں انہیں (ہم) کبھی تو کوڑے مارتے ہیں اور کبھی لاپتا افراد کے بلیک ہول میں گم کر دیتے ہیں۔'' کاش مفتی صاحب ایسے ایک بھی ہیرو کا نام اس مضمون میں بطور ثبوت لکھ دیتے۔حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ہیروز کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔وقتی نشیب و فراز (جو ہر کسی کی زندگی میں آتے ہیں) سے قطع نظر فیضؔ، فرازؔ، جالبؔ، فہمیدہ ریاض جیسی قد آور شخصیات کی (جنہوں نے واقعی ریاستی استبداد کو چیلنج کیا تھا) کبھی بھی کوڑوں سے ''تواضع'' نہیں ہوئی بلکہ فرازؔ کو تو تسلیم کرنا پڑا:

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کے نام رکھ دیے

میجر شفقت بلوچ، اسکواڈرن لیڈر ایم عالم اور نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام (جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے) پوری پاکستانی قوم کے رول ماڈل ہیں۔کس کی جرات تھی کہ انہیں کوڑے مارتا یا لاپتا افراد کے بلیک ہول ''میں ڈالتا۔خود ضمیر جعفری یادگاری ٹکٹ کا اجرا اس امر کا غماز ہے کہ ہم (قومی سطح پر) ناقدرے نہیں۔مسعود مفتی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ قبل ازیں محکمہ ڈاک اقبالؔ، فیضؔ، شہاب، ناصر کاظمی اور ابن انشا کے یادگاری ٹکٹ جاری کر چکا ہے۔ریاستی جبر کا حوالہ ضمیر جعفری کے تعلق سے یوں بھی غیر منطقی ہے کہ جعفری صاحب ہر دور اور ہر مکتب فکر کے پسندیدہ شاعر تھے۔انہوں نے خود کو ''مزاحمتی ادب'' کے خول میں رکھنا گوارا نہیں کیا۔

میرا مضمون ''پیشگی معذرت کے ساتھ'' آپ کے دو قارئین (سلیم ناز صاحب اور نجیب عمر صاحب) کو پسند آیا جس کے لیے میں ان کا ممنون بلکہ ''ممنون حسین'' ہوں جبکہ ایک (سید نصرت بخاری صاحب) اسے پڑھ کر بھڑک اٹھے اور سخت ترین الفاظ میں اسے مسترد کیا۔بقول ان کے ''انہوں (مصنف) نے شعر کی ظاہری صورت کو تختۂ مشق بنایا، وہ باطنی مفہوم کو سمجھنے سے قاصر نظر آئے۔'' میں بخاری صاحب کی رائے کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔تاہم، بدقسمتی سے وہ اسے تنقیدی مضمون سمجھ بیٹھے جبکہ یہ ایک مزاحیہ مضمون تھا۔میں نے بے شک اس کی بنیاد اشعار کی ظاہری صورت پر رکھی تھی لیکن بہتر ہوتا کہ بخاری صاحب ہر شعر کا ''باطنی مفہوم'' لکھ کر اپنے استدلال کو تقویت دیتے۔وہ قارئین ''چہارسُو'' کی دلچسپی اور مجھ ناچیز کی رہنمائی کے لیے اب بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ویسے میں ضمناً عرض کر دوں کہ زیر بحث مضمون کے بارے میں پروفیسر انور مسعود صاحب نے اپنے ایک خط (مورخہ 9 جنوری 2014ء) میں مجھے لکھا ''مافوق الفطرت اور سہیلی بوجھ پہیلی جیسے اشعار کے بارے میں آپ کا مضمون میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

گل وگل زارِ گلشن ادب چہارسو ہمیشہ آباد رہیں، السلام علیکم۔

تازہ چہارسو حسبِ سابق بے مثال ہے۔اس کی شعری اور نثری جہتیں آئینۂ اختصاصی ہیں۔میری غزل کے دو مصرعے غلط کمپوز ہو گئے ایک مصرع ہے:

''بچھا کر اپنے مُہرے کھیل کا آغاز کرتا ہے''

یہاں مُہرے (م ہ رے) کی جگہ (صبر کے) شائع ہوا ہے۔ایک مصرع میں لفظ مدارا تیں (م دارات ے ں) غلط ہو گیا ہے۔میں جانتا ہوں ایسا میری بدخطی کی وجہ سے ہوا ہے اور تو کوئی جھگڑا نہیں مگر یوں ''عدم موزونیت'' وارد ہو جاتا ہے۔دیپک کنول نے محمد رفیع کو خوب خوب لیا ہے۔لتا جی کے باب میں قلم ذرا رپٹ گیا ہے۔آپ جانیں لتا جی کا مرتبہ خاصا بلند ہے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک بار لکھا تھا ''اردو کی جتنی خدمت لتا نے کی ہے اتنی کسی اور نے نہیں کی''۔میں نے پنجابی نظم ''لتا جی'' لکھی تھی جو اظہر جاوید مرحوم کے رسالے تخلیق میں شائع ہوئی تھی۔بہرِ نوع دیپک کنول اپنا کام کر رہے ہیں۔فلم کے بڑوں کو اجاگر کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی نے ردیف ''مائے'' کا حق ادا کر دیا ہے۔ ''مائے'' دو راز کار سہی مگر محبت کا کرشمہ ہے۔ ہم پینڈو ''مائے'' کے والی وشیدا ہیں۔ اس پر مرتے ہیں۔ زہیر کنجاہی کی غزل سے یہ لگاوٹ ٹپکی پڑتی ہے میں ان کا شکر گزار ہوں انہوں نے میرے حوالے سے اپنی پیاری غزل پیش کی ہے۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

جناب گلزار جاوید، آداب

اس دفعہ قرطاسِ اعزاز میں جناب شموئل احمد کے بارے میں سیر حاصل معلومات جاننے کو ملیں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ کسی معروف یا کم معروف شاعر یا ادیب کے بارے میں ہمیشہ ہی ایک مقالے سے کم نہیں ہوتا ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کے بارے میں کوئی ایم فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پڑھ رہا ہوں جو قابلِ صد تحسین ہے اور صرف اسی پرچے کا اعزاز ہے کسی اور پرچے میں اس طرح سے حصہ شامل نہیں ہوتا۔ اس حصے میں جناب شموئل احمد کو لکھے گئے خطوط، ان پر لکھے گئے مضامین اور ان کے تمام نثر پارے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں ایک صاحبِ طرز ادیب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

گوشہ ''آگہی کی روشنی'' میں شامل حمد اور نعت خوب ہے۔ جناب نسیم سحر کی نعت خوبصورت نعت ہے جو رسولِ خدا سے ان کی دلی عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔ ان کی نعت پڑھ کر جناب رام ریاض مرحوم کی نعت یاد آتی ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

جو بھی شیریں سُخنی ہے، میرے مکّی مدنی
تیرے ہونٹوں کی چھنی ہے، میرے مکّی مدنی
صنعتِ نعت میں الفاظ کے ہیروں کی تلاش
ہُنرِ کان کنی ہے، میرے مکّی مدنی

پرچے میں موجود افسانوں کے مطالعہ سے یقینی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ معیاری افسانہ لکھنے والے ابھی موجود ہیں۔ جو بے راستہ دشت میں بھی چوراہے بتانے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ خاص طور پر آپ کا افسانہ جدید لب ولہجہ میں لکھا ہوا عمدہ افسانہ ہے۔ گوشہ غزل کے پہلے حصّے ''انتہائے ملال'' میں نصرت زیدی کی غزل کا ایک مصرعہ ''پھر غم ہم ہر کمال پر بھی ہنسے'' بے وزن ہے شاید کمپوزنگ کا کوئی مسئلہ ہو۔ محترم آصف ثاقب کی غزل جو مفاعلین 4x کی بحر میں لکھی گئی ہے اس کا ایک مصرعہ۔ ''بچھا کر اپنے صبر کے کھیل کا آغاز کرنا ہے'' خارج از بحر ہے۔ رؤف خیر کی طرحی غزل شامل ہے جبکہ جناب غالب عرفان کی غزل بھی طرحی غزل ہی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی غزل کی ردیف نے غزل کے معیار کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے کچھ شعر خوب ہیں۔ میری غزل کے مطلع میں بلحاظ وزن لفظ زندان آنا تھا جبکہ کمپوزر نے نقطے سے صرف نظر کیا ہے جس سے مصرعہ بے وزن ہو گیا۔ محترم نسیم سحر کی غزل بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

گوشہ غزل کے دوسرے حصے ''قلم کی بے کرانی'' میں محترم زہیر کنجاہی کا ایک مصرعہ ''نہیں نظریں چرانی دیکھ مائے'' زبانی اعتبار سے ایک سقم لیے ہوئے ہیں۔ لیکن شاید قافیے کی مجبوری کی وجہ سے ایسا ہوا ہے کیونکہ گرائمر کے اعتبار سے مصدر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ فعل کے ساتھ ''نا'' کا اضافہ کیا جاتا ہے نہ کہ ''نی'' کا۔ پروفیسر صاحب سے معذرت چاہتا ہوں۔ اجیت سنگھ حسرت کا ایک شعر بہت اچھا لگا جو ذیل میں درج ہے۔

ہماری ناؤ گھڑی پل بھی جس جگہ ٹھہرے
وہی جزیرہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے

اگرچہ ناؤ جزیرے پر نہیں ٹھہرتی مگر شعر کے آہنگ نے دل کو چھو لیا ہے۔ تصور اقبال کے آخری شعر کا مصرعہ ثانی بے وزن ہے۔ صابر عظیم آبادی کی غزل میں حرفِ روی غائب ہے۔ شاید انہیں پتہ ہوگا کہ حرفِ روی کو متعین کیے بغیر قافیہ سازی ممکن نہیں۔

گوشہ ''ضبطِ قلم'' بھی خوب رہا۔ جناب نور زمان ناوک کے دوہے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محترم محمود شام کا نثر پارہ ''تیری جنت کا نظارہ'' (چندی گڑھ ادبی میلہ) خوبصورت یادوں کا مرقّع ہے جسے مصنف کے طرزِ تحریر نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اگر اسے ایک مبنی سفر نامہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسے پڑھ کر جناب محمود شام کی یادداشت پر رشک آتا ہے۔

گوشہ ''رس رابطے'' رس گلّوں کی مٹھاس لیے ہوتا ہے۔ محترم نسیمِ سحر، جناب غالب عرفان اور جناب نوید سروش کا تہہِ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

انتظار باقی (جھنگ)

محترمی وکرمی گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اشاعت میں تسلسل وتواتر، معیار برقرار۔ قرطاسِ اعزاز شمارے کی نمایاں خوبی۔ موجودہ شمارہ شموئل احمد کے حوالے سے مرتب کیا گیا ہے۔ بہت معلومات افزا بصیرت انگیز یہ سلسلہ اردو ادب کی تاریخ ترتیب دے رہا ہے۔ اردو زبان وادب کے استاد کے ناتے میری مطالعاتی ترجیح قرطاسِ اعزاز کے مندرجات ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں چہارسو کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ میں نے گذشتہ تمام شمارے نہایت اہتمام سے اپنی لائبریری کے ایک شیلف میں سجائے ہوئے ہیں۔ بوقت ضرورت ان سے استفادہ کرتا ہوں۔ آپ کی عنایت ہے کہ مجھے باقاعدگی سے چہارسو ارسال فرما رہے ہیں۔ سراپا سپاس گزار ہوں۔

غفور شاہ قاسم (لاہور)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی مہربانی کی بدولت ''چہارسو'' ملا آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ۔ رسالہ نہایت شاندار بلکہ جاندار ہے۔ شموئل احمد کا صرف نام سنا تھا ''چہارسو'' کی بدولت ان کے کام سے بھی باخبر ہوئے۔ اُن کا افسانہ ''سنگھاردان'' بہت اچھا تھا۔ ان پر لکھے گئے مضامین نہایت شاندار تھے

خاص کر ڈاکٹر عقیل احمد، پرویز شہریار، وہاب اشرفی کے مضامین بہت معلوماتی اور وقیع مواد سے بھرپور تھے۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی شاندار ہے، میری ناچیز رائے میں ایسا رسالہ ہر گھر اور تعلیمی ادارے میں ضرور ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر بسمینہ سراج (پشاور)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

نئے سال کا قرطاسِ اعزاز جناب شموئل احمد سے موسوم و منسوب ہو کے بہت خوب ہوا۔ براہِ راست میں اُن کے جوابات بہت سچے، کھرے اور انفرادی جرأت مندانہ موقف لئے ہوئے ہیں جس کے باعث اُردو فکشن میں وہ جداگانہ راہ کے علمبردار محسوس ہوتے ہیں۔ ''ابرِ بہار'' اور ''ایسا کہاں سے لاؤں'' کے مکاتیب و تخلیقات سے معاصرین کی آراء کا علم ہوتا ہے جبکہ ''اُس گھڑی کا انتظار'' اُن کی فنی ذات کی دریافت و انکشاف کے حوالے سے نہایت وقیع تحریر ہے۔ ''منٹو اور بیدی'' صاحب کے نسائی کرداروں اور دیگر تحریروں سے اُن کی ہنروارانہ کفایتِ لفظی پہ مبنی افسانوی اسلوب کی تفہیم میں مزید اضافہ ہوتا ہے جبکہ کسی بھی دور کے عظیم تخلیق کاروں سے انسپائر ہونا فطری سی بات ہے اور ایسا مختلف ادوار میں ہوتا چلا آیا ہے کیونکہ انسپریشن کے باوجود قابلِ ستائش پہلو اپنی انوکھی جہت کو اپنائے رکھنا ہے جو آج کل کے تقاضوں، رویّوں، پیچیدہ مسئلوں اور دیگر متنازع عوامل سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو ایسے میں ''علم نجوم کی معنویت'' نے ان کے افسانوں میں الگ سی گہرائی و گیرائی پیدا کر دی ہے۔

افسانوں میں ''وقت تتلی تھا'' تخلیق میں پڑھا جا چکا ہے۔ ''دیدۂ تر'' کے مرکزی کردار (ابرار کے والد) ساجدہ باجی سے اُن کے اپنوں کا دلخراش روّیہ دھیان میں رکھتے ہوئے خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوئے اولڈ ایج ہاؤس کو مستقبل کے لیے محفوظ ترین مقام گردانتے ہیں کہانی کے ساتھ پھیلتا ہوا یہ احساس رنجیدہ خاطر کرتے ہوئے دیدۂ تر کا باعث بنتا ہے۔ ''قلم کی بے کرانی'' سے بالخصوص یہ اشعار پسند آئے۔

تری ہی گفتگو لکھتا رہا ہے
قلم کی بیکرانی دیکھ مائے
مرے لفظوں میں میرا حال پڑھ لے
مری یہ نوحہ خوانی دیکھ مائے

تخلیق کے حالیہ شمارے میں ایوب خاور صاحب کا اپنی موت پہ ایک نظم خود تعزیتی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ''بدلتے زمانوں کی افسانہ نگار'' میں نیلم بشیر کی کہانیوں کے حقیقت پسندانہ تجزیے کے ساتھ آخر میں نایاب مشورے اور عمدہ کوٹیشن سے بھی نوازا ہے۔ چندی گڑھ کا کتاب میلہ دلچسپی سے پڑھا گیا اور حرف آخر کے طور پر محترم محمود شام کی خوبصورت نظم بھی پڑھنے کو ملی۔ ''زینتِ محراب'' نے موجودہ دور میں پاکستان پوسٹ کو دیگر اداروں کو نسبت مثبت زاویۂ نظر سے سنبھالا دیا ہے اور سوچنے والوں کے لیے اندرونِ پاکستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ پاکستان بھی تحسین و توقیر کا امیج قائم و برقرار رکھا ہے۔ ''ایک صدی کا قصّہ'' میں دہائیوں تک سماعتوں کو مسحور و مسحور کرنے والے عظیم گلوکار ہی نہیں عظیم انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت کے روشن پہلوؤں سے آگہی ملی کہ وہ اپنے مقام و مرتبے سے بے نیاز نہایت منکسر المزاج دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والے مونس و غمگسار تھے۔

نصرت بخاری صاحب نے ایم۔فل کے مقالے کے حوالے سے مکتوب نگاری کی تاریخی و تہذیبی اہمیت و وقعت ہی واضح نہیں کی بلکہ بلاشبہ چہارسو کی جامعیت و افادیت کی جانب بھی ریسرچرز کی توجہ مبذول کروائی ہے تاکہ مقالہ جاتی سطح پہ بھی اس گوہر نایاب سے استفادہ کیا جا سکے۔ انتظار باقی صاحب کی شعری نشاندہی کا بھی بہت شکریہ۔

محترمہ نیلوفر عباسی سے گذارش ہے کہ وہ قلم و قرطاس سے رابطہ ہمیشہ استوار رکھیں کہ عباسی صاحب کی خوشی و خواہش کے احترام کے تسلسل کے ساتھ وہ خود بھی آسودہ خاطر رہیں گی۔ بیک ٹائٹل بھی معززین کی آراء کے ساتھ، مختلف تخلیقی جہتوں سے ''چند سیپیاں سمندروں سے لئے ہوئے'' کشش آمیز محسوس ہوا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

ماہنامہ ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۴ء وصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح ہر صفحے پر اس بار بھی آپ کی محنت صاف نظر آ رہی ہے۔ مگر ایک نقطہ جس کی طرف آپ کی اور تمام ادبی رسائل کے میدان کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اکثر لکھاری ایک ہی مسودہ کو بیک وقت مختلف ادبی رسائل کو بھیجوا دیتے ہیں جو کہ اخلاقی طور پر غلط ہے ہر ادبی رسالہ اس بات کا دعویدار ہے کہ وہ تازہ تحریریں شائع کرتا ہے۔

بے شمار ادبی رسائل کے بیک وقت شائع ہونے پر اکثر چھپی ہوئی تحریریں مدیر کی نظروں سے اوجھل ہو جاتیں ہیں مگر یہ ذمہ داری سب سے پہلے لکھنے والے لکھاری کی ہے کہ وہ اپنی تحریر کسی دوسرے ادبی رسالے کو بھیجنے سے پہلے تصدیق کر لیں کہ ان کی تحریر پہلے بھیجے گئے رسالے میں شائع ہو رہی ہے یا نہیں۔ بلکہ چند لکھاری دانستہ طور پر اپنی اشاعت شدہ تحریر کو مختلف جگہوں پر بار بار شائع کروانا اور اسی تحریر کو کسی اور فرضی نام سے شائع کروانا فخر سمجھتے ہیں۔

ماہنامہ ''تخلیق'' نے ہمیشہ ایسے لکھاریوں کے اس عمل کی حوصلہ شکنی کی ہے آپ کے جنوری فروری ۲۰۱۴ء کے پرچے میں بھی ایک افسانہ شامل ہے جو چند ماہ پہلے تخلیق میں چھپ چکا ہے اب کون سا افسانہ ہے یہ تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ میں ایسے لکھاریوں کی حوصلہ شکنی کرتا رہوں گا آگے آپ اپنے پرچے کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ ہر پرچے کے معیار اور تحریروں کو شائع کرنے کے حوالے سے ضابطے اور قوانین مختلف ہیں۔ چہارسو جیسے معیاری پرچے میں شائع شدہ تحریر شامل دیکھ کر دکھ ہوا۔

سونان اظہر جاوید (لاہور)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسوُ'' کا تازہ شمارہ نئے سال کے تحفے کی صورت میں موصول کر کے دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر بے پایاں مسرت کا احساس ہوا کہ یہ رسالہ اپنے اندر بے پناہ ادبی محاسن سموئے ہوئے ہے۔ اس کی ہر کہانی اور ہر مضمون اک جہاں معنی اور زبان وادب کی چاشنی سے مالا مال ہیں۔ برصغیر کے نامور افسانہ نگار جناب شموئل احمد کو فنی و شخصی طور پر متعارف کروا کے ہم جیسے قارئین پر اک احسانِ عظیم کیا ہے۔ شموئل احمد کا افسانہ ''آدمی اور مین سوچ'' ڈاکٹر پرویز شہریار کے مضمون ''شموئل احمد کی افسانہ نگاری'' آپ کے افسانہ ''دیدۂ تر'' اور برصغیر کے عظیم گلوکار محمد رفیع پر محترم دیپک کنول کا تحقیقی مضمون بے حد پسند آئے۔

میں ان نامساعد حالات میں ایسا جاندار اور خوبصورت ماہنامہ نکالنے پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور آپ کی تندرستی اور کامرانیوں کے لیے دعا گو بھی ہوں۔

نیرّ اقبال علوی (لاہور)

محترمی جناب گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسوُ'' کا تازہ شمارہ: جنوری فروری ۲۰۱۴ کا ای۔ایڈیشن نظر سے گزرا۔ آپ نے شموئل احمد نمبر شائع کر کے ایک مثال قائم کر دی ہے کہ فنکاروں کو سرحدوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے ایسے فنکار جن کے پرستاروں کی ایک بڑی تعداد دونوں ممالک میں موجود ہے، اسے کسی ایک جغرافیائی حدود کا زندانی نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ شموئل احمد میری نظر میں آج ہندوپاک کے انتہائی مقبول عام افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ اس خصوصی شمارے کی اشاعت کے لیے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پرویز شہریار (نئی دہلی، بھارت)

محترم گلزار بھائی جان، آداب۔

سب سے پہلے میری طرف سے نئے سال کی پیشگی مبارک قبول کیجئے گا۔ تازہ شمارے کی سافٹ کاپی مل گئی۔ انشااللہ ہارڈ کاپی بھی مل ہی جائے گی۔ آپ نے مجھے جو کام اداکاروں کے خاکے لکھنے کا سونپا ہے، میں اُس میں ایسا اُلجھا رہا کہ خط لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پچھلے شمارے میں محترم حامد لطیف صاحب کا خط پڑھا۔ اس خط میں اُنہوں نے اس بات پر ناخوشی کا اظہار کیا تھا کہ میں قابل احترام ہستیوں کا ذکر کرتے وقت صیغہ واحد کا استعمال کر رہا ہوں۔ اسی بات کی طرف غالب عرفان صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ یہ سہو مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ ایسا قصداً نہیں کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ نادانستہ طور ہوا ہے جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ ان عظیم ہستیوں کے لئے میرے دل میں بھی اُتنا ہی احترام ہے جتنا اوروں کے دلوں میں ہے۔ کیا کروں خود کمپوز نہیں کر پاتا ہوں۔ اسلئے اس طرح کی غلطیاں جگہ پاتی ہیں۔

غالب عرفان صاحب کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں کہ وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ اُن کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں کئی اہم باتوں کا ذکر کرنا بھول جاتا ہوں۔ کیا کروں صاحبِ، میرے بھائی نے مجھے جو یہ ذمہ داری سونپی ہے، اسے نبھاتے نبھاتے میری حالت پست ہوگئی ہے۔ مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں یہ میں ہی جانتا ہوں۔ ہر ایک مضمون کے لئے مواد اکھٹا کرنا ایسا ہی ہے جیسے پلکوں سے نمک چننا۔ شاید قارئین کو اندازہ نہیں ہوگا کہ مجھے ایک مضمون کو لکھنے کے لئے کتنی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ کبھی نیٹ سے تو کبھی انڈسٹری کے لوگوں سے مواد اکھٹا کرنا پڑتا ہے۔ نیٹ پر بھی متضاد معلومات درج ہوتی ہیں۔ پران صاحب پر جب مضمون تیار کر رہا تھا تو نیٹ سے معلوم پڑا کہ وہ دلی کے بلی ماراں میں پیدا ہوئے۔ جب اُن کے گھر واوں سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ اُنکی جائے پیدائش ہوشیار پور پنجاب ہے۔ اسی طرح کے۔ آصف صاحب کے بارے میں نیٹ سے اُنکی تعلیمی قابلیت ایم۔اے علی گڑھ بتائی گئی۔ میں اگر اس خاندان کے قریب نہ ہوتا تو میں بھی نیٹ پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ آصف صاحب انگوٹھا چھاپ تھے۔ اب یہ ڈھیر ساری معلومات اکھٹی کرتے کرتے کچھ نہ کچھ چھوٹ ہی جاتا ہے۔ میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا کہ کچھ بھی نہ چھوٹے۔

آخیر میں میں آپ کا دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے جو اہم کام سونپا اس میں میں کسی حد تک سرخرو ہو کے نکلا ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ قارئین ان مضامین کو بڑے چاؤ سے پڑھتے ہیں۔ میرے خیال میں میرے لئے یہی بہت بڑا انعام ہے۔ بس چند ایسے قلم کار حضرات سے اس بات کی شکایت ہے کہ وہ ان مضامین کو شوق سے تو پڑھتے ہیں مگر ان پر اپنی رائے دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ شاید فلم کو ثقافت کا حصہ نہیں سمجھتے ہیں۔ میں اُن کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اگر اُردو زبان اب تک زندہ ہے تو اسے زندہ رکھنے میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اب تک جو حضرات ان مضامین پر رائے زنی کرنا کسر شان سمجھتے تھے وہ آگے سے کھل کر اپنی رائے پیش کر کے میرے حوصلے کو مہمیز کرتے رہیں گے تاکہ میں اُنہیں اسی طرح نگار خانوں کی سیر کراتا رہوں۔

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

برادرم عزیز گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

اس بار قرطاسِ اعزاز جناب شموئل احمد صاحب کے نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ فکشن اور نجوم میں ماہر جناب شموئل احمد کی کچھ تخلیقات میں نے پڑھی ہیں۔ وہ اپنے میدان کے منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ ''سنگھاردان'' جیسی کہانی اُن کا منفرد اُسلوب ہے اور جیسے جناب وہاب اشرفی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس کہانی میں سب باتیں کُھل کر نہیں کہی گئی ہیں جو اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ یہی شموئل صاحب کا طرز بیان ہے۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است

جبکہ اس کے برعکس سعادت حسن منٹو اور بیدی صاحب کا طرزِ بیان ذرا زیادہ تیکھا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قاری کا ایک طبقہ اس کو پسند نہ بھی کرتا ہو۔ جیسے منٹو صاحب نے خود اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر آپ میرے افسانے برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ نا قابلِ برداشت ہے۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔۔۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ درزیوں کا کام ہے''

جناب محمود شام صاحب کا ''چندی گڑھ کا ادبی میلہ'' بہت پسند آیا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے میں خود ہر وقت اُن کے ساتھ گھوم رہا ہوں۔ بدقسمتی سے یہ میلہ چندی گڑھ میں منعقد ہوا اتنے سارے مہمان آئے اور چلے بھی گئے لیکن اس کی بھنک تک نہیں لگی۔ میں محمود شام صاحب کے مضامین جو ''ہندسماچار'' جالندھر میں شائع ہوتے ہیں میں باقاعدہ پڑھتا ہوں اور اسی حوالے سے میں اُن کا فین بھی ہوں۔ میری تقریباً تمام کہانیاں ''ہندسماچار'' میں شائع ہوتی ہیں۔ اگر میری ملاقات اُن سے ہو جاتی تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا۔ معزز مہمانوں کی لسٹ میں چندی گڑھ کے مقامی ادیبوں کے نام بھی ندارد تھے۔ یا کم از کم اُن کا نام مجھے نظر نہیں آیا۔ مجلس فروغِ اردو ادب دوحہ قطر کی سرگرمیاں اور تقریبات کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ جہاں بین الاقوامی ادیب ایک ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں چاہے وہ اردو ادب ایوارڈز ہوں یا متعلقہ تقریبات، میں سمجھتا ہوں قطر کی یہ پہل قدمی باقی خلیجی اور عرب ممالک کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گئی ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

''براہِ راست'' حسبِ معمول کافی معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ آپ کو ڈھیروں مبارکباد۔ جناب ناصر بغدادی کا ''آسمان کا ٹھوکا'' تشنہ بریلوی کا ''دشمن کا سلام'' اور آپ کا شاہکار ''دیدۂ تر'' بہترین تخلیقات ہیں۔ شاعری کے حوالے سے جناب یوگندر پال تشنہ، کرشن گوتم، تصور اقبال وغیرہ کی شاعری بہت خوبصورت ہے۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

برادرِ عزیز جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ مل گیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں سب سے پہلے رس رابطے یعنی مکتوبات پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ جناب انتظار باقی نے میری غزل کے مطلع کے پہلے مصرع کے بارے لکھا ہے کہ وہ بے وزن ہو گیا ہے دراصل مصرعہ کمپوز کرتے وقت ''میں'' کا لفظ رہ گیا تھا جس وجہ سے مصرعہ بے وزن ہو گیا۔ مطلع اور مصرعہ یوں ہے ''عشق پر تیرے میں قربان اے دل'' اور پورا مطلع یوں ہے:

عشق پر تیرے میں قربان اے دل
یہ محبت کا ہے ارماں اے دل

جناب ابراہیم عدیل نے میری غزل پسند کی ہے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ ''چہارسو'' ایک روٹین کے ساتھ مسلسل چھپ رہا ہے اور یہ روٹین خاصی کامیاب ہے اور آپ کے ذریعہ اظہار کی نشاندہی کرتی ہے۔ قرطاس اعزاز میں براہِ راست پڑھا۔ براہِ راست نے بہت متاثر کیا۔ براہِ راست میں آپ سوال ڈھونڈ ڈھونڈ کے لاتے ہیں میرے جیسا نالائق انسان تو شاید ان کے جواب بھی نہ دے سکے۔ یہ شموئل احمد کی ہمّت ہے کہ اُنہوں نے آپ کے سوالوں کے جوابات بھی خوب دیئے ہیں۔

غزلوں اور نظموں میں پروفیسر آصف ثاقب کی غزل، غالب عرفان کی غزل، انتظار باقی کی غزل، تصور اقبال کی غزل، ابراہیم عدیل کی غزل اور فرخندہ شمیم کی نظم ''اے لم یزل خدا'' اچھی لگی۔ مذکورہ غزلوں میں کئی شعر بہت ہی پیارے ہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

افسانے سارے ہی پڑھ ڈالے مگر ناصر بغدادی کا افسانہ ''آسمان کا تھوکا'' اچھا لگا۔ اس افسانے میں ناصر بغدادی نے بتایا ہے کہ انسان اپنی غلطی کی بنا پر کس قدر پریشان اور خاموش رہتا ہے۔ مسعود مفتی نے زینتِ محراب کے عنوان سے سید ضمیر جعفری کے یادگاری ٹکٹ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔ ردیف دیکھ مائے والی غزل کا مقطع بھی ہو گیا تھا مگر آپ کو صرف اس خیال سے نہ بھیجا کہ کافی دیر ہو چکی تھی وہ مقطع کچھ یوں ہے

زہیر خستہ جان ہے تیرے غم میں
میری تُو خستہ جانی دیکھ مائے

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیم۔

''چہارسو'' کا شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۴ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ قرطاس اعزاز میں ہمیشہ ہمارے عہد کے نامور لکھاری، شاعر و ادیب کا مکمل تعارف پیش کیا جاتا ہے جو مجھ جیسے ادب کے طالب علم کے لیے معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ اس مرتبہ شموئل احمد روشنی بکھیر رہے ہیں۔ کہاں سول انجینئرنگ اور کہاں ادب لیکن حساس دل، کھلا ذہن، کھلی آنکھ اور کان رکھنے والا شخص اپنے تاثرات کو فنونِ لطیفہ کی کسی نہ کسی شاخ کو اظہار کا ذریعہ ضرور عطا کرتا ہے۔ انسانی نفسیات کے گرد گھومتا ان کا شاہکار افسانہ ''سنگھادان'' جہاں بیان کی بے باکی قاری کو متاثر کرتی ہے اور افسانہ نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ سطور اور بین السطور کے ذریعہ مکمل ابلاغ ہوتا ہے۔ یہی اس افسانے کا حسن ہے۔ براہِ راست میں آپ نے شموئل احمد سے جس ان دیکھی کہانی کے بابت پوچھا اور صاحب قرطاسِ اعزاز نے جو ماہرانہ جواب دیا وہ قابلِ غور ہے۔ اسی ان دیکھی کہانی کی تلاش کہانی کار کا ہدف ہونا چاہیے۔

عذرا اصغر کا افسانہ ''وقت تتلی تھا'' بلیوں کی نفسیات پر اتنی گہری نظر لیکن طبقاتی کشمکش انسانوں کے ساتھ رہنے والے پالتوؤں میں بھی منتقل ہو جاتی ہے۔ ایک خوبصورت تحریر۔ ناصر بغدادی کا ''آسمان کا تھوکا'' زندگی کی ایک غلطی

ساری زندگی ذلت بٹورنے پر لگا دیتی ہے اور صاحب کردار اپنے کردار کی بلندی سے کسی کی نیّا پار لگا دیتی ہے۔ ساری زندگی کی نفرت اسے اپنے گھر کی عزت بچانے سے باز نہ رکھ سکی۔ یٰسین احمد ایک مستند افسانہ نگار ''بچہ ہے'' میں ساری زندگی جسے ''بچہ'' ہونے کا طعنہ دیتی رہی اس نے بڑا بن کر دکھایا تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ تشنہ بریلوی کا ''دشمن کا سلام'' زندگی میں موجود خوبصورت اتفاقات کس طرح زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ ایک نادانستہ اتفاق نے دو دوستوں کے درمیان موجود خلیج کو کس طرح پاٹ دیتی ہے۔ ابرار مجیب کا ''اُبال'' ساری زندگی پابندی، ٹائم ٹیبل، اصول وقواعد کے تحت زندگی گزارنے والا ایک روز بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ انسانی نفسیات کے گورکھ دھندے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ شاہد جمیل کا ''پیچاک'' معاشرت کی ابتداء کا کلبہ اس افسانے کا بنیادی خیال ہے اور آخری پیراگراف اس کا ماحصل ہے۔

آپ کا افسانہ ''دیدۂ تر'' ہمارے سماج کا کڑوا سچ کہ ہمارے بزرگ ہم پر بوجھ بن جاتے ہیں اور اس بوجھ سے گلوخلاصی بھی اولڈ ایج ہاؤس تک لے جاتی ہے۔ لیکن افسانے کا دلچسپ اختتام کہ کبھی بزرگ خود اولڈ ایج ہاؤس کو ہی عافیت گاہ جانتے ہیں۔ دیپک کنول نے اس مرتبہ برصغیر کے مایہ ناز فنکار محمد رفیع کی یاد تازہ کی۔ شہرت کی بلندی اور دولت وآسائش کے باوجود بھی شراب اور سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا اور نوشاد جیسے باکمال موسیقار نے طلعت محمود کو فقط سگریٹ نوشی کی بنا پر مسترد کیا۔

نجیب عمر (کراچی)

مکرمی ومحترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

یہ آپ کے دلِ مضطر اور نگاہِ شفیقانہ کی شفقت ہے کہ ''چہارسُو'' مسلسل مل جاتا ہے۔ جنوری فروری ۲۰۱۴ء کا چہارسو رنگا رنگ اور معیاری تخلیقات سے مزین ہے۔ قرطاسِ اعزاز کی شخصیت محترم شموئل احمد کے افسانے پڑھ کر اور دیگر مضمون میں اُن کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ وہ ایک بہت ہی منجھے ہوئے اور منفرد افسانہ نگار لگے۔ نفسیات اور جنس کے موضوعات میں انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے انہیں منٹو کا نقال ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ ''آگہی کی روشنی'' میں غالب عرفان کی حمد اور نسیم سحر کی نعت خوب ہے البتہ غالب عرفان کی حمد کا آخری شعر کا مصرعہ ثانی ''جہانِ دیگر کی بزم عرفاں، بھی اس صناعی سے سجی ہے'' بحر سے خارج ہے۔ افسانوں میں عذرا اصغر کا ''وقت تتلی تھا'' ناصر بغدادی کا ''آسمان کا ٹھوکا'' شاہد جمیل کا ''پیچاک'' اور گلزار جاوید کا ''دیدۂ تر'' خوبصورت افسانے ہیں۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔ خطوط کا مطالعہ دلچسپ رہا۔ آصف ثاقب، نسیم سحر، انتظار باقی اور شگفتہ نازلی کے خطوط اہم ہیں۔ ایک عام آدمی کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کی قسط نمبر ۲۱ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے لیاقت میڈیکل کالج کے سال آخر اور امتحانات سے وابستہ یادوں کو روشن کیا ہے۔ رشید غوری کا پانی کی جگہ ائر و پین پینے کا واقعہ نہ بھولنے والا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ اکتوبر ۲۰۱۳ء میں پاکستان تشریف لائے مگر میر پور خاص نہیں آ سکے یقیناً وقت کی کمی کا مسئلہ ہوگا۔۔۔؟ شموئل احمد کو قرطاس اعزاز عطا کر کے آپ نے ایک اور ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے علمی وادبی جرأت مندانہ سوالات کے شموئل احمد صاحب نے کھل کر کسی منافقت کے بغیر جوابات دیے ہیں۔ شموئل صاحب کی یہ بات تو درست ہے کہ ''استاد تخلیقیت پیدا نہیں کر سکتا'' مگر اس سے اتفاق نہیں کہ ''شعر وادب میں استاد کی اہمیت اتنی ہی ہے کہ وہ بحر و وزن اور املا کی غلطیاں درست کرے'' شموئل صاحب کی سعادت حسن منٹو اور اپنے حوالے سے زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ موضوعات اور کیفیات کی تبدیلی کی بات بھی پسند آئی۔ وہاب اشرفی کا مضمون، سنگھاردان، بدلتے رنگ، بہرام کا گھر اور دیگر افسانوں کا تجزیہ مختصر مگر گہرائی سے کیا ہے۔ شیخ عقیل احمد کا مضمون ''شموئل احمد کے افسانوں میں علم نجوم کی معنویت'' بہت اہم اور منفرد ہے۔ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ افسانے ''القمبوس'' کو موضوع بنایا ہے۔ اردو افسانے میں اس قسم کے افسانے نئے ذائقے اور نئی جہت کی طرف اشارہ ہے۔

شموئل احمد کا مضمون ''منٹو اور بیدی کے افسانوں کی عورتیں'' دلچسپ ہے۔ عطیہ سکندر علی نے ''ایسا کہاں سے لاؤں'' میں اہلِ علم وفن کی متنوع آراء کو سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ شموئل احمد کا افسانہ نفسیاتی کیفیت کے پس منظر میں لکھا گیا۔ مشکل مگر اچھا افسانہ ہے۔ عنوان کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ عذرا اصغر کا افسانہ ''وقت تتلی تھا'' ایک چست اور خوبصورت تخلیق ہے۔ ''دیدۂ تر'' رشتوں کی پائمالی اور محبت کی بے حرمتی کا نوحہ ہے ایسی تلخ حقیقتوں کا سامنہ کرنے والوں کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے وقت اور بے بسی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ گلزار جاوید نے افسانے کا اختتام ایک کردار کی دور اندیشی پر کیا ہے۔ آصف ثاقب کی غزل کلاسیکی رنگ اور اُمید کی فضا سے سجی ہوئی ہے۔ رؤف خیر، انتظار باقی، اشرف جاوید، اجیت سنگھ حسرت، سیفی سرونجی، تصور اقبال، اسد اعوان، ابراہیم عدیل اور وشال کھلر کی غزلیں جدید رجحانات کی نمائندہ ہیں۔

پروفیسر زبیر کنجاہی نے آصف ثاقب کی زمین میں عقیدت سے بھرپور غزل نذرِ قرطاس کی ہے۔ دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصّہ'' میں عظیم گلوکار محمد رفیع کو یاد کیا ہے۔ دیپک کنول کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی سادگی سے مختصر مضمون میں ایک مختصر کتاب کا مواد فراہم کر دیتے ہیں اس تحریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ محمد رفیع گلوکار تو عظیم تھے ہی مگر وہ بحیثیت انسان بھی عظیم تھے۔ اُن کے عجز وانکسار اور سخاوت کے متعلق اور بھی لوگوں نے لکھا ہے۔

''تیری جنت کا نظارہ'' کے عنوان سے محمود شام صاحب نے ہندوستان کے سفر اور تقریبات کی روداد، دلچسپ اور شگفتہ رپورتاژ کے انداز میں

تحریر کی ہے۔''ضمیر جعفری کا یادگاری ٹکٹ'' چند برس پہلے محکمۂ ڈاک نے ضمیر جعفری مرحوم یادگاری ٹکٹ کا اجرا کیا تھا۔ یہ مضمون اُسی کی یاد دلاتا ہے۔مضمون میں تازگی بھی ہےاوراعتراف بھی۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار بھائی، آداب۔

نہ جانے کیوں اس بار چہارسو کی بابت آخر سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی ''رس رابطے'' دلچسپ لگا۔ خاص طور سے سیفی سرونجی صاحب کا خط جس میں انہوں نے خصوصی گوشے کے متعلق رائے دی ہےاور آپ سے قلمی نگارشات کی گذارش بھی کی ہے۔نسیم سحر صاحب نے عمّار کی شادی کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔اس بار''ایک صدی کا قصّہ'' اس لیے بھی خاص تھا کہ محمد رفیع میرے پسندیدہ گلوکار ہیں بے شک وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ہمارے دلوں میں رہتے ہیں۔ دیپک جی نے اُن کی بابت بہت ساری جان کاری دے کر دل خوش کر دیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم زندگی سے جڑے واقعات کو جس مہارت اور خوبصورتی سے تحریر کر رہے ہیں وہ صرف اُنہیں کا حصّہ ہے۔ رتن سنگھ جی نے ''داؤد پنڈ ہے عرش دا ٹکڑا'' لکھ کر اپنے آبائی وطن سے جس طرح محبت کا اظہار کیا ہے اُسے پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔

''تیری جنّت کا نظارہ'' پڑھ کر عجب کیفیت طاری ہوگئی۔ خاص طور سے واہگہ بارڈر پار کرتے ہوئے جو نظم انہوں نے تحریر کی ہے اُس کا ایک ایک لفظ اپنے دل کی آواز لگا۔ چندی گڑھ میں اس قدر بڑا ادبی میلہ لگا مگر اُس میں شرکت کا موقع نہ مل سکا۔ شام صاحب، فاروقی صاحب اور کئی دیگر قدِ آور اہل قلم سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ مہندر پرتاپ چاند جی سے اُن کی ملاقات خوب رہی۔

افسانوں کی طرف آنے سے پہلے جناب سید سعید نقوی کا ذکر ضروری ہے ایک منفرد اور بڑی افسانہ نگار کو انہوں نے خوب عمدگی سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد جو لاہور میں محترمہ نیلم احمد بشیر نے عطا کی تھی میں نقوی صاحب سے کُلّی طور پر متفق ہوں۔ وقت تتلی تھا، آسمان کا تھُوکا، بچہ ہے، دشمن کا سلام اچھی کہانیاں ہیں۔ آپ نے ''دیدۂ تر'' اپنے خاص اسلوب میں تحریر کیا ہے مگر اختتام اس قدر رنجیدہ نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ بہر حال یہ کہانی اس شمارے کی بہترین کہانی کہی جا سکتی ہے۔

جو بات سب سے پہلے کرنی چاہیے تھی وہ آخر میں کر رہی ہوں کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ نے حاملِ قرطاسِ اعزاز کی نسبت ڈھیر ساری معلومات مہیا کی ہیں۔ اس سے قبل شموئل احمد صاحب کو گاہے گاہے پڑھنے کا موقع ملتا رہا مگر اس قدر تفصیل سے پہلی بار شموئل صاحب کو پڑھنے کی نوبت آ سکی۔ براہِ راست میں آپ کے سوالات کے جوابات شموئل احمد نے بڑے تحمل اور بردباری سے دیئے ہیں۔ خاص کر یہ سوال کر کے تو آپ نے انتہا ہی کر دی ''اور جو صاحب آپ کو پاگل اور مجذوب گردانتے ہیں'' کیا خوب شموئل صاحب نے جواب دیا ہے۔''فنکار پاگل ہی ہوتا ہے'' بہر حال شموئل صاحب ہر لحاظ سے بڑے فنکار ہیں اور اُن کی کہانی ''سنگھار دان'' اردو ادب کا ماسٹر پیس ہے۔ ''آدمی اور مین سوئچ'' کافی بولڈ نفسیاتی کہانی ہے اس کہانی میں شموئل صاحب نے اپنے بے باک اسلوب سے منٹو کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

شاعری کا حصہ بھی لائق توجہ ہے مگر خط کی طوالت اُس پر رائے زنی کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ جس ہمت، محنت اور لگن سے چہارسو کو باقاعدہ رکھے ہوئے ہیں اس سے اردو ادب کو بے پناہ خوشیاں مل رہی ہیں اور میری دعا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی جاری وساری رہے۔

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

جناب گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

شموئل احمد کے توسط سے ''چہارسو'' ملا۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرا مضمون ''شموئل احمد کے افسانوں میں علم نجوم کی معنویت'' شائع کیا۔ میں اس سے بھی زیادہ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے انتہائی پر یسٹیجیس رسالہ میں ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار ''شموئل احمد'' پر ایک گوشہ نکالا۔ ہندوستان کے تمام ادیب آپ کی محبت اور خلوص کا احترام کرتے ہیں اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں لوگ اس رسالہ کو ایک دوسرے سے مانگ مانگ کر پڑھ رہے ہیں۔

شیخ عقیل احمد (دہلی، بھارت)

پیارے گلزار بھائی، خلوصِ فراواں اور دُعائے خیر۔

لاہور کی عالمی امن کانفرنس میں آپ کے قرب اور آپ کی بھرپُور توجہ اور بے پناہ محبت کی خوشبو ابھی تک ذہن و دل کو مسحور کر رہی ہے۔ کاش وقت کا دھارا وہیں رُک جاتا۔ اپنی مجبوریوں اور بے شمار خانگی مصروفیات کے زیرِ اثر دو تین ماہ تک آپ کو باقاعدہ خط نہ لکھ سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ پچھلے شمارے میں جن کرم فرماؤں نے مجھ خاکسار سے منسوب شمارے سے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور مجھ ناچیز کی تحاریر کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا ان سب کے تئیں میں اظہارِ ممنونیت کرتا ہوں۔

تازہ شمارہ (بابت جنوری فروری ۲۰۱۴ء) موصول ہو گیا تھا۔ افسانوی حصّے میں شموئل احمد صاحب کے ''سنگھاردان'' کے علاوہ حضرات ناصر بغدادی، یٰسین احمد اور تشنہ بریلوی کی کہانیاں یقیناً لائق تحسین ہیں اور آپ کی لاجواب تحریر ''دیدۂ تر'' بے حد جذباتی بھی ہے اور نفسیاتی بھی۔ صیغۂ واحد متکلم میں بیان کردہ اس کہانی میں گلزار جاوید صاحب کی بے لوث شخصیت کی تصویر صاف طور پر جھلکتی ہے۔

حصّہ نظم میں سُرور انبالوی، آصف ثاقب، مناظر عاشق ہرگانوی، یوگیندر بہل تشنہ، خیال آفاقی، صدیق شاہد، اجیت سنگھ حسرت، شگفتہ نازلی، سیفی سرونجی، صابر عظیم آبادی، وشال کھلّر، کمار پانی پتی اور کرشن گوتم صاحبان کے کلام اور نُور زمان ناوک صاحب کے دل نواز دوہوں کے علاوہ رتن سنگھ صاحب کی پنجابی نظم

''ورثہ'' دل کی گہرائیوں کوچُھوگئی اوراسے پڑھتے ہوئے کئی بارآنکھیں نم ہوگئیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم اور دیپک کنول صاحب کی تحریریں ہمیشہ کی طرح نہایت دل چسپ اور بے حد معلوماتی ہیں۔فیروز عالم صاحب کے بیانیہ میں ان کے عزیز دوست رشید کے ساتھ پیش آئے سنگین حادثہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کی پریشانی اور گریہ زاری ان کے دل کی بے ریا معصومیت اور درد مند کی مظہر ہے۔یعقوب نظامی صاحب کی ''برطانیہ میں ایشیائی جھلکیاں'' بے نظیر ہیں اور محمود شام صاحب کی چندی گڑھ میلہ میں شمولیت کی روداد نہایت دل پذیر ہے۔ میری خوش نصیبی تھی کہ اپنے اس سفر کے دوران وہ اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ یہاں غریب خانے پر بھی تشریف لائے تھے حالانکہ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی خاطر خواہ خدمت نہ کرسکا۔مسعود مفتی صاحب کی ''زینتِ محراب'' کے طفیل ضمیر جعفری صاحب پر یادگاری ٹکٹ جاری کیے جانے کی خبر سے جی خوش ہوا اور آنجہانی ساحر ہوشیار پوری صاحب کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا:

شکر ہے جمہوریت کے دور میں
کچھ تو قدرِ شاعری ہونے لگی

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ارسال کی مقررہ تاریخ کو اسے سپردِ ڈاک کر دیا ہوگا لیکن حسبِ معمول جب ۹ یا ۱۰/جنوری ۲۰۱۴ء تک پیکٹ نہیں ملا تو تشویش شروع ہوگئی۔نجیب عمر نے اطلاع دی کہ انہیں ۱۰/جنوری کو موصول ہو چکا ہے پھر ۱۱/جنوری سے میں کسی محبوبہ کی طرح اس کا انتظار اور نجیب عمر کی تفتیش کا جواب دیتا رہا آخرکار ایک ہفتے کے شدید انتظار کے بعد بھی جب نتیجہ نفی میں نکلا تو اس روز نجیب کو فون کر کے تاکید کر دی کہ شام کو میرے گھر آتے وقت متذکرہ شمارہ لیتے آئیں۔اب حسنِ اتفاق دیکھئے کہ اُسی روز ڈاکیا ''چہارسوٗ'' کا پیکٹ لے آیا اور میں نے نجیب عمر کو رسالہ لانے سے منع کر دیا۔یہ تمام تفصیل آپ کو بتانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مجھے جیسے ''چہارسوٗ'' کے دیوانے کو چہارسو دیکھنے کی کیسی لت پڑ گئی ہے! بہرحال اب آیئے تازہ شمارہ کیسا لگا؟ یہ بتادوں! ''حمد کے مقطع کے مصرع ثانی میں لفظ ''کی'' کمپوزنگ سے رہ گیا ہے۔درست مصرع یوں تھا:

''جہانِ دیگر کی بزمِ عرفاں بھی اس کی صناعی سے ٹکی ہے''

شموئل احمد پر ''قرطاس اعزاز'' آپ نے چھاپا، اچھا لگا ورنہ ان کے بارے میں بہت ساری معلومات ہم پاکستان والوں سے پوشیدہ رہتیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اُن کے مشہور افسانے کا نام ہی انہوں نے غلط رکھا جب کہ صحیح عنوان ڈریسنگ ٹیبل (Dressing Table) ہے جسے ہم اردو میں ''سنگھار میز'' کہتے ہیں بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کو افسانے کا عنوان ''سنگھاردان'' کیوں سوجھا جب کہ سنگھاردان میک اپ بکس یا بیوٹی بکس کو کہتے ہیں جو ایک چھوٹا سا صندوق جس میں عورتیں آرائش کے لوازمات رکھتی ہیں، کو کہا جاتا ہے۔کیا بہار میں ''سنگھار میز'' کو سنگھاردان کہتے ہیں۔ چلئے اور نہیں تو جب جرمنی سے اُن کا افسانہ انگریزی میں ''ڈریسنگ ٹیبل'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اُسی وقت اِسے یہ نام دے دیتے پھر افسانے میں صفحہ ''۷'' کے دوسرے کالم میں موصوف نے خود جو بیان کیا ہے اس میں بھی ''۔۔۔جھانکا تو ''قدِ آدم'' شیشے میں اس کو اپنا عکس مکمل اور دلفریب معلوم ہوا''۔ بلاواسطہ ذکر ہے کہ قدِ آدم آئینہ سنگھار میز میں ہے نہ کہ سنگھاردان میں ''چہ بوالعجبی است'' کہ ان کے کسی نقاد نے بھی اُن کی اس طرف توجہ نہیں دلائی۔

اُن کے افسانے ''صریر'' میں شائع ہوتے تھے اور میں انہیں پڑھتا بھی تھا لیکن اب یہ پتہ چلا کہ پاکستانی تہذیب کے مطابق مرحوم فہیم اعظمی اُن میں قطع برید کر کے چھاپتے تھے۔بعد میں شموئل احمد نے بقول خود انہیں بھیجنا بند کر دیا یا ''مرحوم فہیم اعظمی نے چھاپنا بند کر دیا'' یہ محلِ نظر ہے کیونکہ اب دوسرا فریق زندہ نہیں ہے جو اُن کے عمل کی تائید کرے۔بہرحال میرے رائے میں ان کے افسانوں میں Vulgarity اور جنسی تلذز کا مصالحہ زیادہ ہے۔جبکہ جنسی مسائل کا ذکر کم کم۔جب کہ منٹو کے ہاں جنس کو پیش کرنے کا فن ایک تخلیق کار کے فن کی طرح ابھرتا ہے اور سارے افسانے کو موضوع لپیٹ لیتا ہے اس سلسلے میں اُن کا مختصر ترین ''موتری'' ہے جس نے فسادات کے اہم ترین نقطہ عروج کو چھوا تھا۔اس سلسلے میں یٰسین احمد کے افسانے ''بچہ ہے'' کی مثال بھی پیش کرتا ہوں جنہوں نے جنس کے موضوع کو اتنی خوبصورتی سے پیش کیا کہ اس میں کہیں بھی جنسی تلذز نہیں۔''دیدۂ تر'' پڑھنے کے بعد میری آنکھیں بھر آئیں۔گلزار جاوید نے آج کے سُلگتے ہوئے سوال کو جس طرح آسانی کے ساتھ اپنے افسانے میں سمویا ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہے۔مبارکباد! میں دیدۂ تر پڑھنے کے بعد اپنا یہ مطلع آپ کی نذر کرتا ہوں۔

کٹھن سہی یہ سفر طے مگر ضرور کرو
تم آنسوؤں میں اُتر کر مجھے عبور کرو

اس بار دیپک کنول نے محمد رفیع جیسی ہر دلعزیز شخصیت پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ضرورت مندوں میں اپنی ذاتی کمائی کی تقسیم اُن کی خصوصیت تھی۔ یہ صفت ہندوستان کے بہت سے فلمی اداکاروں اور فلمسازوں میں پائی جاتی ہے ایک کا ذکر تو دیپک کنول نے کے۔آصف کا نام لے کر کیا اور دوسرے جسے میں جانتا ہوں وہ نانا پاٹیکر ہے جس نے کئی فلاحی ادارے کھول رکھے ہیں۔طوالت کے خوف سے خط ختم کرتا ہوں ہاں خارجاً مسموع ہوا کہ آپ کے تیسرے صاحبزادے کی شادی کے سلسلے میں آپ گذشتہ دنوں مصروف رہے میری جانب سے دُلہا دلہن کو نئی زندگی کی مبارکباد دے دیجئے پھر آپ کو بھی یہ خوشیاں مبارک ہوں۔

غالب عرفان (کراچی)

..... افسانے منٹو کے .....

بڑی مسرت ہے کہ خالد اشرف نے اس طرف توجہ کی ہے اور کسی قدر معروضیت کے ساتھ اس میدان میں قدم یا قلم رکھا ہے۔ گو اب بھی مجھے ان سے بہت سی اور توقعات ہیں۔ میں ان کی کاوش کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس توقع کے ساتھ:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کاوش اردو فکشن کی تنقید کو نئی روش کی طرف رہنمائی کرے گی اور نئی آگاہیوں سے مالا مال کرے گی۔ منٹو ایسے مقبول اور قدرے متنازعہ فیہ فن کار کے تعینِ قدر کے سلسلے میں ہی نہیں دورِ حاضر میں ادبی تنقید کے منصب و منہاج کے سلسلے میں بھی، ان کی تصنیف ''فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا'' فکر و تامل کے نئے باب کا افتتامیہ ثابت ہوگی۔ خالد اشرف نے منٹو شناسی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے اور اس امتیاز کے لیے وہ دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ .....محمد حسن

اشاعت: جنوری ۲۰۱۳ء، قیمت: ۷۰۰ روپے، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

..... تعلق .....

کسی شاعر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کس رنگ میں کہہ رہا ہے۔ ورنہ کوئی بات نئی بات تو نہیں۔ مظفر کی بعض تشبیہیں، استعارے، امیجز اور تلازمے رسمی ضرور ہیں لیکن اس نے معانی اور تخیل کو بہت وسعت دی ہے۔

ایک اور اہم بات یہ کہ اس نے غزل کے عمومی مزاج سے ہٹ کر اپنا اظہار کیا ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا استہزائیہ انداز بہت دلچسپ بھی ہے اور منفرد بھی۔ جعفر بلوچ کا بیٹا زندگی کے دکھوں اور مسائل پر کڑھتا نہیں بلکہ انہیں ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ جنگ، بارود، بدامنی اور عصری صورت حال کی شدت کو اعصاب پر سوار کرنے یا اُن پر چیخنے چلانے یا نعرے لگانے کے بجائے اس پر مسکرا دیتا ہے اور یہ اس کی بے حسی نہیں بلکہ ایک رجائی رویہ ہے جو ہمارے ہاں سے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ .....اورنگ زیب نیازی

تیرے لوٹ آنے کا بس اک آسرا تھا اپنے پاس
اور وہ بھی رفتہ رفتہ خیر سے جاتا رہا

اشاعت: ۲۰۱۳ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، مثال پبلشنگ، لاہور۔

..... عالمی اردو ادب .....

گزشتہ ایک صدی میں جو سائنسی ایجادات منظر عام پر آئی ہیں، ان میں سینما کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے اور اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ آج ہمارے لیے سینما عجوبہ نہیں رہ گیا ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب اس کی ایجاد ہوئی تھی تو دنیا کے لیے یہ معجزے سے کم نہ تھا اور اس کی ترقی و ارتقاء میں بلاشبہ فوٹوگرافی کا اہم رول رہا ہے کیونکہ اس کی ایجاد سے ہی عکس کو دیرپا بنا دیا گیا تھا لیکن اس کو متحرک بنانے میں کئی برس تک بہت سے سائنسدان سرگرداں رہے۔ اس لحاظ سے متحرک فلموں کی کہانی کسی الف لیلوی داستان سے کم دلچسپ نہیں ہے۔

میں نے اس نمبر میں ''گزشتہ سینما صدی'' کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے جب یہ خصوصی نمبر نکالنے کا پروگرام بنایا تھا تو مجھے اس میں آنے والی مشکلات کا احساس نہیں تھا۔ دراصل یہ ایک اکیلے آدمی کا کام نہیں بلکہ ادارے کا کام ہے۔ بہرحال مجھ سے جتنا بھی ہو سکا میں نے کر دیا۔ اور ظاہر ہے اس میں خامیاں ڈھونڈنے والے تو بہت کچھ ڈھونڈ لیں گے مگر یہ میری ایک ادنیٰ کوشش ہے جس سے میں بھی پوری طرح مطمئن نہیں۔ اگر اس میں کوئی اہم شخصیت یا واقعہ رہ گیا ہو یا کوئی خامی در آئی ہو تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ ..... نند کشور وکرم

اشاعت: اگست ۲۰۱۳ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، سنجیو آفسیٹ پرنٹرز، کرشن نگر، دہلی، بھارت۔

عالمی امن کانفرنس منعقدہ لاہور ۲۱ تا ۲۳ دسمبر ۲۰۱۳ء کا عکسی منظر نامہ